تذکرۂ شہداء



سعید راشد

سلمان

SALMAN SALEEM

PRESENTS

تذکرۂ شہداء

پروفیسر سعید راشد

بک کارنر، فیصل چوک جہلم

تبصرے

پروفیسر سعید راشد کی تینوں کتابوں، تذکرہ شہدا حیات حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت، اکرم شہید نشانِ حیدر، کو میں نے اشکبار آنکھوں سے پڑھا اور کئی مقامات پر پھوٹ پھوٹ کے رویا، پاکستان کے جیالے سپوتوں نے کس جوانمردی سے اپنے ملک اور قوم کے لیے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کی تصویر ان کتابوں کے ہر صفحے سے جھلکتی نظر آتی ہے ان اوراق میں نہ تصنّع ہے اور نہ بناوٹ، حد درجہ سیدھی سادی زبان میں مصنّف نے ایک عام قاری کے مطالعہ کے لیے جو مواد پیش کیا ہے، وہ ان کی اپنی ذات کی گہرائی اور پاکستان کے ساتھ ذہنی اور جذباتی وابستگی کا مظہر ہے۔ پاکستان کی بقا و استحکام اور اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرنا سب کے لیے راہِ نجات ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ خاص طور پر نوجوانوں اور طلبہ کے لیے مفید اور ضروری ہے تاکہ وہ شہادت کی ان داستانوں میں زندگی کی نئی راہیں تلاش کرسکیں۔

میجر جنرل سید اظہر احمد

یہ تینوں کتابیں جنگ ستمبر و دسمبر کے غیوّر شہدائ کے سوانحی تذکروں پر مشتمل ہیں۔ یہ تذکرے ہماری قومی تاریخ کے سفر میں مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مستقبل کے گلاب ماضی کے انہی زخموں سے طلوع ہونگے۔ فاضل مصنّف قومی سطح پر ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم ملّی فرض (بلکہ قرض) کو اتنی لگن اور خوبی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل کے ملّی ذہن کی تربیت اور وسیع معنوں میں پاکستانیت کے فروغ میں ان کتابوں کا مطالعہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

سیّد ضمیر جعفری

فہرست

صفحہ نمبر

پیش لفظ

ملٹری کالج جہلم ایک مایہ ناز قومی درسگاہ ہے جس سے فارغ التحصیل ہونے والوں نے ہر شعبہ زندگی میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کسی درسگاہ کی عظمت کا معیار اسکی بلند و بالا عمارت، آرام دہ اقامت گاہیں یا پرفضا ماحول نہیں ہوتا بلکہ اس کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے کارنامے ہوتے ہیں۔ ملٹری کالج جہلم اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہے کہ اس درسگاہ سے تعلق رکھنے والے شہید اور غازی ملٹری کالج کی درخشندہ عسکری روایات میں گرانقدر اضافہ کرتے رہے ہیں۔ کالج کے فارغ التحصیل فرزندوں نے قیام پاکستان کے بعد نہ صرف پاک فوج کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ ہماری گذشتہ جنگوں میں بھی قابل ستائش کارنامے انجام دیئے ہیں۔

سعید راشد صاحب نے ملٹری کالج جہلم سے تعلق رکھنے والے شہیدوں کے حالات زندگی اور کارناموں پر مشتمل کتاب ترتیب دے کر ان کی ہی نہیں بری فوج اور ملک و قوم کی بھی خدمت کی ہے۔ زندہ قوم اپنے شہیدوں کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ ملک کے ان نامور فرزندوں نے میدان جنگ میں اپنی متاع جان اپنے وطن عزیز کی نذر کر کے ملک اور قوم پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ یہ ہمارے شہیدوں ہی کا اعجاز ہے کہ آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ شہیدوں کی زندگی اور انکے کارناموں کا مطالعہ کر کے ہمارے دل میں نہ صرف ان عظیم ہستیوں کیلئے تشکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں بلکہ ملک کی آن پر قربان ہونے کی خواہش کو بھی نئی تحریک ملتی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ملک و قوم کی خدمت کرنے اور اسکی عزت و آزادی کی حفاظت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ملٹری کالج جہلم کے سابق اور موجودہ طالب علموں کے علاوہ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے ان تمام قارئین میں بھی مقبول ہوگی جو تحفظ آزادی اور دفاع وطن میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

(جنرل محمد ضیاء الحق)
چیف آف دی آرمی سٹاف اور صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان

۲۸، رجب المرجب ۱۴۰۰ھ
۱۲، جون ۱۹۸۰ء

انتساب

پاک و ہند جنگوں کے تمام نامور اور گمنام شہیدوں

کے نام

خصوصاً وہ جو بے تمغہ و بے نشان رہے، وہ
جن کا نہ کہیں سنگ مزار ہے اور نہ چراغ شام
ہے۔ لیکن جن کے لہو سے یہ سرزمین لالہ زار ہے،

صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

خاموش سمندر

از

سیّد ضمیر جعفری

۱۹۸۳ء میں میرا سپاہی بیٹا (میجر احتشام جعفری) سٹاف کالج کوئٹہ میں کورس کر رہا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا تو کتابوں کے شیلف میں اردو کی تین نئی کتابیں نظر آئیں۔

تذکرہ شہداء

کرنل حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت

اکرم شہید نشان حیدر

مجھے وہاں پوتے پوتیوں سے مکالمے اور ان کتابوں کے مطالعہ کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے انہی کتابوں پر "ہاتھ صاف" کیا۔ ہم نے "ہاتھ صاف" کیا تھا۔ کتابوں نے ہمارا ذہن روشن کر دیا۔ جس کتاب کو ایک بار کھولا اس کو ختم کئے بغیر بند نہ کر سکا۔ ان کے صفحات میں بسی ہوئے میرے وطن کی محبوب اور مقدس خوشبو نے دامن دل کو برابر کھینچے رکھا۔

یہ تینوں کتابیں جنگ ستمبر و دسمبر کے غیور شہداء کے سوانحی تذکروں پر مشتمل ہیں۔ یہ تذکرے ہماری قومی تاریخ کے سفر میں منارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مستقبل کے "گلاب" ماضی کے انہی زخموں سے طلوع ہوں گے۔ فاضل مصنف قومی سطح پر ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم ملّی فرض (بلکہ قرض) کو اتنی لگن اور خوبی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے میں امید کرتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل کے ملّی ذہن کی تربیت اور وسیع معنوں میں "پاکستانیت" کے فروغ میں ان کتابوں کا مطالعہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

اچھی تصنیف کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ بین السطور میں خود مصنّف بھی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ جیسے MAH BEHIND THE GUN سوان کتابوں کے مطالعہ کے دوران مصنّف بھی ہمارے سامنے موجود رہا۔

کبھی آ کے منظرِ عام پر ، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

ذاتی طور پر ہم مصنّف کو جانتے تھے۔ یہ تھے پروفیسر سعید راشد۔ پروفیسر راشد گذشتہ تینتیس برس سے پاکستان کی عظیم عسکری درس گاہ ملٹری کالج جہلم کے شعبہ تعلیمی تحقیق و ترقی سے وابستہ ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے نامور اساتذہ اور جید دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی تحریر سلاست اور شادابی میں ایک اپنا انداز رکھتی ہے۔

اپنی عمر کے موجودہ مرحلے میں (اگر زندہ رہے انسان، بڑھاپا آ ہی جاتا ہے) راقم الحروف اگرچہ اب اس لائق تو نہیں رہا کہ عسکریان وطن کی صف میں ان کے دوش بدوش کھڑا ہو کر ان کے ساتھ قدم قدم چل سکے مگر دل تو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتا رہے گا۔

گذشتہ چند برسوں میں مجھے جہاں جہاں پاکستان کی بری فوج کے افسروں (جن میں جرنیل بھی شامل تھے) سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے ہر تیسرا شخص پروفیسر راشد کا شاگرد نکلا۔ یہ بات محض گنتی کے حساب سے بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ لیکن جس بات نے مجھے بطور خاص متاثر کیا وہ دلی محبت اور سچے احترام کا وہ جذبہ تھا جس سے ان کا ہر شاگرد ان کو یاد کرتا ہے۔ ان کے شاگرد جب ان کو یاد کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے کسی محسن کی بات کر رہے ہوں جو ان کا محبوب بھی ہو۔ آج کے زر پرست اور جاہ پرست معاشرے میں اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے مجھے تو صرف ایک ہی لفظ سوجھتا ہے۔ حیرت انگیز

"کلاس روم" میں ان کے موتی لٹانے کی روداد ہم ایک مدت سے ان کے شاگردوں کی زبانی سن رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو ہم خود بھی گواہوں میں شامل ہو گئے۔ وہ کلاس روم سے باہر بھی اپنی گفتگو میں ادب و حکمت کے موتی لٹاتے ہیں البتہ بارش "موسلا دھار" نہیں ہوتی۔ ممکن

ہے کہ بعض باتونی لوگ ان کو کم گو سمجھیں۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ وہ گفتگو برائے گفتگو کے قائل نہیں۔ نہ الفاظ کی فضول خرچی انہیں پسند ہے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی سے کوئی "عہد" باندھ رکھا ہو۔ اور جن کا ہر لمحہ اس عہد کے ایفا کی فکر میں گزرتا ہو۔ مجھے ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آدمی ان کی صحبت میں جاکر چاندنی کے ایک ایسے "ہالے" میں جا پہنچتا ہے کہ جس کی شعاعیں علم کی فضیلت، استاد کی شفقت اور تمدن کی شائستگی سے پھوٹتی ہیں۔ علم و ادب کا یہ خاموش سمندر، اب تک ہمیں تاریخ و تہذیب کے بہت سے آبدار موتی عطا کر چکا ہے۔

دیکھئے اس بحر سے اور اچھلتا ہے کیا

سید ضمیر جعفری

چک عبدالخالق ضلع جہلم یکم جنوری ۱۹۸۴ء

مطبع ـــــ عوامی پرنٹرز لاہور



دیباچہ

ایک مفکر کا قول ہے کہ جس سرحد کو اہلِ شہادت میسّر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے پاکستان کی سرحدوں کو قائم و دائم رکھنے کے لئے اہلِ شہادت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ بلکہ ان سرحدوں کو قائم ہی مجاہدوں اور شہیدوں نے کیا تھا۔ یہ تمام نامور اور گمنام مجاہد اور شہید ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ ان کو عزت اور محبّت سے یاد کرنا ایک قومی ضرورت بھی ہے۔ ان شہیدوں کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ ہمارے لہو کو سوز و یقین سے گرمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے نئی نسل اور نوجوان طلبہ کے لئے اس مطالعہ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔

پاکستان کے ان بے شمار محسنوں میں سے جو ستاروں کی طرح پاکستان کی تاریخ کے افق پر چمک رہے ہیں۔ ہم ان صفحات میں، صرف چند کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چند وہ ہیں جن کا تعلق ملٹری کالج جہلم سے رہا ہے۔ جنہوں نے اپنی بنیادی تعلیم و تربیت اس ادارے میں حاصل کی اور اس ادارہ سے وہ منفرد طرزِ احساس اور طرزِ زندگی جذب کیا جو اس کالج کی خصوصیت ہے۔ ملٹری کالج کو اپنے ان عظیم فرزندوں پر بجا طور پر فخر ہے۔

یہ تذکرہ اس نوع کی عام کتابوں سے ہٹ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں شہیدوں کی شخصیت و کردار کا مطالعہ و تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حالات و واقعات پیش کرنے میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا گیا ہے اور تقریباً سارا مواد براہ راست حاصل کیا گیا ہے۔

ان شہیدوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کے جائزے سے ایک یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ دنیا میں بڑے سے بڑا کام کامیابی سے سرانجام دینے کے لئے، غازی

اور شہید ہونے کیلئے نہ بہت زیادہ ذہین ہونے کی شرط ہے اور نہ بہت زیادہ علم کی۔ نہ کلاس میں چمکنے کی نہ اسٹیج پر چمکنے کی اور نہ کھیل کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کی ضرورت ہے یہ سب اچھی چیزیں ہیں لیکن بنیادی ضرورت نہیں۔ بڑا آدمی بننے کی۔ بڑے کارنامے سرانجام دے سکنے کی شرط ایک ہے۔ صرف ایک، اور وہ یہ کہ آدمی میں حوصلہ ہو، جرأت ہو، اس کی قدریں صحیح ہوں۔ اس کا قلب روشن ہو۔ اسے پاکستان سے اور اسلام سے سچی محبت ہو۔

دوسرے اس تذکرہ کے مطالعہ سے یہ سچائی ابھرتی ہے کہ شہید از خود پیدا نہیں ہو جاتا جاتا۔ جذبۂ شہادت کا تعلق بھی تربیت سے اور تعلیم سے ہے۔ شہید کی سوچ۔ اس کا طرز احساس بلکہ اس کا سارا طرز زندگی، (لائف اسٹائل) ہی مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کو اہل احسان اور اہل شہادت میسر آتے رہیں تو اس کے لئے خصوصی اہتمام کرنا پڑے گا بڑی طویل اور پُرخلوص جدوجہد کرنا پڑے گی اور تمام سماجی اداروں میں خاص طور پر تعلیمی اداروں کو ایک خاص قسم کے ماحول کا امین بنانا پڑے گا۔ کیکر سے گلاب نہ کبھی اگا ہے اور نہ کبھی اُگے گا۔

اس تذکرے سے تیسری یہ حقیقت سامنے نظر آتی ہے کہ طلبہ کی صرف نصابی کارکردگی سے بہت زیادہ پُرامید اور بہت زیادہ مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ان پر اچھے بُرے کا ٹھپہ لگانا چاہیئے۔ انسان کی شخصیت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ بدل سکتی ہے اور بدل جاتی ہے۔ یہ شہدا، جن کا تذکرہ ان اوراق میں شامل ہے ان میں سے بیشتر اوسط درجے کی صلاحیتوں کے حامل اور عام طلبا تھے یہ صرف اپنے جذبے، اپنے شوق اور اپنے قلب سلیم کی وجہ سے شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہو سکے۔

اس تذکرے کی ترتیب کے بارے میں یہ عرض ہے کہ اس میں صرف ان شہداء کا ذکر کیا گیا ہے جو میدان کارزار میں دشمن سے براہِ راست جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس شرط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ نام شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ اس لئے تمام پڑھنے والوں خصوصاً

ملٹری کالج کے اولڈ بوائز سے درخواست ہے کہ وہ اس تذکرے کی تکمیل میں ہماری مدد کریں۔ اسی طرح اگرچہ حالات و واقعات کو بیان کرنے میں ان کی صحت کا حد درجہ خیال رکھا گیا ہے لیکن اس امر کا امکان اب بھی باقی ہے کہ غیر ارادی طور پر کوئی غلطی راہ پا گئی ہو۔ اس کی نشاندہی کے لئے بھی میں قارئین کا ممنون ہوں گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جا سکے۔

اس تذکرے کی تالیف میں شہداء کے لواحقین کے علاوہ اور بہت سے افراد اور اداروں نے تعاون کیا۔ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا تو ممکن نہیں لیکن ناسپاس گزاری ہوگی اگر ان میں سے کچھ کا نام نہ لیا جائے۔ مثلاً جنرل محمد اقبال خان۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد جمال، میجر جنرل غلام محمد۔ میجر جنرل ممتاز علی۔ میجر جنرل محمد اقبال۔ میجر جنرل محمد صفدر، میجر جنرل پیر داد خان ستارہ جرأت، میجر جنرل امتیاز وڑائچ، بریگیڈیر محمد رفیق، بریگیڈیر محمد حیات، بریگیڈیر عاشق ملک، بریگیڈیر عثمان خان، بریگیڈیر محمد شریف، کموڈور سجاد حیدر بخاری، بریگیڈیر محمد یونس بریگیڈیر آر۔ ڈی بھٹی۔ بریگیڈیر طارق نظامی، بریگیڈیر رب نواز خان، کرنل عبدالمتین، کرنل محمد یونس کرنل محمد خان، کرنل محمد اکبر، لیفٹیننٹ کرنل حسن جعفر، لیفٹیننٹ کرنل نذیر احمد شاہ، لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک، لیفٹیننٹ کرنل محمد اشرف، لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد، لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین، لیفٹیننٹ کرنل منظور حسین، لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید، لیفٹیننٹ کرنل مقصود الحسن، لیفٹیننٹ کرنل خالد بشیر، لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب، میجر محمد سرور خان، میجر محمد یعقوب، میجر فتح محمد، ڈاکٹر رحیم گل، مسٹر محمد افضل خان، مسٹر محمد یونس، مسٹر منصور احمد، مسٹر عبدالمالک کیانی۔ اور مسٹر نثار کیانی، مسٹر رسول خان، مسٹر عزیز احمد، مسٹر حسن اختر اور وارنٹ آفیسر اورنگ زیب خان میں ان سب اصحاب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی توجہ اور بھرپور تعاون کے بغیر اس تذکرے کا مکمل ہونا ممکن نہیں تھا۔

آخر میں، میں خاص طور پر عالی مرتبت صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق چیف آف آرمی سٹاف کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس تذکرے کو اپنے گراں قدر

پیش لفظ سے نوازا اور اس ناچیز کوشش کو اتنی فراخدلی سے سراہا۔ جزاک اللہ۔
اللہ تعالیٰ سے میری عاجزانہ استدعا ہے کہ وہ میری اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے
آمین۔

سعید راشد فیضی

ملٹری کالج جہلم

سلمان
SALMAN SALEEM
PRESENTS

دوسرے ایڈیشن پر نوٹ

اس دوسرے ایڈیشن میں خاصی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے اور تھوڑا سا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کی تیاری میں میری بیٹی گل نغمہ نے میرا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ خدا اسے اپنی امان میں رکھے۔ (راشد)

لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید

ستارۂ جرأت آرمرڈ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ــــــــــــ ۳/اپریل ۱۹۲۴ء

جائے پیدائش ــــــــــــ طوغ سرائے کوہاٹ

کمیشن ــــــــــــ ۱۹۴۳ء آئی۔ ایم۔ اے ڈیرہ دون

تاریخ شہادت ــــــــــــ ۹/ستمبر ۱۹۶۵ء

اعزاز ــــــــــــ ستارۂ جرأت

مقام شہادت ــــــــــــ کھیم کرن سیکٹر

مدفن ــــــــــــ طوغ سرائے کوہاٹ

لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید (ستارۂ جرأت)

سر، آپ کا زخم گہرا ہے، ٹینک کو پیچھے لے چلتے ہیں۔

تم میرے زخم کی فکر نہ کرو۔ مشن کی فکر نہ کرو۔

سر، آپ کا زخم .....

مجھے معلوم ہے، لیکن دیکھو جب تک مشن مکمل نہ ہو جائے کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں زخمی ہو چکا ہوں۔

یس! سر،

یہ تھی وہ گفتگو جو لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل اور ان کے ٹینک کے وائرلیس آپریٹر کے درمیان ہوئی۔ جب وہ کھیم کرن سے آگے والٹوھا کی طرف فاتحانہ بڑھ رہے تھے۔ جب تک ہوش میں رہے وہ وائرلیس پر بولتے رہے۔ جب غشی طاری ہونے لگی تو بہت واضح آواز میں لاالہ الا اللہ پڑھا اور اپنے ٹینک کی کمانڈ سیٹ میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

صاحب زاد گل شہید ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا ٹینک بدستور دھاڑ رہا تھا۔ وائرلیس آپریٹر نے اپنے کرنل کی شہادت کو راز میں رکھا ہوا تھا۔ توپچی گولے داغ رہا تھا اور ڈرائیور اس کی ہدایت پر پینترے بدل رہا تھا۔ مشن مکمل ہو گیا تو سکواڈرن لیڈروں کو پتہ چلا کہ معرکے کے آخری مرحلے میں، رجمنٹ کمانڈر کی لاش قیادت کرتی رہی ہے۔"

یہ ہے وہ تصویر جو ایک جنگی وقائع نگار نے صاحب زاد گل کے آخری لمحات کی کھینچی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ رنگ آمیزی بھی کی گئی ہو لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرأت غیر معمولی جرأت اور فراست کے آدمی تھے آخری وقت تک وہ بے جگری سے برسرپیکار رہے۔ کھیم کرن کے تاریخی معرکے کو سر کرنے میں ان کی ذاتی شجاعت اور ذہین قیادت کو بھی خاصا دخل تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرأت کی زندگی اور کارناموں کا ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ ہر آدمی کی شخصیت پر اس کے آباؤ اجداد اس کے ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت کا خاصا اثر ہوتا ہے اس لئے ہم صاحب زاد گل کا تذکرہ ان کے ماحول اور آباؤ اجداد کے کردار کے تجزیئے سے شروع کرتے ہیں۔

آباؤ اجداد

ہنگو ضلع کوہاٹ سے کوئی آٹھ میل دور، مغرب کی طرف بلند پہاڑیوں اور سنگلاخ چٹانوں سے گھرا ہوا ایک پرانا گاؤں ہے طورغ سرائے جہاں ایک عرصے سے جنگجو قبیلے بنگش کے کچھ خاندان آباد ہیں۔

یہ طورغ سرائے کرنل صاحب زاد گل شہید ستارۂ جرأت کا آبائی گاؤں ہے یہیں صاحب زاد گل کے والد جلال گل ایک بنگش گھرانے میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔

جلال گل ان لوگوں میں سے تھے جنہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی جو اپنی فراست اور حوصلے سے اپنا اور اپنے خاندان کا مستقبل بناتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے اپنے راستے کے کانٹے چنتے ہیں۔ گمنامی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اپنے پیچھے ایسے کارنامے اور ایسی اولاد چھوڑ جاتے ہیں جن سے ان کا نام صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔

جلال گل نے اپنا بچپن دوسرے قبائلی بچوں کی طرح سیر و شکار میں گزارا۔ کسی اسکول اور مدرسے میں نہیں گئے اور جاتے کیسے؟ کوئی اسکول، مدرسہ گاؤں میں یا آس پاس تھا ہی نہیں اور نہ اس زمانے میں وہاں پڑھنے پڑھانے کا کوئی دستور تھا۔ مسجد میں ناظرہ قرآن پڑھا اور بس یہ جلال گل کی کل تعلیم تھی۔ اس پس منظر کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ۱۴/۲ ہارس رجمنٹ میں بھرتی ہوئے۔

یہ ان کی ترقی کا نقطہ آغاز تھا۔ بھرتی ہو کر انہوں نے خود پڑھنا لکھنا سیکھا اردو میں اچھی خاصی دستگاہ بہم پہنچائی۔ انگریزی بھی اتنی پڑھ لکھ لی کہ انگریزوں سے رسم و راہ رکھ سکیں۔ یہ اسی کوشش اور طویل باشعور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ وہ دوسری جنگ عظیم میں صوبیدار میجر

سے آنریری کیپٹن بنائے گئے اور انگریزی سرکار سے ایس بی اور او۔ بی۔ ای کے خطابات پائے۔ اس زمانے میں او۔ بی۔ ای کا خطاب پانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر یہ خطاب اس شخص کو ملا تھا جو ایک ان پڑھ سوار کی حیثیت سے رسالے میں بھرتی ہوا تھا۔ اس میں کچھ تو تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی خصوصیت تو تھی۔

ہمت و حوصلے سے کام لینا اپنے راستے کی کسی رکاوٹ کو رکاوٹ نہ سمجھنا اپنی قدروں اور اپنی منزلوں کا شعور رکھنا۔ جلال گل کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت تھی۔ اس خصوصیت سے انہوں نے اپنا مستقبل بنایا اور اسی فہم و فراست اور ہمت و حوصلے سے انہوں نے اپنے خاندان کو بنایا۔

جلال گل نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں یہ بات عجیب لگتی ہوگی کہ کوہاٹ کا ایک رسالدار اپنے بیٹے کو حیدرآباد دکن کی ایک چھاؤنی بلرام میں محض تعلیم کے لئے اپنے ساتھ رکھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے بلرام کے ایک کانونٹ اسکول میں تعلیم دلوائے اسی طرح جلال گل نے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی ایک بیٹے ایف۔ آر سی۔ ایس سرجن ڈاکٹر ہیں دوسرے پی۔ اے۔ ایف میں گروپ کیپٹن۔

جلال گل بڑے جلال کے آدمی تھے۔ مزاج بہت تند و تیز تھا۔ لیکن مزاج کی تندی ان پر حاوی نہیں تھی۔ جو کہتے تھے کر کے رہتے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھاتے تھے اور اٹھا کر پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ان کے اندر چیتے اور شیر کی صفات یکجا ہو گئی تھیں۔ خوب دنیا دیکھی۔ نام پیدا کیا۔ اور خاندان کو بنایا۔ یوں جلال گل نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی۔

صاحب زاد گل نے بچپن تو تقریباً سارا اپنے باپ کے ساتھ گزارا۔ اس کے بعد بھی برسوں نہیں دیکھا۔ ہر بچے کا پہلا ہیرو باپ ہی ہوتا ہے پھر جلال گل تو بڑوں کے بھی ہیرو تھے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ صاحب زاد گل نے بڑے ہو کر بھی اپنے والد جلال گل کو ہیرو ہی سمجھا ہوگا۔

صاحب زاد گل اپنے والد جلال گل کی بہترین صفات کے حامل تھے۔ قد کاٹھ بھی باپ کا سا

تھا۔ ذہن بھی انہی کی طرح بیدار تھا اور ہمت وجرأت وکردار میں بھی انہی کے نقش قدم پر تھے اعلیٰ تعلیم وتربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

صاحب زاد گل کی پیدائش اور بچپن

صاحب زاد گل اپنے آبائی گاؤں طورغ سرائے ہی میں پیدا ہوئے اپریل کی ۳ تاریخ تھی اور سن ۱۹۲۴ء صرف چار پانچ سال گاؤں میں گزارے۔ تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا۔ سیر وشکار کا شوق ہوا ہی تھا کہ ان کے والد رسالدار جلال گل انہیں اپنے ساتھ حیدرآباد دکن کی چھاؤنی بلرام لے گئے جہاں ان دنوں ان کی پلٹن ۱۴ سندھ ہارس مقیم تھی۔ صاحب زاد گل نے اپنی باقاعدہ تعلیم کا آغاز بلرام چھاؤنی کے کانونٹ اسکول سے کیا اور بہت جلد اپنی محنت وذہانت سے اس اسکول میں انہوں نے اپنی جگہ بنالی۔ صاحب زاد گل کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رحیم گل لکھتے ہیں۔

بھائی گل نے آٹھ سال کی عمر میں اس بلرام اسکول میں انگریزی کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا اور ایک تمغہ انعام میں حاصل کیا۔

بھائی، صاحب زاد گل نے آگے چل کر زندگی میں بے شمار انعامات لئے اور بہت سے تمغے حاصل کئے لیکن اس پہلے انعام کی خوشی وہ کبھی نہیں بھولے۔ کہا کرتے تھے "کہ یہ پہلا معرکہ تھا جو میں نے کھلے مقابلے میں مارا۔ زندگی میں کھل کر مقابلہ کرنا چاہیئے اور کھلا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چھپ کر بغل سے وار کرنا مردوں کا شیوہ نہیں اور شبخون مارنے میں مزہ نہیں۔ زندگی سینکڑوں راؤنڈ کی باکسنگ ہے۔ اس میں مکا مارنا ہی نہیں ہوتا مکا کھانا بھی پڑتا ہے اس لئے مکا مارنے اور مکا کھانے دونوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ پھر ہنس کر کہتے "مکا کھا کر گرنا اور اٹھ کر پھر مکا مار سکنا اصل کام ہے"

جب بلرام سے رسالدار جلال گل۔ راولپنڈی پوسٹ ہوئے تو صاحب زاد گل راولپنڈی کے مشہور ڈینیبنر اسکول میں داخل ہوئے وہ ڈینیبنر اسکول ہی میں پڑھ رہے تھے کہ انہوں نے کے جی۔ آر۔ ایم اسکول جہلم میں داخلے کی درخواست دی۔ یہ صاحب زاد گل کا اپنا شوق تھا۔ داخلے

کے مختلف مراحل سے گزر کر صاحب زاد گل ۱۶ اگست ۱۹۳۷ء کو اس وقت کے کے۔ جی ایم اسکول جہلم (اب ملٹری کالج جہلم) میں داخل ہوئے۔

صاحب زاد گل کو ۱۷، کالج نمبر ملا اور ان کا پہلا ہاؤس اسکین ہاؤس (اب بابر ہاؤس) تھا۔

صاحب زاد گل ملٹری کالج جہلم میں

ملٹری کالج جہلم میں صاحب زاد گل چار سال ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک رہے۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے کچنر کالج نوگانگ بھیج دیا گیا۔ جو ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج تھا۔

ملٹری کالج کے زمانہ تعلیم میں صاحب زاد گل کیسے تھے؟ ان کی کارکردگی کیسی تھی؟ ان کے نصابی کارنامے کیا تھے؟ اور سب سے بڑھ کے یہ کہ ان کی قدریں کیا تھیں؟ قیادت کی صلاحیت کا معیار کیا تھا؟ ان اہم سوالوں کے جوابات کیلئے ہم نے صاحب زاد گل کے ساتھیوں، دوستوں اور ہم عصروں سے رجوع کیا ان میں سے بعض کے تاثرات نقل کئے جاتے ہیں۔

کرنل (ریٹائرڈ) عبدالمتین نے صاحب زاد گل کے بارے میں اپنی یادوں کو یوں تازہ کیا۔

میرا کالج نمبر ۶۴۴ ہے۔ صاحب زاد گل کا ۱۷، تھا اس لحاظ سے وہ مجھ سے جونیر تھے۔ لیکن ہم دونوں کئی سال اسکین ہاؤس (بابر ہاؤس) اور برڈ ووڈ ہاؤس (ایم جی ہاؤس) میں ایک ساتھ رہے اس کے علاوہ ایک ہی ضلع کوہاٹ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے چھٹیوں میں ایک ساتھ ہی آتے جاتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے تھے۔ کالج سے باہر کبھی واکنگ آؤٹ وغیرہ کے لئے جانا ہوتا تو بھی ساتھ ہی جاتے تھے ایسے موقعوں پر ہمارے مشترکہ دوست محبوب (کالج نمبر ۶۱۲) بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں جو چند لڑکے کشمیر سیر کیلئے گئے تھے وہ ان میں سے ایک تھے۔ کشمیر کی مشہور جھیل ڈل کی سیر میں محبوب (نمبر ۶۱۲) بھی اس کے ساتھ تھے۔ صاحب زاد گل کچھ عرصے کیلئے

برڈووڈ ہاؤس کے ہاؤس ہیڈ بوائے (ہاؤس پریفکیٹ) بھی رہے۔ پھر اس عہدے سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ وجہ یاد نہیں رہی۔ البتہ یہ یاد ہے کہ گل خان (نمبر ۶۶۶) ان کی جگہ ہیڈ بوائے بنا تھا۔

صاحب زاد گل کو اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا خود سر تو خیر نہیں تھے لیکن انہیں اپنی خودی کا شدید احساس تھا کسی سے دبتے نہیں تھے بیباک، پُرعزم اور باوقار انسان تھے۔ دیکھنے میں بھی شاندار اور دل و دماغ کے اعتبار سے بھی شاندار گو بظاہر سنجیدہ نظر آتے تھے اور تھے بھی طبعاً سنجیدہ مزاج لیکن اپنے دوستوں کی محفل میں ہنسی مذاق میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا شمار اعلیٰ صلاحیت کے طلباء میں ہوتا تھا اس لحاظ سے وہ اپنی عمر سے آگے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) راجہ خان کا بیان

ہم دونوں ایک ساتھ ایک ہی سال اگست ۱۹۳۷ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ صاحب زاد گُل کے بارے میں اس وقت جو باتیں یاد آرہی ہیں وہ یہ ہیں کہ:-

"صاحب زاد گل۔ گٹھے قد کا سرخ و سفید رنگ کا پٹھان لڑکا تھا۔ حد درجہ صحت مند اور چاق و چوبند تھا۔ اس کو دیکھ کر سب سے پہلے اس کی غیر معمولی صحت اور توانائی کا احساس ہوتا تھا۔ اجڈ قطعاً نہیں تھا۔ عادات و اطوار میں شائستگی اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ غیور، ارادے کا پکا اور دوستوں کا دوست۔ یہ اس کے کردار کی خصوصیات تھیں یہ وہ تاثرات ہیں جو ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ گل ہاکی اور فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ تعلیم میں بھی کافی لائق تھا۔ اس لئے وہ ان چھ لڑکوں میں سے تھا جنہیں کرنل اسٹیبنگ نے کمیشن کے لئے چنا اور کچنز کالج نوگانگ بھیج دیا۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔

ہاں ایک آدھ بات اور یاد آئی۔ ۱۹۴۱ء میں گل، برڈووڈ ہاؤس (موجودہ ایم۔ جی۔ ہاؤس) کا ہاؤس ہیڈ بوائے تھا۔ ۱۹۴۱ء ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک روز ہم چند دوست کالج سے گجرات شہر تک سائیکلوں پر گئے کچھ سیر و تفریح کی، کھایا پیا۔ اور اسی روز واپس آگئے۔ صاحب زاد گل اس

پکنک میں پیش پیش تھا۔

کرنل (ریٹائرڈ) محمد خان لکھتے ہیں

میں نے پہلی بار صاحب زادگل کو ۱۹۳۸ء میں دیکھا جب میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ صاحب زادگل مجھ سے ایک سال اور ایک کلاس سینئر تھے۔ میں اسکین ہاؤس کی سیکشن نمبر تین میں تھا اور نمبر ۶۴۴ (اب کرنل ریٹائرڈ) عبدالمتین میرے سیکشن کمانڈر تھے۔ صاحبزادگل نمبر ۴ سیکشن میں تھے۔ اس لئے تقریباً روز ملنا ہوتا تھا۔ صاحب زادگل کو اپنے قد، خدوخال، لباس اور چال ڈھال کے لحاظ سے ہم میں سے بلشتر پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جو مشہور کیولری رجمنٹ سندھ ہاؤس میں رسالدار میجر تھے مختلف چھاؤنیوں میں رہے تھے اور اچھے سکولوں میں پڑھے تھے اور فوجی زندگی سے ایک حد تک مانوس تھے۔ اس کے علاوہ صاحب زادگل پڑھنے میں بھی تیز تھے۔ کھیلوں پی۔ٹی پریڈ میں بھی ممتاز تھے۔ ان وجوہ سے انہیں ہاؤس میں اور کالج میں خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ کالج کے کمانڈانٹ میجر ٹی۔ ایچ ایل سٹیبنگ کی ان پر خاص توجہ تھی۔ وہ ہم سب سے بہت پہلے جونیئر پریفیکٹ بن گئے تھے۔ اس کے بعد پر ڈوڈ ہاؤس کے ہیڈ بوائے کے عہدے تک پہنچے۔

صاحب زادگل کو کالج کے سالانہ تقسیم انعامات پر امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے کے انعامات ملا کرتے تھے۔ انہوں نے فٹ بال کھیلنے میں بھی نام پیدا کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم چند دوست اور صاحب زادگل اتوار کے دن اکثر اپر جہلم کے کنارے دور تک سیر کو جایا کرتے تھے۔ گرمیاں ہوتیں تو ہماری محفلیں نہر کے پل کے سائفن کے نیچے جمتی تھیں سائفن کی ٹھنڈک اور ساتھ چشمے کے سردپانی کی لذت مجھے اب بھی نہیں بھولتی۔ اتوار کے دن کا ایک مشغلہ جہلم میں گھومنا پھرنا تھا۔ کبھی کبھی سینما دیکھ لیا کرتے تھے۔ صاحب زادگل ان تفریحوں میں آگے آگے ہوتے تھے۔

اس زمانے میں کالج کی زندگی بہت سخت تھی۔ سزا کا دستور عام تھا۔ جونیئر لڑکوں کو سینئر کھینچتے رہتے تھے اور سینئرز کی شامت کمانڈانٹ اسٹیبنگ کے ہاتھوں آتی تھی۔ یہ روز کا سلسلہ تھا۔ میجر (بعد کو کرنل) اسٹیبنگ بہت ہی کامیاب کمانڈانٹ تھے۔ بڑے ہمدرد خیر خواہ، ہر وقت سر پر موجود۔ لیکن جانچ پڑتال میں بڑے سخت تھے۔ غلطی ذرا سی بھی ہو ہرگز معاف نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ جونیئرز کی غلطیوں کی سزا ان کے کمانڈر کو ملا کرتی تھی۔ کس سلسلے میں یہ تو یاد نہیں رہا۔ لیکن بہرحال کسی فروگذاشت کی پاداش میں ایک بار صاحب زادگل بھی دھر لئے گئے اور کمانڈانٹ کے آفس میں حاضری کا بلاوا آ گیا جس کے معنی یہ تھے کہ بید لگیں گے۔ کمانڈانٹ کی بید زنی سے سب لڑکے کانپتے تھے۔ صاحبزاد گل نے کسی کے مشورے سے یا خود ہی دفتر میں حاضر ہونے سے پہلے نیکر کے نیچے ایک تولیے کی تہہ جمالی تاکہ بیدوں کی ضربیں تولیے تک محدود رہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کی یہ دور اندیشی کام نہ آئی۔ اسٹیبنگ کی تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ دفاعی انتظامات کئے گئے ہیں چنانچہ صاحبزادگل کو حکم ہوا کہ غسل خانے جا کر پہلے تولئے کو شرف جدائی بخشیں پھر تن تنہا میدان میں اتریں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس ذہانت کا بھی انہیں خصوصی "صلہ" ملا۔ دوستوں نے صاحبزادگل کو چھیڑا تو بولے۔ جوئے میں جیتنا لازمی نہیں ہوا کرتا کبھی کبھی تدبیریں الٹ بھی جاتی ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال قریشی سے انٹرویو

سوال: پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیے کہ صاحب زادگل سے آپ کا تعلق کہاں کہاں کتنے عرصے اور کس کس طرح رہا؟

جواب:۔ کالج میں، دو سال مجھے ان کے ساتھ گزارنے کا موقعہ ملا اس کے بعد تقریباً ایک سال ہم دونوں کچنر کالج نوگانگ میں پری کیڈٹ ٹریننگ کے لئے یکجا رہے۔ اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے پھر آخر میں ان کی شہادت سے ایک دو دن قبل کھیم کرن کے

علاقے میں ان سے اتفاقیہ مختصر ملاقات ہوئی۔

سوال:۔ پہلے ان کے کالج کے زمانے کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب:۔ کالج میں، صاحب زادگل مجھ سے ایک سال بعد داخل ہوئے تھے۔ میرا کالج نمبر ۲۶۴ ہے۔ ان کا ۱۷۰ تھا۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے ایک سال جونیئر تھے لیکن چونکہ ان کا داخلہ براہِ راست آٹھویں درجے میں ہوا تھا۔ اس لئے کلاس میں ہم دونوں ساتھ تھے۔ ۱۹۴۰ میں ہم دونوں نے ایک ساتھ آرمی سپیشل پاس کیا اور پھر کم و بیش ایک سال ہم دونوں پوسٹ اسپیشل کلاس میں بھی یکجا رہے۔ اسی زمانے میں مجھے صاحبزادہ گل کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

سوال:۔ یہ پوسٹ اسپیشل کلاس کیا تھا؟ اس کی کچھ وضاحت کیجئے؟

جواب:۔ جو لڑکے آرمی اسپیشل پاس کر لیتے تھے ان کو اس کلاس میں کمیشن کی تیاری کے لئے موقعہ اور وقت دیا جاتا تھا۔ ایک کلاس روم میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے پڑے ہوتے تھے کونے میں ایک میز پر ریڈیو رکھا ہوتا تھا۔ بیچ کی بڑی میز پر انڈیا کے تمام انگریزی اخبار اور انگلستان کے بہت سے انگریزی اخبار اور رسالے پڑے ہوتے تھے۔ خبریں سننا اور اخبار رسالے اور معلوماتی کتابیں پڑھنا یہ ہمارا مشغلہ تھا کبھی کبھی کسی معاملے پر بحث مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔

اُردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں آتا تھا ہماری بول چال لکھت پڑھت سب انگریزی میں ہوتی تھی۔

سوال:۔ کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ نے کوئی کلاس نہیں لی؟

جواب:۔ باقاعدہ کلاس تو انہوں نے کبھی نہیں لی غیر رسمی طور پر بتاتے سمجھاتے رہتے تھے۔ ہاں ان کی بیگم ضرور ایک طرح سے تربیت کرتی تھیں۔

سوال:۔ وہ کیسے؟

جواب:۔ ہفتے میں ایک دن وہ، ہمیں اپنے بنگلے پر بلاتی تھیں پہلے چاء، کیک وغیرہ کھلاتی پلاتیں پھر اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اگر لان میں بیٹھے ہوتے تو موسم کی بات بھی ہوتی۔ اصل میں یہ ہماری انگریزی بول چال کو بہتر بنانے اور آداب مجلس سکھانے کا ایک بہانہ تھا۔ غالباً ان کے اپنا کوئی بچہ نہیں تھا مسز اسٹیبنگ ہم چاروں سے بہت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ اسٹیبنگ جتنے سخت تھے ان کی بیگم اتنی ہی شفیق تھیں۔

سوال:۔ چاروں کون؟

جواب:۔ ۴۱-۱۹۴۰ء کے پوسٹ اسپیشل کلاس میں ہم چار لڑکے تھے میں، صاحب زاد گل اور گل خان چوتھا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ پوسٹ اسپیشل کلاس کے لڑکوں کا ایک کام اور بھی تھا اور وہ یہ کہ جس کسی جونیئر کلاس کا کوئی انسٹرکٹر چھٹی پر ہوتا یا کسی اور وجہ سے حاضر نہ ہوتا تو اسکی کلاس ہم لیتے۔ چنانچہ ہفتے میں ایک آدھ پریڈ تاریخ۔ شہریت یا جغرافیہ یا حالات حاضرہ پڑھاتے تھے اس سے انگریزی بولنے کی مشق ہوتی اور اپنے پر اعتماد بھی پیدا ہوتا تھا۔

سوال:۔ اس پوسٹ اسپیشل کلاس میں صاحب زاد گل کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب:۔ اس پوسٹ اسپیشل کلاس میں لڑکے ہی چار تھے سب کی طبیعت کا رنگ اور دلچسپیاں جدا جدا تھیں۔ گل خان کو فلموں کی تصویروں سے دلچسپی تھی وہ اخبارات اور رسالوں کے فلمی حصوں کا رسیا تھا مجھے جنرل نالج سے متعلق تراشے لینے کا شوق تھا۔ صاحب زاد گل رسالوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ رسالوں میں بھی سائنسی مضامین زیادہ پڑھتے تھے۔ یا پھر لائبریری سے کتابیں لا کر انہیں پڑھتے رہتے تھے۔

سوال:۔ کس قسم کی کتابیں؟

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ تاریخی اور جنگی مہمات کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اسی قسم کی کتابیں میں نے اکثر ان کے پاس دیکھیں۔

سوال:۔ صاحب زادگل نے کالج میں اور کیا امتیاز حاصل کیا تھا۔

جواب:۔ صاحب زادگل کا شمار کالج کے ذہین، اسمارٹ اور ممتاز طلبہ میں تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اتھلیٹکس اور فٹ بال میں نمایاں مقام حاصل تھا سو میٹر اور دو سو میٹر کی دوڑ میں بہت تیز تھے اور ان سرگرمیوں میں حصہ لینے پر انہیں انعامات بھی ملتے رہتے تھے صاحب زادگل کی انگریزی خاص طور پر اچھی تھی غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شروع سے انگریزی اسکول میں پڑھتے آئے تھے۔

سوال:۔ کالج میں اس وقت انگریزی کا معیار کیسا تھا؟

جواب:۔ اونچے درجوں میں تو انگریز سارجنٹ وغیرہ انگریزی پڑھاتے تھے ابتدائی درجوں میں ہم بیسک انگلش پڑھتے تھے اور اس میں بہت لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

سوال:۔ مثلاً۔

جواب:۔ مثلاً مجھے اچھی طرح یاد ہے غالباً چھٹی یا ساتویں کی انگریزی کی عملی تعلیم کا گھنٹہ تھا۔ ہم انگریزی بول چال کیلئے اسٹیشن کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اسٹیشن کے قریب ریلوے مزدوروں کا ایک پرانا ویران ٹوٹا پھوٹا کمرہ نظر پڑا۔ جس کی دیوار میں روشندان کے قریب ایک بڑا سوراخ تھا۔ ہمارے استاد شاہ صاحب نے بے ساختہ کہا THERE IS A MOKHA IN THE KOTHA چونکہ خواہ انگریزی آئے نہ آئے انگریزی بولنا سب کے لئے لازمی تھا اس لئے اسی طرح کے دلچسپ مکالمے اکثر سننے میں آتے تھے۔

سوال:۔ پوسٹ اسپیشل کلاس میں آپ دونوں کتنے عرصے رہے؟

جواب:۔ تقریباً ایک سال پھر ہم کیڈٹ کالج کے لئے منتخب ہو کر دوبارہ کیڈٹ کالج میں یکجا ہوئے۔

سوال:۔ اس سے پہلے کہ کیڈٹ کالج کی بات کریں یہ بتائیے کبھی صاحب زادگل کو کالج میں سزا ملی تھی؟

جواب:۔ یقیناً ملی تھی۔ اسٹیبنگ نے بہت تواضع کی تھی۔

سوال :۔ کیوں؟

جواب :۔ غالباً کسی جونیئر کی کٹ کا قصہ تھا اس زمانے میں جونیئر کی غلطی کی سزا سینئر کو بھی دی جاتی تھی۔

کیپٹن نواب خان کے تاثرات

(کالج نمبر ۸۷۹) آنریری کیپٹن ملک نواب خان کہتے ہیں۔

"جب ۱۹۴۰ء میں، میں کالج میں داخل ہوا تو ۱۷۰، صاحب زاد گل رابرٹس ہاؤس میں نمبر دو پلاٹون کے کمانڈر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد صاحب زاد گل نے ہماری کلاس بھی لی وہ اس طرح کہ وہ سینئر اور ہوشیار لڑکے، جو آرمی اسپیشل کا امتحان پاس کر کے کمیشن کی تیاری کر رہے ہوتے، کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ ان کی تربیت اور حوصلے کے لئے ان سے کلاسیں بھی پڑھواتے تھے۔ صاحب زاد گل جب کمیشن کیلئے کیڈٹ کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے تو کبھی کبھی جونیئر کلاسوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ پڑھائی میں صاحب زاد گل کا نام تھا۔ کھیلوں میں بھی بہت اچھے تھے باکسنگ اور کراس کنٹری میں بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔

سینئر کیڈٹ افسر، کی حیثیت سے گل بہت سخت تھے۔ بڑا رعب تھا۔ دیکھنے میں بھی شاندار تھے۔ یہاں اس وقت کے کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اسٹیبنگ بہت سخت تھے۔ لیکن لڑکوں کی دیکھ بھال اور تربیت کرنے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں جونیئر تھا تو چھوٹے لڑکوں کو انہوں نے کئی بار اپنے بنگلے پر بلا کر آئس کریم کھلائی۔ اس کی بیگم ہسپتال میں بیمار لڑکوں کی بہت پوچھ گچھ کرتی تھیں۔ آئس کریم اور پھل بھی کھلاتی تھیں۔ بعض لڑکے محض آئس کریم اور پھل کھانے کیلئے بیمار بن جاتے تھے۔ ان دنوں کالج کی زندگی بہت سخت تھی۔ لیکن دیکھ بھال اور تربیت بھی بہت اچھی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کالج نے بڑے بڑے اعلیٰ افسر پیدا کئے۔

صاحب زادگل کا کمیشن کی طرف پہلا قدم

اس زمانے میں کالج سے صرف چند لڑکے کمیشن کی ابتدائی تربیت کے لئے کچنر کالج نوگانگ بھیجے جاتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں کالج کے کمانڈانٹ میجر ٹی ایچ ایل سٹیبنگ نے جو چند لڑکے کچنر کالج کے لئے منتخب کئے ان میں سے ایک صاحب زادگل تھے۔ کچنر کالج بھیجنے سے پہلے ان کیڈٹوں کو یہاں بھی اسٹیبنگ خصوصی تربیت دیتے تھے اس تربیت کا ایک حصہ یہ تھا کہ یہ لڑکے کمانڈانٹ کے یہاں مہمان ہوتے تھے اور آداب مجلس اور کھانے کے آداب اور انگریزی بولنا سیکھتے تھے۔ صاحب زادگل نے دسمبر ۴۱ء میں ملٹری کالج کو خیر باد کہا۔

کچنر کالج کے بارے میں کرنل اقبال کا انٹرویو

کچنر کالج میں کرنل اقبال قریشی (امتیازی سند) بھی صاحب زادگل کے کلاس فیلو تھے ان سے اس سلسلے میں یہ دلچسپ باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ کچنر کالج کیا تھا اور کہاں تھا؟

جواب:۔ کچنر کالج سی پی انڈیا میں نوگانگ کے مقام پر ایک طرح کا پری کیڈٹ کالج تھا۔ جو لارڈ کچنر کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں پہلی جنگ عظیم کے ترک جنگی قیدیوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کالج میں انڈین آرمی کے مختلف یونٹوں سے آئے ہوئے کمیشن کے امیدواروں کو پری کیڈٹ طرز کی تقریباً ایک سال تک تربیت دی جاتی تھی اور جو امیدوار کمیشن کیلئے موزوں سمجھے جاتے تھے۔ انہیں کمیشن کیلئے آئی۔ ایم۔ اے ڈیرہ دون یا کسی۔ او۔ ٹی ایس بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن کمیشن کے لئے موزونیت کا پروانہ ملنا آسان کام نہ تھا۔ کمیشن کے لئے موزونیت کا فیصلہ سراسر کمانڈانٹ کرنل۔ جی۔ ایس اسٹیل ہاردے کے ہاتھ میں تھا۔ کرنل اسٹیل اور اس کا ایڈجوٹینٹ جس کے نام کے آخر میں بھی ہاردے آتا تھا۔ دونوں

اپنے معیاروں میں بہت سخت تھے۔ چنانچہ کالج میں کمیشن کے امیدواروں کے آنے جانے کا تانا بندھا رہتا تھا۔ آنے والوں کے لئے گرین بس اور جانے والوں کے لئے آر،ٹو،یو سرخ بس تھی۔ میں یہ تفصیل اس لئے سنا رہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس ماحول میں بھی صاحب زاد گل نے اپنا مقام پیدا کیا تھا۔

سوال :۔ ذرا اس امر کی وضاحت فرمائیے ؟

جواب :۔ کچنر کالج میں مسلمانوں کی تعداد تیس چالیس فیصد کے قریب تھی۔ لیکن وہ وہاں چھائے ہوئے تھے۔ جب میں اپنی یونٹ سے اپنے کاغذات نامزدگی اور دوسرے ضروری سازوسامان کے ساتھ کچنر کالج پہنچا تو صاحب زاد گل وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ملٹری کالج ہی کے عثمان خان کالج نمبر ۳۶۰ وہاں ایک پلاٹون کے کیڈٹ پلاٹون کمانڈر تھے کچھ دنوں کے بعد کی بات ہے کہ ایک انٹر پلاٹون فٹ بال میچ ہو رہا تھا۔ سبزی (صاحب زاد گل) بڑے جوش سے کھیل رہے تھے۔ مخالف ٹیم کا ایک سکھ کھلاڑی ان سے اس طرح ٹکرایا کہ فٹ بال ان سے نکل گیا۔ سبزی اس سے بھڑ گئے۔ ایک انڈین جے سی او ایڈجوٹینٹ بلونت سنگھ ریفری کر رہا تھا اس نے سیٹی بجا کر کھیل روک دیا اور سکھ کھلاڑی کو چھوڑ کر سبزی کو فیلڈ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ سبزی نے اس کھلی بے انصافی کے خلاف احتجاج کیا جس میں دوسرے مسلمان لڑکے بھی شریک ہو گئے بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ کچنر کالج کے ماحول میں کسی چیز پر احتجاج کرنا خواہ کتنا ہی جائز کیوں نہ ہو کالج سے یعنی کمیشن سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ لیکن سبزی نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ جرأت کردار، سبزی میں ہمیشہ سے تھی۔

سوال :۔ صاحب زاد گل کو وہاں کوئی عہدہ وغیرہ ملا تھا؟

جواب :۔ غالباً نہیں۔ گو فٹ بال اور اتھلیٹکس کی ٹیموں میں وہ شامل تھے اور اس سلسلے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہیں انعامات وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے۔ عہدے وہاں عموماً ان

کیڈٹس کو ملتے تھے جو رینکس سے آتے تھے اور ان کاموں میں زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ لیکن ایک ایسا واقعہ ضرور ہوا جس سے ثابت ہوا کہ سبزی نیچرل لیڈر تھے جہاں کہیں کوئی مسئلہ پیدا ہوا صاحب زاد گل از خود آگے جاتے تھے۔

سوال:۔ اس امر کی کوئی مثال؟

جواب:۔ کنگ جارج ملٹری کالج اجمیر سے ایک مرہٹہ لڑکا آیا تھا۔ وسنت راؤ سامے اس کا نام تھا۔ صاحب زاد گل کی پلاٹون میں تھا۔ بڑے غضب کا دوڑنے والا تھا۔ ۴۴۰ اور ۸۸۰ گز کی دوڑ بجلی کی طرح دوڑتا تھا۔ اس فاصلے میں وہ تمام کالج میں یکتا تھا۔ کورس ختم ہونے سے پہلے کمانڈانٹ کرنل جے اسٹیل ہاروے نے اس کا پتہ کاٹ دیا۔ تمام کالج میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ وسنت راؤ سامے (آر ٹی یو) ہو گیا سرخ بس اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسپرنٹر ہونے کی وجہ سے سارے کالج میں مشہور تھا اور اپنی خوش مزاجی سے اپنی پلاٹون میں بہت مقبول تھا۔ چنانچہ صلاح ہوئی کہ کرنل ہاروے سے اپیل کی جائے کہ اسے کمیشن سے محروم نہ کریں چنانچہ بہت سے لڑکے جمع ہوئے ایسے موقعوں پر مشکل یہ ہوتی ہے کہ گھنٹی کون باندھے۔ جو لڑکے اس کام کے لئے آگے بڑھے ان میں ایک صاحبزاد گل تھے۔ بلکہ سب سے آگے آگے یہی تھے۔ چست بلند قد، گورے چٹے اور پُر اعتماد اس پر طرہ ان کی شاندار انگریزی۔ اس وفد کی قیادت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سبزی سمجھے گئے۔ چنانچہ سبزی کی قیادت میں وفد کرنل ہاروے کے سامنے پیش ہوا۔ وہ بھی ایک کائیاں، گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے ان سے پوچھا سامے میں کون سا امتیازی وصف ہے جس کی بنا پر اسے کمیشن کیلئے منتخب کیا جائے۔ سبزی کے منہ سے نکل گیا جناب دوڑ میں اس کا جواب نہیں۔ ہاروے نے سکون سے جواب دیا۔ دوڑتے تو کتے اور بلیاں بھی ہیں۔

یوں یہ انٹرویو ختم ہو گیا۔ بعد کو میں نے پوچھا سبزی وہ اپنا یار سامے آر ٹی یو

(ریٹرن ٹو یونٹ ہوگیا) اور تمہاری لیڈری اس کو بچا نہ سکی۔ سبزی نے کہا کیا بتاؤں اس بڈھے کی دلیل کے سامنے لاجواب ہوگیا لیکن تم جانتے ہو بڑے بڑے جرنیل بھی کبھی کبھی مات کھا جاتے ہیں۔ ویسٹرن فرنٹ پر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

سوال:۔ کچنر کالج میں بحیثیت مجموعی صاحب زاد گل کی کارکردگی کیسی تھی؟

جواب:۔ بے حد شاندار وہ پہلی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ بلاشبہ سبزی اپنے کورس کے بہترین کیڈٹوں میں سے تھے۔

سوال:۔ صاحب زاد گل سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

جواب:۔ کچنر کالج کے بعد ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ پھر سبزی سے ملاقات ہوئی تو میدان جنگ میں ہوئی۔

سوال:۔ وہ کیسے؟

جواب:۔ میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کھیم کرن کے بائیں طرف ای، بی، آر کی ایک کمپنی کمان کر رہا تھا جو، بلوچ کو سپورٹ دے رہی تھی۔ غالباً ۸ ستمبر کی صبح کا ذکر ہے کہ کرنل صاحب زادے گل اپنے ٹینک میں ہمارے پاس سے گزرے تو ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے ٹینک میں کھڑے تھے۔ دشمن بہت دور نہیں تھا ہوا میں ہوائی برسٹ پھٹ رہے تھے، ان حالات میں، انہیں کمانڈ سیٹ میں ہونا چاہیئے تھا اس کا ڈھکنا بند ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ بڑی شان سے ٹینک میں کھڑے تھے اور آرمرڈ ٹینک کی بڑی دلیری سے راہنمائی کر رہے تھے۔ میں نے کہا سر کچھ احتیاط بھی ضروری ہوتی ہے۔ ائر برسٹ آ رہے ہیں۔

مرنا صرف ایک بار ہوتا ہے۔ ان کا جواب تھا۔

یہ الفاظ آخری الفاظ تھے جو میں نے ان کی زبان سے سنے دوسرے دن خبر آئی تو ان کی جانبازانہ شہادت ہی کی خبر آئی۔

کچنر کالج نوگانگ کا زمانہ

صاحب زاد گل کے کچنر کالج نوگانگ کے ساتھی میجر محمد اسلم لکھتے ہیں :-

۱۹۴۰ء میں ، میں نے اور صاحبزادہ گل نے ایک ساتھ اسپیشل کلاس پاس کی پھر میں تو ملٹری کالج میں اپنے قیام کا وقت پورا کرکے اپنے والد کی یونٹ میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن صاحب زاد گل ملٹری کالج ہی میں رہے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب اپنی یونٹ کی طرف سے کچنر کالج کے لئے منتخب ہو کر وہاں پہنچا تو صاحب زاد گل بھی ملٹری کالج سے منتخب ہو کر وہاں پہنچ چکے تھے۔ کچنر کالج میں میں اور گل ایک ہی کلاس میں تھے۔ وہاں قابلیت کی بنیاد پر جماعتیں تفویض کی جاتی تھیں۔ میں اور صاحب زاد گل دونوں "اے" کلاس میں رکھے گئے تھے ہماری کلاس میں ۲۲ کیڈٹ تھے۔ تقریباً تمام امتحانات میں صاحبزادہ گل اوّل آتے تھے اور میری پوزیشن عموماً نمبر دو ہوتی تھی۔ ۱۹۴۲ء کے امتحان میں بھی صاحب زاد گل اوّل آئے تھے اور ۷۵ فیصد نمبر حاصل کئے تھے اور مجھے ۷۳ فیصد نمبر ملے تھے۔

صاحبزادہ گل ذہین اور قابل تو مسلمہ حد تک تھے لیکن یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنی کلاس ہی میں سب سے چھوٹے نہیں تھے۔ بلکہ پورے کالج میں سب سے چھوٹے تھے۔ دوسرے کیڈٹ انہیں "سبزی" کے نام سے پکارتے تھے۔

کچنر کالج کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لینے کے باوجود اس سال صاحب زاد گل انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں داخل نہیں ہو سکے۔ کیونکہ ابھی وہ صرف ۱۷ برس کے تھے۔ لہذا ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون بھیجے جانے سے پہلے انہیں لاہور فارمین کرسچین کالج میں "دتہ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ" میں ایک سال سے کم عرصہ کی تربیت کے لئے بھیجا گیا تھا جس کے بعد وہ ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی میں گئے اور ۱۹۴۳ء میں کمیشن حاصل کیا جس کے بعد انہیں آرمڈ کور میں شامل کیا گیا۔

کچنر کالج میں صاحب زاد گل کی کارکردگی کے بارے میں کرنل عبدالمتین لکھتے ہیں۔

مجھے کچنز کالج نوگانگ میں سبزی (صاحب زادگل) کے ساتھ تقریباً ایک سال گزارنے کا موقعہ ملا۔ وہاں بھی سبزی نے اپنی دھاک جمادی تھی۔ بلکہ پورے کالج کا نام اونچا کردیا۔ ان کی تعلیمی قابلیت قیادت کی صلاحیت اور شخصیت سے کچنز کالج کا کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل اسٹیل ہاروے اتنا متاثر تھا کہ اس نے کورس کے آخری ٹرم میں صاحب زادگل کو کلاس روم کی حاضری سے مستثنیٰ کردیا تھا۔ بلکہ وہ کلاس وغیرہ لینے میں اکثر سٹاف کی مدد کیا کرتے تھے۔

کچنز کالج میں ان کی غیر معمولی کارکردگی کا ہی نتیجہ تھا کہ کمانڈانٹ اسٹیل ہاروے نے انکے کورس کے دوسرے لڑکوں سے پہلے ان کو کمیشن کیلئے سلیکشن بورڈ کے سامنے بھیجا۔ جہاں سے وہ پہلی ہی بار میں کامیاب اور سرخرو ہو کر لوٹے۔

بلاشبہ صاحب زادگل غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے انسان تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بلندیوں اور کامیابیوں کو تلاش ہوتی ہے۔

کمیشن اور اس کے بعد

کچنز کالج سے صاحب زادگل کمیشن کے حصول کے لئے ۴ ار جنوری ۱۹۴۳ء کو انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون گئے۔ آئی۔ ایم۔ اے ڈیرہ دون میں بھی ان کی کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ وہاں بحیثیت کیڈٹ آفیسر، قیادت کی ذمہ داری سنبھالی۔ آئی۔ ایم۔ اے۔ ڈیرہ دون سے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء کو انہیں رائل آرمرڈ کور میں کمیشن ملا۔ اس کے بعد انہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۴۵ کیولری میں پوسٹ کر دیا گیا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۴ء تک وہ ۴۵ کیولری کے ساتھ ہی رہے پھر انہیں آرمرڈ کور کی ایک نامور یونٹ (ان کے والد کی یونٹ) سندھ ہارس رجمنٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ان دونوں یونٹوں میں انہوں نے ٹروپ لیڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔ اس یونٹ کو بعد کو دوسری جنگ عظیم میں (شرق اوسط) بھیجا گیا تھا۔ اس یونٹ کے ساتھ صاحب زادگل ۳۰ نومبر ۱۹۴۷ء تک رہے۔ مڈل ایسٹ کے اس ساڑھے تین سال کے عرصہ میں انہیں مصر، شام

لبنان اور فلسطین میں اپنے فرائض سرانجام دینے کا موقعہ ملا۔ سندھ ہارس میں انہوں نے ٹروپ لیڈر، سیکنڈ ان کمانڈ، ایڈجوٹینٹ اور ٹیکنیکل افسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔

تقسیم کے بعد لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل کو یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو ۶ لانسرز میں پوسٹ کر دیا گیا۔ انہوں نے اس یونٹ میں ایم۔ٹی۔ او کی حیثیت سے ۲۸ جنوری ۱۹۴۸ء تک فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد انہیں آرمڈ کور اسکول میں ڈی ایم کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء کو انہیں ۶ لانسرز میں دوبارہ پوسٹ کر دیا گیا۔ جہاں انہوں نے اسکواڈرن ٹو۔آئی۔سی کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو ایک بار پھر آرمڈ کور سکول میں انسٹرکٹر کی حیثیت سے گئے۔ وہاں سے ان کی خدمات ملیشیا کے سپرد کر دی گئیں۔ جہاں انہوں نے۔ ایم۔ٹی اور ونگ کمانڈر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انہوں نے تقریباً تین سال فرنٹیئر کور کے ساتھ گزارے اس اثنا میں انہیں میجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو اپنی یونٹ ۶ لانسرز میں وہ پھر واپس آئے اور ۶ جنوری ۱۹۵۵ء تک ایک ٹینک اسکاڈرن کی قیادت کی۔ اسکے بعد وہ کمبرلے اسٹاف کالج میں کورس کرنے انگلستان چلے گئے۔ اس کورس کے لئے ان کا انتخاب ان کی ممتاز خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ اس کورس کو کامیابی سے ختم کرنے کے بعد وہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو پاکستان واپس آگئے اور ۱۰۰ انڈیپنڈنٹ آرمڈ بریگیڈ گروپ میں ۲ جنوری ۵۶ء سے اپریل تک ڈی اے کیو ایم جی کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد اپنے یونٹ میں ۲۲ اپریل ۵۶ء سے یکم جنوری ۵۷ء تک۔ ٹو۔ آئی۔ سی کی ذمہ داریاں سرانجام دیں اس ذمہ داری کے بعد ایک بار پھر انہیں ۱۰۰ انڈیپنڈنٹ آرمڈ بریگیڈ گروپ میں پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس بار انہوں نے اس بریگیڈ میں ۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء تک بی۔ ایم کی خدمات انجام دیں۔ اس پوسٹنگ کے بعد وہ ۲۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو پھر اپنی یونٹ ۶ لانسرز میں واپس آتے اور سکواڈرن کمانڈر رہے۔ ۱۳ نومبر ۵۸ء کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی کر کے سٹاف کالج کوئٹہ ڈی ایس کی حیثیت سے گئے۔ سٹاف کالج سے انہیں ایم۔ ٹی ڈائریکٹریٹ۔ جی۔ ایچ۔ کیو میں بھیجا

گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۶۴ء کو انہوں نے اپنی یونٹ ۶ لانسرز کی کمان سنبھالی۔ امیرجنسی کا اعلان ہونے پر وہ اپنی یونٹ کو قصور سیکٹر میں لے گئے اور جنگ شروع ہونے کے چند روز بعد وہ کھیم کرن کے معرکے میں ایک تاریخی ہیرو کی حیثیت سے اُبھرے۔

معرکہ کھیم کرن کا پس منظر

۶ ستمبر ۶۵ء کو صبح سویرے دشمن نے پُورے مغربی محاذ پر بھرپور حملہ شروع کیا۔ دشمن نے قصور کے راستے لاہور میں داخل ہونے کے لئے اپنے نمبر ۴ پہاڑی ڈویژن نمبر ۴۱ سپیشل بریگیڈ اور نمبر ۲ انڈیپنڈنٹ آرمرڈ گروپ کی بے پناہ قوت سے حملہ کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں پاک فوج کا صرف ایک ڈویژن اور چند ایک ٹینک یونٹیں تھیں۔ پھر بھی دشمن کے حملے کو پسپا کر دیا گیا۔ لیکن دشمن کو صرف پسپا کر دینا ہی کافی نہ تھا۔ دشمن لاہور سیکٹر میں سخت دباؤ ڈال رہا تھا اور ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اچانک حملہ کر کے دشمن نے نفسیاتی ہراس پیدا کر دیا تھا۔ اب فوجی کمان کے سامنے دو نشانے تھے ایک یہ کہ دشمن کے جارحانہ منصوبوں کا توڑ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو نفسیاتی مار دی جائے اس کے لڑنے کے حوصلے (مورال) کو پست کیا جائے اور اُدھر اپنی قوم اور فوج کے حوصلے کو بڑھایا جائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ کسی محاذ پر جوابی حملہ کر کے اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جاتی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ قصور سیکٹر میں جوابی حملہ کیا جائے اور دشمن کے اہم سرحدی قصبے کھیم کرن پر قبضہ کیا جائے۔ اس میں کامیابی سے لاہور سیکٹر میں دشمن کے حملے کا زور بھی ٹوٹ جاتا تھا اور اس کو وہ نفسیاتی چوٹ بھی پڑتی جس کی اشد ضرورت تھی۔

کھیم کرن پر کامیاب حملہ جنگی حکمت عملی کا شاہکار ثابت ہوا اس سے وہ تمام فوجی اور نفسیاتی فوائد حاصل ہوئے جن کی توقع تھی۔ کھیم کرن کی فتح میں سب ہی یونٹوں نے اپنا اپنا فرض انجام دیا۔ اس معرکے میں جو پاکستان کی عسکری تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ بہت سے ہیرو ابھرے اور ذاتی شجاعت و فراست کے بڑے بڑے کارنامے سامنے آئے۔ لیکن ان سب میں کئی

لحاظ سے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل کا کارنامہ ممتاز اور منفرد ہے اسی لئے انہیں کھیم کرن کا ہیرو کہا جاتا ہے۔ صاحب زاد گل کی رجمنٹ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ بڑی حد تک خود ان کی اپنی شجاعت فراست وقیادت کا اعجاز تھا۔

کھیم کرن کا معرکہ

قصور کے علاقے سے دشمن کو دھکیل کر اس کے گھر میں لڑائی لے جانے اور کھیم کرن کو فتح کرنے کے ہراول دستے کا خاص کام صاحب زاد گل کی رجمنٹ ۶ لانسرز کے سپرد ہوا (ان کے ساتھ دوسری یونٹیں بھی تھیں لیکن آگے بڑھنے کیلئے میدان صاف کرنا اسی بکتر بند رجمنٹ کا کام تھا) ۷ ستمبر کی صبح کو کرنل صاحب زاد گل نے پیش قدمی شروع کی۔ ٹینک کے راستوں پر دشمن شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ لیکن صاحب زاد گل ایک ایسی جگہ سے ٹینک آگے لے گئے۔ جس کے متعلق کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں سے بھی ٹینک گزر سکتا ہے۔ یہ جگہ پانی کی رکاوٹوں کی وجہ سے ٹینکوں کے قابل نہیں تھی۔ رجمنٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے کرنل صاحب زاد گل کا ٹینک سب سے آگے تھا۔

ٹینکوں کے ساتھ انفنٹری کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے مخصوص حالات میں انفنٹری کے بغیر ہی پیش قدمی جاری رکھی اور سرحد پار کر گئے۔ پیشتر اس کے کہ دشمن اپنی دفاعی پوزیشن میں ردوبدل کرتا کرنل صاحب زاد گل کے ٹینک کھیم کرن کے انسپکشن بنگلے تک پہنچ چکے تھے۔ دشمن نے زیادہ سے زیادہ توپ خانے کا فائر ان پر مرکوز کر دیا اور اپنے ٹینکوں کو مقابلے میں لے آیا۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ کرنل صاحب زاد گل کے ساتھ پوری رجمنٹ نہیں بلکہ صرف ایک اسکواڈرن یعنی رجمنٹ کا تیسرا حصہ تھا۔ اس مہم کے لئے اصولی طور پر اسکواڈرن لیڈر کو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس نازک موقعہ پر صاحب زاد گل گئے تاکہ رجمنٹ کے لئے میدانِ جنگ میں شجاعت اور جنگی چالوں کے معیار کا تعین کر سکیں۔

انسپکیشن بنگلے کے اردگرد اپنے ٹینکوں کو پھیلا کر انہوں نے دشمن کے بیشمار ٹینکوں اور ٹینک شکن ہتھیاروں کے خلاف گھوم پھر کر اور پینترے بدل بدل کر متحرک معرکہ لڑا اور دشمن کے بہت سے ٹینکوں کو تباہ اور بعض کو ناکارہ کر کے اسے پسپا کر دیا اور دشمن کے بہت سے پیادہ سپاہیوں کو قید کر کے پیچھے بھیجدیا اس تمام معرکے میں انہوں نے اپنے توپ خانے کا حفاظتی کور کم سے کم مانگا توپ خانے کے او پی نے ایک دو دفعہ کہا بھی کہ توپ خانے کا کور لے لیا جائے لیکن صاحب زاد گل نے کہا ہم خود سنبھال لیں گے۔ ایمونیشن ضائع نہ کرو آگے چل کر ہمیں زیادہ ایمونیشن کی ضرورت ہوگی۔ دشمن پر کاری ضرب لگا کر اور بھارتی سپاہ کے حوصلے پست کر کے کرنل صاحب زاد گل اپنے ٹینکوں کو صحیح سلامت واپس لے آئے۔ دشمن نے انہیں تباہ کرنے کے لئے بہت پینترے بدلے لیکن ایک پیش نہ گئی۔

یہ پہلی یلغار بہت کامیاب رہی تو ہائی کمان نے دوسرے روز صبح ۸ ستمبر کو وسیع پیمانے پر جوابی حملہ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ ابتدائی ضرب کے لئے کرنل صاحب زاد گل کو ہی منتخب کیا گیا۔ چنانچہ دوسرے متعلقہ یونٹوں کے ساتھ صاحب زاد گل نے حملے کا آغاز کیا۔ اس بار انہوں نے دو اسکواڈرن ساتھ لئے تھے۔ انہوں نے اسکواڈرن لیڈروں کو یہ مختصر ہدایت دی "ایک منٹ میں حملہ کرو ایک اسکواڈرن کھیم کرن کے دائیں سے دوسرا بائیں سے آگے بڑھے۔ کھیم کرن امرتسر سڑک کو ۲۹ سنگ میل پر کٹ کرو" اور انہوں نے حملہ کر دیا۔

دشمن کے نامور نمبر ۲ انڈیپنڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ نے کھیم کرن کو بچانے کے لئے سر توڑ کوشش کی۔ ٹینکوں اور توپوں کے گولوں سے جلتے ہوئے لوہے کی ایک دیوار سی کھڑی تھی۔ لیکن کرنل صاحب زاد گل کی اعلیٰ جنگی چالوں نے دشمن کے ٹینکوں کی ترتیب کو بکھیر دیا۔ پیچھے سے پاکستانی توپ خانے کی گولہ باری نے دشمن کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کرنل صاحب زاد گل نے صبح چھ بجے حملہ شروع کیا تھا۔ ۸ بجے تھے جب ان کے ایک اسکواڈرن نے کھیم کرن کو دائیں سے اور دوسرے نے بائیں سے گھیرے میں لے کے اس طرح دشمن سے چھین لیا جیسے کوئی چیز دونوں بازوؤں سے گھیرے میں لے لی جاتی ہے۔ یہ صاحب زاد گل کی کلاسیکی جنگی چالوں اور بے خطر ذاتی شجاعت

اور ان کے اسکواڈرن کی بے خوفی و بے جگری کا بے مثال مظاہرہ تھا۔
کھیم کرن سے کرنل صاحب زادگل نے مشرق میں ولٹوہا کے قصبے کی سمت حملہ کیا۔ راستے میں دو چھوٹی نہریں ماچی۔کے مائر اور رتو کے ماٹر تھیں جن سے ٹینکوں کو گزارنا بظاہر ممکن نہیں تھا۔گزرنے کے راستوں پر دشمن کے ٹینکوں اور توپ خانے کے فائر کا قبضہ تھا یہ صاحب زادگل کیلئے بہت بڑا چیلنج تھا۔ان کی جرأت اور فراست نے اس بظاہر ناممکن کام کو بھی ممکن کر دکھایا اور صاحب زادگل کے ٹینکوں نے ان آبی رکاوٹوں کو بھی عبور کر لیا۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اب دونوں اسکواڈرن دشمن کی بے پناہ مزاحمت کے باوجود ریلوے لائن کے دائیں اور بائیں آگے بڑھ رہے تھے۔توپ خانے کا فائر ساتھ تھا۔جس کو صاحب زادگل نے بہت احتیاط سے استعمال کیا دونوں اسکواڈرن ریلوے لائن اور اس کے دائیں بائیں پھیلے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے اور دشمن کی مزاحمت بے سود ثابت ہو رہی تھی۔اس موقع پر کرنل صاحب زادگل کا انداز یہ تھا کہ وہ کبھی ایک اسکواڈرن لیڈر کے ساتھ ہو جاتے اور کبھی دوسرے کے ساتھ وہ بھی اس حالت میں کہ قیامت کی گولہ باری جاری تھی۔
دن کے دو بجے وہ ولٹوہا ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئے اور دشمن ولٹوہا جیسا بڑا قصبہ خالی کر گیا۔

کھیم کرن کے معرکہ پر فرانس کے ایک جنگی مبصر پیرے ڈیبٹ نے یوں تبصرہ کیا۔
"۶ ستمبر کی صبح بھارت کی ایک ٹینک رجمنٹ پاکستان کی سرحد کے اندر اڑھائی میل تک چلی آئی پاک فوج کی صرف ایک ٹینک یونٹ جس کی قوت بھارتی ٹینک رجمنٹ سے بہت کم تھی۔اتنی بے جگری سے لڑی کہ بھارت کی حملہ آور ٹینک رجمنٹ کو دھکیلتی اور کچلتی ہوئی بھارت کے کھیم کرن جیسے بڑے قصبے تک جا پہنچی اور اس علاقے پر قابض ہو گئی۔بھارت کی بکتر بند اور پیادہ رجمنٹیں پسپا ہوتے ہوئے ۸۱ اور ۱۲۰ ملی میٹر گنوں اور مارٹر گنوں کے گولوں

کا بے اندازہ ذخیرہ ۹۰ ملی میٹر ٹینک شکن توپیں، ایمونیشن کے بند بکسوں اور پٹرول کے بند ڈرموں کے ڈھیر، چالو توپیں چند ٹینک اور بہت سی فوجی گاڑیاں میدان میں پھینک گئیں اور یہ سارا سامان اب پاکستان کے کام آرہا ہے۔"

یہ صاحب زاد گل کے زیر کمان اسکواڈرن کے حملے کی تیزی اور شدت ہی کا نتیجہ تھا کہ دشمن کو اتنا جنگی سامان چھوڑ کر افراتفری کی حالت میں پیچھے ہٹنا پڑا۔

کرنل صاحب زاد گل کے ساتھ انفنٹری نہیں تھی۔ سات بجے انہیں حکم ملا کہ واپس کھیم کرن آجاؤ۔ رات کے وقت ٹینک کو انفنٹری کی حفاظت کے بغیر دشمن کے علاقے میں نہیں رکھا جاتا۔ دوسرے دن کرنل صاحب گل کو پھر ولٹوہا تک جانے اور قبضہ مستحکم کرنے کے لئے بھیجا گیا آج دشمن کی مزاحمت کل سے بہت زیادہ تھی۔ اور مقابلہ بہت سخت تھا۔ ولٹوہا کو بچانے کیلئے دشمن نے جان کی بازی لگادی تھی۔ قیامت خیز گولہ باری میں کرنل صاحب زاد گل اپنے دونوں اسکواڈرنوں سے جنگی چالیں چلتے ہوئے ولٹوہا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کا انداز کل والا تھا۔ ان کا ٹینک کھلے میدان میں کبھی ایک اسکواڈرن لیڈر کے پاس جاتا اور کبھی دوسرے کے پاس وائرلیس پر ان کی گرجتی ہوئی آواز ٹینک سواروں کے حوصلے اور جذبے میں نئی روح پھونک رہی تھی۔ ولٹوہا سے ذرا اس طرف دشمن نے شدید مزاحمت کی۔ لیکن صاحب زاد گل نے اپنے ٹینکوں کو بڑی خوبی اور مہارت سے لڑایا۔ اڑھائی گھنٹے تک پینترے بدل بدل کر لڑنے کے بعد دشمن معرکے سے منہ موڑنے لگا۔ میدان جنگ کی صورت ایسی ہوگئی تھی کہ دشمن کی انفنٹری اور کیولری بکھر گئی اور پاکستانی ٹینک دشمن کے مورچوں تک چلے گئے تھے۔ اِکا دُکا فائر ہو رہا تھا یا کہیں سے مشین گن یا رائفل کا فائر آجاتا تھا۔

بحیثیت مجموعی محاذ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

کرنل صاحب زاد گل خطرناک حد تک آگے چلے گئے تھے گرد و غبار سے ٹینک کی

اسکرین سے میدان کا جائزہ ذرا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ باہر نکل کر گرد وپیش کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے یوں بھی وہ تین دن سے مسلسل لڑ رہے تھے۔ بہر حال جوں ہی وہ ٹینک سے باہر آئے اینٹی ٹینک گن کی ایک گولی ان کے سینے میں آ لگی اور پار ہو گئی اور اس حالت میں وہ ٹینک کے اندر چلے گئے وائرلیس آپریٹر نے کہا ٹینک واپس لے چلتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا زخم مہلک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کرنل صاحب زاد گل نے وائرلیس آپریٹر سے کہا مشن کی کامیابی تک کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں زخمی ہو گیا ہوں تاکہ مشن تکمیل کو پہنچے جب تک وہ ہوش میں رہے وائرلیس پر بولتے رہے جب بے ہوشی طاری ہونے لگی تو آخری لمحوں میں انہوں نے لا الہ الا اللہ پڑھا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

مشن مکمل ہو ہی چکا تھا دشمن نے ایک بار پھر ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے ٹینکوں کو آگے کیا مگر کرنل صاحب زاد گل کے ٹینک سواروں نے توپ خانے کے کور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر کار دشمن کو میدان سے منہ پھیرنا پڑا۔

صاحب زاد گل شہید ہو چکے تھے لیکن ان کا ٹینک بدستور دھاڑ رہا تھا۔ وائرلیس آپریٹر نے اپنے کرنل کی شہادت کو راز میں رکھا ہوا تھا توپچی گولے داغ رہا تھا۔ اور ڈرائیور اسکی ہدایت پر پینترے بدل رہا تھا۔ مشن مکمل ہو گیا تو اسکواڈرن لیڈروں کو علم ہوا کہ معرکے کے آخری مرحلے میں رجمنٹ کمانڈر کی لاش قیادت کرتی رہی ہے لاش کو پیچھے لایا گیا۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے افسروں نے لاش کو آخری سلامی دی اور نہایت ادب واحترام کے ساتھ کھیم کرن کے ہیرو کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں نوغ سرائے ضلع کوہاٹ بھیج دیا۔ شہید کو بہترین قیادت اور بے مثال شجاعت اور بہادری کے اعتراف میں ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔

شہادت سے پہلے کی کیفیت

۹ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو شہادت سے پہلے صاحب زاد گل کس موڈ میں تھے؟ کیا محسوس کر رہے

تھے ؛ اوران کا حوصلہ کیسا تھا حسن اتفاق سے اس کا مستند ریکارڈ موجود ہے۔

صاحب زاد گل کے ملٹری کالج کے زمانے کے ایک ساتھی اور آرمرڈ کور کے کرنل (ریٹائرڈ) محمد خان لکھتے ہیں :۔

کالج سے جانے کے بعد گو ایک عرصے کے بعد ایک بار پھر صاحب زاد گل سے (جواب سبزی) کے نام سے مشہور تھے۔ رسم و رداہ کا سامان پیدا ہوا وہ یوں کہ ہم دونوں نے کیولری میں اپنا کیریئر شروع کیا ہم دونوں کی رجمنٹیں مختلف تھیں۔ لیکن کور ایک (آرمرڈ) ہونے کی وجہ سے اکثر ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آرمرڈ کور میں سبزی کا کیریئر بہت ہی شاندار تھا۔ غیر معمولی کامیابیوں اور کورسوں سے بھرپور وہ ان افسروں میں سے تھے جو کیریئر کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری آخری ملاقات میدان جنگ میں ہوئی۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے کھیم کرن سیکٹر میں ہم دونوں ایک ایک بکتر بند رجمنٹ کی کمان کر رہے تھے ان کی رجمنٹ ہم سے آگے تھی اور ہماری فوج کے لڑاکا دستے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس دن اس فاتح کھیم کرن نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا اور سب سے بڑی قربانی (اپنی زندگی کی) دی۔ اس دن صبح میری ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ ان کو آپریشن گروپ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے پیچھے بلایا گیا جب وہ ہماری پوزیشنوں سے گزر رہے تھے تو ہم پر دشمن کا ہوائی حملہ ہوا۔ مجبوراً انہیں میرے کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں کچھ دیر رکنا پڑا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتوحہ ہندوستانی علاقے میں یہ ایک کھیت تھا۔ اونچی اونچی فصل تھی۔ جہاں ہماری آخری ملاقات ہوئی۔ سبزی اس وقت بپھرے ہوئے شیر کی طرح تھے۔ جو شکار پر جھپٹنے ہی والا ہو ان کی تیز آنکھیں جوش وجذبے سے اور زیادہ چمک رہی تھیں۔ وہ بڑے جوش میں تھے۔ ان کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں انہوں نے کہا مومو (وہ مجھے کالج کے زمانے میں مومو ہی کہا کرتے تھے) حالات کا جو رخ ہے۔ اس کے پیش نظر مجھے تو انجام

قریب نظر آتا ہے۔

وہ جنگ کی رفتار اور انداز سے مطمئن نہیں تھے ان کی رجمنٹ یلغار کرتی ہوئی کھیم کرن سیکٹر میں اندر بہت دور ولٹوہا کے مقام تک پہنچ گئی تھی۔لیکن چونکہ رات کیلئے انفنٹری کا کور مہیا نہ کیا جا سکا تھا۔اس لئے ہر اول دستے کو پیچھے لانا پڑا تھا۔سبزی اپنے پیشے میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے وہ دیر تک اس محاذ کے مختلف پہلوؤں پر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔لیکن جوں ہی ہوائی حملہ ختم ہوا وہ نئے احکامات لینے "اوء" گروپ روانہ ہو گئے اور ایک بار پھر ان کی رجمنٹ فاتحانہ انداز میں برسر پیکار تھی۔غالباً یہ ۹ ستمبر کی بات ہے۔اسی دن وہ شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

۱۹۶۵ء کی جنگ میں آپ ۶ لانسرز کی کمان کر رہے تھے آپ نے ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو صرف آٹھ ٹینکوں کی مدد سے کھیم کرن پر پہلا حملہ کیا۔دشمن نے کھیم کرن کا نہایت مضبوطی سے دفاع کر رکھا تھا لیکن آپ نے اس شدت اور تیزی کے ساتھ کھیم کرن کے اندرونی حصار پر حملہ کیا کہ دشمن اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گیا۔آپ نے رائل دکن ہارس کے دو ٹینک تباہ کئے۔ ۲۷ جنگی قیدی اپنے قبضہ میں کئے اور دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد واپس اپنی دفاعی لائن میں آ گئے اس حملے کے بعد کھیم کرن پر قبضہ کرنے کے دروازے کھل گئے اور آخر اس رات کو ایک بڑے حملے سے کھیم کرن پر قبضہ کر لیا گیا۔

۸ اور ۹ ستمبر کو آپ نے کھیم کرن سے آگے ولٹوہا تک دشمن پر پے در پے کئی وار کئے۔انفنٹری کی کمی کے باعث ہر رات کرنل صاحب زاد گل کو واپس اپنی دفاعی لائن میں آنا پڑتا۔آپ ہمیشہ سب سے آگے والے ٹینک سے رجمنٹ کی کمان کرتے اور ایسے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ پیش قدمی کرتے جیسے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ کسی تربیتی میدان میں آگے بڑھ رہے ہوں اور حملوں سے آپ نے

دشمن کے حوصلے پست کردیئے۔

آخر ۹ ستمبر کو دشمن پر بار بار کاری ضرب لگانے کے بعد آپ نے اسل اتر کے نزدیک دشمن کی ایک مشین گن سے اپنے ٹینک کے کمان کپولے پر جام شہادت نوش کیا۔ بے مثال جرأت و دلیری اور ولولہ انگیز کامیاب قیادت کے لئے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید کو ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

جنگ سے پہلے شہادت کے سائے

ایک حقیقت جو ۶۵ء اور ۷۱ء کے شہیدوں کے احوال و اقوال کا تجزیہ کرنے سے بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ شہید کی نفسیات ہی علیحدہ ہوتی ہے۔ میدان کارزار میں اترنے سے بہت پہلے وہ نفسیاتی طور پر شہادت کے لئے تیار ہوتا ہے بلکہ شہادت کی جستجو میں ہوتا ہے۔ لاشعوری اور شعوری ذوق شہادت اس سے وہ قدم بار بار اٹھواتا ہے جہاں شہادت کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے شہادت کے سائے اس کے اعمال اور اقوال پر پڑنے لگتے ہیں اور اس کے کاموں اور باتوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اس کی چھٹی حس اسے کیا بتا رہی ہے۔

جنگ سے ذرا پہلے کرنل صاحب زاد گل کے طرز عمل سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شہادت کے سائے ان کے لاشعور پر پڑنے لگے تھے اور وہ ذہنی طور پر اپنی زندگی کے سب سے بڑے معرکے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔

ان کے گھر والے گواہ ہیں کہ وہ لڑائی چھڑنے سے کچھ عرصہ پہلے جب چھٹی گھر گئے تو اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی بیگم کو اپنا بنک اکاؤنٹ سمجھایا۔ اپنی انشورنس پالیسیاں ان کے حوالے کیں اور روپے پیسے کا جو لین دین تھا اس کی تفصیل بتائی۔ اس کے علاوہ وہ چھٹیاں انہوں نے کچھ اس انداز سے گزاریں جیسے وہ ان کی آخری چھٹیاں ہوں خلاف عادت بچوں کے بارے میں وہ اکثر تفصیل سے اظہار خیال کرتے

اوران کے مستقبل سے متعلق جو منصوبے ان کے ذہن میں تھے وہ ان پر گفتگو کیا کرتے۔

صاحب زاد گل کی شخصیت و کردار کا جائزہ

یہ جاننے کیلئے کہ کوئی کیا تھا اور کیسا تھا اس کے بھائی اور بیٹے سے زیادہ کس کے تاثرات معتبر ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم نے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارۂ جرأت کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رحیم گل کو زحمت دی کہ وہ اپنے نامور بھائی کے بارے میں اظہار تاثرات کریں۔ انہوں نے یہ لکھا۔

صاحب زاد گل بحیثیت ایک انسان

وہ بہت ہی مضبوط ارادے کے آدمی تھے۔ جب ایک بار کسی بات کا تہیہ کر لیتے تو دنیا کی کوئی رکاوٹ اسے پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ جسمانی طور پر بھی بہت مضبوط تھے۔ لمبی دوڑ دوڑنے والے ایتھلیٹ کی تاب و طاقت تھی۔ پیدل چلنے کے شوقین تھے اور ساتھ چلنے والوں سے ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ بہت اچھے نشانہ باز تھے۔ شکار کے بہت شائق تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اپنے پیشے سے غیر متعلق کتابیں بھی بہت شوق سے پڑھتے تھے اور بہت تیز رفتاری سے پڑھتے تھے۔ ایک آدھ دن میں ایک کتاب ختم کر ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور پھر لطف یہ کہ جو کچھ پڑھتے تھے اس کے نکتے ذہن میں محفوظ بھی رکھتے تھے۔ غرض بہت وسیع المطالعہ تھے بے تکلف لکھ بھی سکتے تھے۔ بولنے میں بھی بند نہیں تھے۔ انہیں تقریر کرنے میں پہلا انعام آٹھ برس کی عمر میں بلرام انگلش میڈیم سکول بلرام (حیدر آباد دکن) میں ملا تھا۔ غرض وہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے انسانوں کے اس زمرے سے تعلق رکھتے تھے جو بڑے کارنامے انجام دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ انہیں فاتح کھیم کرن کہا جاتا ہے۔ جو لوگ بھی انہیں قریب سے جانتے ہیں وہ مجھ سے اتفاق کریں گے۔ وہ اس سے زیادہ بہت کچھ فتح کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

بحیثیت بھائی کے

وہ صرف عمر میں ہی بڑے نہیں تھے اپنے رویے میں بھی بڑے تھے۔ بحیثیت بڑے بھائی کے اکثر سمجھاتے بتاتے بھی تھے۔ لیکن ان کی محفل میں دستور زبان بندی نہیں تھا۔ ہمیں ان کے سامنے بات کرنے کی بھی آزادی تھی اور جب ہم بولتے تو بہت توجہ سے سنتے تھے اور ہمارے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بات مجھے ان میں بہت پسند تھی بڑے تھے لیکن رویہ حاکمانہ نہ تھا۔ اس پر وقار اور پر شفقت رویے کی وجہ سے ہمارے لئے وہ ایک عجیب چیز ہو گئے تھے۔ ایک طرف تو ہم باپ کی طرح ان کا لحاظ کرتے۔ دوسری طرف ایک دانا اور (مفکر) دوست کی طرح ان کے مشوروں کا خیر مقدم بھی کرتے تھے۔

ہمارے والد جلال گل بھی بڑے کروفر کے آدمی تھے اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے بڑے آدمیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انگریز کے دور کے خطاب یافتہ تھے۔ او۔بی۔ای۔ ان کی بھی بڑی آن تھی۔ ان کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جلال گل نام تھا۔ تھے بھی بڑے جلال کے آدمی۔ بھائی (صاحب زاد گل) کو میں نے ان سے بھی اختلاف رائے کرتے دیکھا ہے۔ لیکن بے حد ادب اور سلیقے کے ساتھ بحث کرتے تھے جس میں نافرمانی یا گستاخی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

آخر میں، میں ان کی ایک اور خصوصیت کا تذکرہ کروں گا وہ یہ کہ ایک معزز اور معتبر باپ کے بیٹے تھے۔ خود بھی معتبر اور معزز تھے۔ گاؤں اور آس پاس کے علاقے میں ان کی اور ان کے خاندان کی ایک پوزیشن تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھائی گل میں تکبر و غرور نام کو نہیں تھا۔ گاؤں کے غریب سے غریب لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ سب سے جھک کے ملتے تھے اور اسی کی تلقین ہمیں بھی کیا کرتے تھے، ہمارے والد جلال گل کی مقبولیت کا راز بھی یہی خاکساری تھا۔

بھائی کو ہم سے جدا ہوئے اب ۴ برس ہونے کو آئے اب بھی یاد آتے ہیں تو دل بھر آتا ہے قبر پہ جاتا ہوں تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ بڑے اچھے انسان تھے۔

بیٹے کے تاثرات باپ کے بارے میں

صاحب زاد گل کے بڑے بیٹے کیپٹن یوسف گل ۶ لانسرز لکھتے ہیں۔

میں تیرہ برس کا تھا جب آغا جان شہید ہوئے۔ نعیم گل مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔ ہم دونوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مار پیٹ کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کے ہاں حکم عدولی کی سزا بڑی سخت تھی۔ جواب کرنے سے منع کرتے تھے۔ پہلے اس کو نرمی سے سمجھاتے تھے۔ اس کے بعد اگر میں یا نعیم وہ کام کر بیٹھتے تو پھر ان سے بُرا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت کھرے آدمی تھے۔ بالکل سیدھے گھوما پھرا کر نہ بات کرتے تھے نہ کام۔ کسی کا کام کرنا ہوتا تو کر دیتے تھے۔ ورنہ صاف انکار کر دیتے تھے۔ اپنی بات کا انہیں بہت پاس ہوتا تھا۔ میں نے گھر میں سنا کہ ہمارے دادا بھی خود سر تھے۔ خودسری میرے والد میں بھی تھی۔

اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جاتی اور ہم صاف صاف آکر بتا دیتے تو خوش ہوتے اور اکثر معاف کر دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ غلط کام کر کے اس کو مان لینے کی ہمت ہونی چاہیئے اور پھر سزا بھگتنے کی جرأت ہونی چاہیئے۔ بزدلی اور چالاکی کو وہ بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آغا جان کی بڑی خواہش تھی کہ میں فوج میں جاؤں اور ان کی جگہ لوں۔ میرے لہو کو گرمانے کے لئے وہ آباؤ اجداد کی دلیری کے قصے اور اپنے تجربات سنایا کرتے تھے۔ خصوصاً فوجی زندگی کے بارے میں وہ مجھے بہت سی باتیں بتاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت میں چھوٹا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح باتیں کرتے جیسے میں کوئی جونیئر افسر ہوں۔ ان کی زندگی کے کچھ اصول تھے وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اپنی زندگی کے کچھ اصول بناؤں بلکہ خود دریافت کروں۔ پھر بھی میری رہنمائی کے لئے اپنے کچھ مشاہدات اور مشورے میرے لئے لکھ کر چھوڑ گئے ان میں بعض یہ ہیں:۔

۱۔ نڈر رہو کام میں بھی بات میں بھی۔ آخر جرأت ہی کی فتح ہوتی ہے۔

۲۔ لوگوں کو خصوصاً اپنے ماتحتوں کو اپنے معیار سے اپنے حالات سے، اور اپنے مزاج کے پیمانے سے

نہ ناپو، تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھو، پھر دیکھو کہ کس نے کیا کیا۔

۳۔ طاقت جب پاس ہو تو اس کو احتیاط سے استعمال کرو بلکہ سب سے آخر میں استعمال کرو طاقت کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی انتہائی طاقت کا استعمال کرے مگر بعد کو اس کے نقصانات کا ازالہ کرنا مشکل بلکہ اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔

۴۔ جہاں سزا دینا ضروری ہو وہاں سزا نہ دینا بزدلی ہے اگر کسی نے جان بوجھ کر غلطی کی ہے تو اس کو معاف کر دینے سے بڑھ کر کوئی اور غلطی نہیں ہو سکتی۔

۵ :۔ لوگ دشمن بنانے سے ڈرتے ہیں لیکن اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہاری بات ٹھیک ہے تو پھر کوئی چھوٹا بڑا دشمن بنتا ہے بنا کرے۔ لیکن یہاں ایک پرانی کہاوت یاد رکھو کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمن کو بھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کسی کو دشمن بنا کر غافل ہو جانا عقل مندی نہیں ہے ایک اور کہاوت ہے کہ ایک مطلبی کو سو بھوتوں کا زور، یوں سمجھو کہ ایک دشمن کو بھی سو بھوتوں کا زور ہوتا ہے اس لئے ہر دشمن سے خبردار رہنا چاہیئے۔

۶ :۔ اسی طرح اکثر لوگ تعریف کرنے سے ڈرتے ہیں۔ بڑوں کی نہیں چھوٹوں کی۔ اپنے سے جونیئرز یا ماتحتوں کی تعریف کرنے میں کبھی بخل نہ کرو۔ بخل بدترین خامیوں میں سے ایک ہے۔ لیکن کسی کی جائز تعریف میں کوتاہی کرنا بخل کی بدترین صورت ہے۔ جائز تعریف نہ کرنا اور ہمت افزائی نہ کرنا احساس کمتری کی علامت ہوتی ہے۔

۷ :۔ ایک چینی کہاوت بھی یاد رکھو۔ بانس کا پیڑ جتنا اونچا ہوتا جاتا ہے۔ ہواؤں کے سامنے زیادہ جھکتا ہے۔

صاحبزادگل کے چھوٹے بیٹے نعیم زادگل سے انٹرویو

سوال :۔ نعیم اپنا تعارف کرائیے۔

جواب:۔ میرا نام نعیم زادگل ہے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل صاحب زادگل شہید کا چھوٹا بیٹا ہوں۔

سوال:۔ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟

جواب:۔ میں خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہوں۔ تیسرے سال میں۔

سوال:۔ یہ بتایئے کہ جب آپ کے والد شہید ہوئے تو آپ کی عمر کیا تھی؟

جواب:۔ کوئی سات سال۔

سوال:۔ کچھ باتیں اس زمانے کی آپ کو یاد ہیں؟

جواب:۔ جی ہاں۔ اپنے والد کو اور ان کی باتوں کو کون بھول سکتا ہے۔

سوال:۔ کوئی خاص بات اس زمانے کی؟

جواب:۔ پہلی تو بات یہ کہ ابو پڑھنے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ میں اس وقت تو بچہ تھا سمجھتا نہیں تھا بس اتنا یاد ہے کہ ہمیشہ زیادہ پڑھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پڑھنے سے آدمی حیوان سے انسان بنتا ہے۔

سوال:۔ پڑھنے پڑھانے کے معاملہ پر کبھی سزا بھی ملی؟

جواب:۔ وہ بہت شفیق اور کریم باپ تھے لیکن ان کا غصہ بھی غضب کا تھا۔ اس لئے ہم ان سے ڈرتے بھی بہت تھے۔ صرف ان کا کڑی نگاہ سے دیکھ لینا کافی ہوتا تھا۔

سوال:۔ پڑھنے کے علاوہ بھی کوئی نصیحت وہ بار بار کرتے تھے؟

جواب:۔ بزرگوں کی عزت پر بڑا زور دیتے تھے وہ اپنے والدین کا بہت لحاظ کرتے تھے اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کی بھی بہت عزت کرتے تھے گاؤں کے سب لوگوں کے ساتھ انکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔ گھر میں خیر خیرات بھی ہوتی ہے وہ غریب غرباء کو ہمارے ہاتھ سے خیرات دلوایا کرتے تھے۔ تاکہ ہم بھی غریبوں سے فیاضانہ سلوک کرنا سیکھیں۔

سوال:۔ سُنا ہے کہ آپ کے والد بڑے اچھے شکاری تھے۔ کبھی آپ ان کے ساتھ شکار پر بھی گئے؟

جواب:۔ شکار پر جانے کے لئے تو میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ لیکن جو کچھ میں نے اس سلسلہ میں

سنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھے شکاری تھے اور شکار کا بہت شوق تھا۔ جب کبھی چھٹی آتے تو دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام ضرور بناتے۔ نشانہ اتنا اچھا تھا کہ شکار میں جب کبھی چار پانچ مارخوروں یا ہرنوں کو دیکھ لیتے تو سب کو ایک ساتھ نشانہ نہیں بناتے تھے بلکہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اس پر فائر کرتے تھے۔ اور ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں اب بھی مارخوروں اور گلگت کے بارہ سنگوں کے لمبے لمبے سینگ اور کھالیں موجود ہیں۔

سوال:۔ آپ کے والد اپنی اولاد میں کس سے زیادہ محبت کرتے تھے؟

جواب:۔ ہم بہن بھائیوں میں سے وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی طاہرہ سے بہت پیار کرتے تھے جو ان کی شہادت کے وقت دس ماہ کی تھی یہی ہمارے پاس ان کی سب سے آخری اور پیاری نشانی ہے۔

سوال:۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی شہادت پر آپ نے کیا محسوس کیا؟

جواب:۔ اس وقت تو میں بہت چھوٹا تھا۔ اب جب کہ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور پڑھا ہے تو مجھے ان پر فخر ہوتا ہے۔ اپنے غیر سب ان کی اب تک بہت تعریف کرتے ہیں چونکہ کم سنی ہی میں ان کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ اس لئے میں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں ان کی شفقت کی پیاس تو مجھے ساری عمر رہے گی۔

صاحب زاد گل کا کردار پاکستان کی تحریک میں

سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں وہ براہِ راست حصہ نہیں لے سکتے تھے لیکن ایک پرجوش اور بیدار مغز مسلمان افسر کی حیثیت سے وہ پاکستان کی تحریک سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا اور جب صوبہ سرحد کے مخصوص سیاسی حالات کے سبب وہاں ریفرنڈم کرانے کی ضرورت پڑی تو صاحب زاد گل چھٹی

لے کر گاؤں چلے گئے اور دور دراز کے لوگوں کو پاکستان کی اہمیت واضح کی۔ ہندوؤں کی حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ گویا تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان سے انکی وابستگی بہت گہری اور پختہ تھی۔

شہید کا خاندان

صاحب زاد گل کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ ڈاکٹر رحیم گل اور گروپ کیپٹن سعید گل صاحبزاد گل کی شادی بنت عم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام یوسف گل ہے جو اپنے والد کی رجمنٹ ۶ لانسرز ہی میں کیپٹن ہیں۔ یوسف نے بھی ملٹری کالج میں پڑھا ہے۔ صاحب زاد گل کے دوسرے بیٹے کا نام نعیم گل ہے جو خیبر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہے۔

ایک شاعر کا نذرانۂ عقیدت

صاحب زاد گل شہید کی شہادت پر ایک شاعر نے یوں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

اے قوم کے مجاہد اے سر بکف سپاہی
قائم رہے ہمیشہ تیری یہ کج کلاہی
تو نے ستمگروں کو للکارا قہر بن کے ٹوٹا!
دے گا تیرے عمل کی سارا جہان گواہی
اے قوم کے محافظ اے سر بکف سپاہی

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید

ستارۂ جرأت (دوبار)

بلوچ رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ــــــــــــ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۶ء

جائے پیدائش ــــــــــــ مونہ۔ جہلم

کمیشن ــــــــــــ ۱۹۴۵ء او۔ ٹی۔ ایس مہو

تاریخ شہادت ــــــــــــ ۵ر مئی ۱۹۷۲ء

مقام شہادت ــــــــــــ چانارج۔ لیپا ویلی

اعزاز ــــــــــــ ستارۂ جرأت ۱۹۶۵ء

ــــــــــــ ستارۂ جرأت ۱۹۷۲ء

مدفن ــــــــــــ مونہ۔ جہلم

کفن کا ٹکڑا

لیبا کی مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر ایک باوقار نمازی نکلا اور لیبا کے بازار سے گزرتے ہوئے حاجی شیر زمان کی دکان سے اس نے لٹھے کا ایک ٹکڑا لیا اور سر سے باندھ لیا جو لوگ ساتھ تھے۔ انہوں نے پوچھا۔

کرنل صاحب یہ کیا؟

کرنل نے جواب دیا۔

میری آرزو ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہو کپڑے کا یہ ٹکڑا میرا کفن بنے، آپ لوگ گواہ رہیں اور دعا کریں کہ مولا کریم میری یہ آرزو پوری کرے اور یہ بھی کہ جب تک چک پترا سے ہندوؤں کو نکال نہ دوں مجھے موت نہ آئے۔

سر سے کفن باندھ کے شہادت کی آرزو کرنے والے حق نواز کیانی تھے۔ یہ واقعہ مئی ۱۹۴۲ء کے پہلے جمعہ کا ہے اور اس کے راوی وادی لیبا کے گاؤں کرناہ کے مدرسہ فیض الاسلام کے مہتمم مولوی نصر اللہ خان ہیں۔ اللہ نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری کیں۔ چند روز بعد چک پترا کو بھی انہوں نے آزاد کرایا اور شہادت سے سرفراز بھی ہوئے۔

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت (دوبار) کی ایمان افروز داستان حیات کے چند اوراق پیش کیے جاتے ہیں۔

آباؤ اجداد

حق نواز کیانی کا نسلی تعلق گکھڑوں کے مشہور جنگجو قبیلہ سے تھا ان کے والد راجہ اللہ دتہ نے خاندانی روایت کے مطابق سپاہ گری کے پیشہ کو اختیار کیا وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں راجپوتانہ رائفلز میں بھرتی ہوئے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے صوبیدار کے عہدے

تک پہنچے تھے۔ کہ جنوری ۱۹۴۰ء میں بنوں کے قریب قبائلیوں سے ایک معرکے میں کام آئے۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت

جہلم سے مغرب کی طرف کالا ڈپو کے قریب گکھڑوں کا ایک پرانا گاؤں مونہ ہے۔ یہاں ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو حق نواز پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی اور گاؤں کی مسجد میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ سال بھر بعد کالا گوجراں کے اسکول میں بٹھا دیئے گئے پرائمری کی پانچ جماعتیں انہوں نے اسی اسکول سے پاس کیں۔ صوبیدار اللہ دتہ بڑی سوجھ بوجھ کے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بہتر تعلیم حاصل کرے اور بہتر انسان بنے اس لئے وہ اپنے ہونہار بیٹے کو اپنے ساتھ کوہاٹ لے گئے۔ حق نواز نے سال بھر کوہاٹ میں پڑھا وہاں سے چھٹی جماعت پاس کر کے تیرہ برس سات مہینے کی عمر میں ملٹری کالج جہلم میں داخل ہوئے جو اس وقت کنگ جارج پنجم رائل انڈین ملٹری اسکول کے نام سے موسوم تھا۔

حق نواز کیانی ملٹری کالج جہلم میں

حق نواز ۱۰ اگست ۱۹۳۹ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے اور ۸۳۵ کالج نمبر ملا ان کا پہلا ہاؤس برڈوڈ ہاؤس (ایم جی ہاؤس) تھا جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو گمنام تھے۔ اس سال کے پچاس ساٹھ لڑکوں میں سے صرف ایک لیکن جب کالج چھوڑا تو اپنے گروپ کے سب سے زیادہ ممتاز کیڈٹ تھے جب تک حق نواز کالج میں رہے کالج پر چھائے رہے خصوصاً آخری دو سالوں میں جب وہ کالج بٹالین کے ایڈجوٹینٹ سینئر کمانڈر اور کالج کے ہیڈ بوائے تھے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں حق نواز کے والد کے انتقال کے بعد کالج کے کمانڈانٹ کرنل اسٹیبنگ نے ایک طرح سے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا وہی ان کے مربی اور سرپرست تھے حق نواز بھی جوہر قابل تھے۔ انہوں نے اس خصوصی سرپرستی سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی جسمانی اور

ذہنی قوتوں کو خوب چمکایا۔کیانی اپنے زمانے میں کالج کے ممتاز ترین طلبا میں سے تھے کھیلوں اور اسپورٹس میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ہر کھیل اور اسپورٹ کی کالج ٹیم میں تھے۔ باکسنگ کی کالج ٹیم کے وہ کپتان بھی تھے اور آل انڈیا ٹورنامنٹ دہلی میں اپنی ٹیم کو لے کر گئے تھے پریڈ کی کمان کرنے میں کمال حاصل تھا اس کی داد انہوں نے انڈین آرمی کے انگریز کمانڈر انچیف سے بھی حاصل کی۔

بے حد سمارٹ تھے۔ وردی بلکہ ہر لباس بڑے اہتمام سے پہنتے تھے ان کا سلیوٹ مثالی تھا۔ کمانڈانٹ کا حکم تھا کہ سب لڑکے کیانی کے سلیوٹ کی نقل کریں۔

۱۹۴۲ء میں کیانی کالج کی بٹالین کے پہلے ایڈجوائنٹ مقرر ہوتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ کالج بٹالین کے کمانڈر رہے اسی سال انہیں کالج کا آل راؤنڈ بہترین کیڈٹ منتخب ہونے پر گارڈنر میڈل ملا۔ ۱۹۴۳ء میں انہیں کمیشن کے لئے چن لیا گیا۔ ملٹری کالج میں حق نواز کیانی چار سال رہے۔ ان چار سالوں میں انہوں نے نصاب کے سوا ہر شعبے میں غیر معمولی امتیاز حاصل کیا۔ ان کی جرائت اور قیادت کی صلاحیت اس پائے کی تھی کہ ہر ایک اس کی تعریف کرتا تھا۔

حق نواز کیانی او ٹی ایس مہو میں

آفیسرز ٹریننگ اسکول سنٹرل انڈیا میں مہو کے مقام پر تھا کالج سے جو چھ لڑکے اس گروپ میں منتخب ہو کر او ٹی ایس مہو گئے تھے حق نواز کیانی ان میں سے ایک تھے۔ مہو میں حق نواز نے میدانی (آؤٹ ڈور) مشاغل اور مقابلوں میں اپنے امتیاز کو قائم رکھا۔ انٹر کمپنی مقابلوں میں وہ اپنی پلاٹون اور کمپنی کی نمائندگی کرتے تھے لیکن چونکہ ان کی طبیعت میں تیزی زیادہ تھی۔ اس لئے اپنے لہو کو گرم رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے تھے اور اس سلسلہ میں اکثر کسی نہ کسی تادیبی کاروائی کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔

کیانی نماز کے تو ملٹری کالج کے زمانے میں ہی پابند تھے مہو میں انہوں نے رمضان کے روزے

بھی پابندی سے رکھتے۔ اور اصرار کرتے تھے کہ دوسرے مسلمان زیرِ تربیت افسر بھی شعائرِ اسلام کی پابندی کریں۔ اس مذہبی جذبے کی وجہ سے دو ایک ڈرامائی واقعات بھی ہوئے جن کی تفصیل ہم نے کرنل کیانی کی مفصل سوانح حیات، بعنوان لیبیا ویلی کا ہیرو میں دی ہے۔

۱۰ اور ۱۱ فروری ۱۹۴۵ء کی درمیانی شب کو حق نواز نیم لفٹیننی کا ایک پھول کندھے پر سجا کر دھوسے فارغ ہوئے۔

حق نواز کو اپنے والد کی رجمنٹ راجپوتانہ رائفلز میں کمیشن ملا تھا۔ چنانچہ راجپوتانہ رائفلز کی ۲/۶ بلٹن سے منسلک ہو کر انہوں نے دو اڑھائی سال ہندوستان کے مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیئے اس کے بعد پاکستان بننے پر وہ بلوچ رجمنٹ سے وابستہ ہو گئے۔

شادی

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حق نواز کی شادی ان کے قریبی عزیز میجر محمد یعقوب کی بیٹی سے ہوئی۔ اس زمانے میں کشمیر کا جہاد شروع تھا۔ شادی کے تیسرے دن انہیں کشمیر جانے کا حکم ملا۔

کشمیر آپریشن میں حق نواز کا حصہ

کیانی نے اپنی بلوچ رجمنٹ کے ساتھ پانڈو پہاڑی کے معرکے میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے انٹیلی جنس افسر تھے اور اپنی تیز کاروائیوں کی وجہ سے انہیں اس پانڈو آپریشن میں پہاڑی کبوتر کہا جانے لگا تھا۔

پی ایم اے میں پلاٹون کمانڈر

کشمیر آپریشن کے بعد کیانی، کیپٹن کے عہدے کے ساتھ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی خالد کمپنی میں پلاٹون کمانڈر رہے اس ذمہ داری سے فارغ ہونے کے بعد حق نواز کیانی اپنی بلٹن کے ساتھ مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

کوہاٹ کا زمانہ

۴۔بلوچ۔ ۵۷-۵۶-۱۹ء میں کوہاٹ میں تھی حق نواز میں مذہبی احساس تو پہلے بھی تھا لیکن بظاہر وہ ایک عام دنیادار سے افسر تھے خوش لباس، خوش طبع، سطحی راحتوں اور لذتوں کے دلدادہ۔ زندگی کی ترنگوں میں کھوئے ہوئے لیکن کوہاٹ میں ایک بزرگ کی توجہ سے ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی چنگاری شعلہ بن گئی۔ ان کا قلب روشن ہو گیا۔ ان بزرگ کے فیض صحبت سے (جو اب پیر صاحب لکگول شریف کے نام سے معروف ہیں) وہ آہستہ آہستہ اس مومن کی تصویر بن گئے۔ جس کی شان میں اقبال نے کہا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اسکی نگاہ دلنواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

۶۱-۱۹۶۰ء کا معرکہ

۶۱-۱۹۶۰ء میں ہندوستان پاکستان کے درمیان سیالکوٹ جموں کی سرحد پر ایک چھوٹے سے علاقے پر محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ کیانی کی پلٹن ایبٹ آباد سے آکر اس بریگیڈ سے ملی جو بریگیڈیر شاہ نواز کی قیادت میں اس علاقے کا دفاع کر رہا تھا۔

یہ کیانی کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ اپنی کمپنی کو لے کر ٹھیک اس علاقے میں چلے گئے جس پر جھگڑا تھا اور جو ہر وقت دشمن کے فائر کی زد میں رہتا تھا۔ کیانی نے دشمن کی کارروائی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہاں مورچے بنوائے خود مورچوں سے باہر رہ کر دشمن کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے تھے۔

عین لڑائی میں نماز

اقبال کی مشہور نظم شکوہ کا مشہور شعر ہے۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز　　　قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

کیانی نے اس شعر کو حقیقت بنا کر دکھا دیا اس محاذ آرائی کے دوران جمعہ آگیا جمعہ کا وقت ہوا تو کیانی کے حکم سے سارے جوان اپنے مورچوں سے نکل آئے اور دشمن کی نگاہوں کے عین سامنے اس کے ایل ایم جی فائر کی ٹھیک زد میں کیانی کی پوری کمپنی نے جمعہ کی نماز ادا کی اور حیران دشمن نماز کے دوران ایک راؤنڈ بھی فائر نہ کر سکا بہرحال اتنا بڑا خطرہ کیانی ایسے پختہ ایمان اور جرأت کا انسان مول لے سکتا تھا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ اور پہلا ستارۂ جرأت

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر حق نواز کیانی ۱۹ اے کے رجمنٹ کے لڑاکا ونگ کی کمان کر رہے تھے۔ اس جنگ کے دوران کیانی نے ایک نہیں کئی حیرت انگیز کمانڈو ایکشن کئے جن کی پوری تفصیلات مختلف مصلحتوں کی وجہ سے لکھی نہیں جا سکتیں جرأت اور قوت ایمان کے یہ مظاہرے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ بہرحال ان میں سے ایک واقعہ کے بارے میں اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ واقعہ یوں ہے کہ کیانی دشمن کے علاقے میں کمانڈو کاروائیاں کر رہے تھے دشمن اپنے بہترین بلٹن کو سامنے لے آیا اس کے کرنل نے بلٹن کا دربار کیا تو بلٹن کا حوصلہ بڑھانے کیلئے پاکستان کے خلاف بہت نازیبا الفاظ استعمال کئے یہاں تک کہ بھارت کو محل سے تشبیہہ دے کر ہمارے ملک کو اس کا غسل خانہ بنایا۔ حق نواز کو اپنے مخبروں سے یہ اطلاع ملی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اسی وقت اپنے مخصوص دستے کے ساتھ روانہ ہو گئے صبح سویرے اس گستاخ کو اس کے ہیڈ کوارٹر کے غسل خانے

میں واصل جہنم کیا۔

اس واقعہ کی تفصیل ہم نے حیات کیانی میں اس معرکے کے ایک اور ہیرو کرنل قاضی جان ستارۂ جرأت کی زبانی بیان کی ہے اس کارنامے پر جو افسانہ کی حد تک حیرت انگیز ہے۔ حق نواز کو ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔ جرأت اور کامیاب قیادت کے اس غیر معمولی مظاہرے پر انہیں ۱۹۶۶ء کے وسط میں میجر سے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ورنہ اس سے پہلے اپنی باری پر وہ اس ترقی سے مختلف وجوہ کی بنا پر محروم رہے تھے۔

ایسٹ پاکستان کی پوسٹنگ

۶۷-۱۹۶۶ء میں تقریباً ایک سال لیفٹیننٹ کرنل حق نواز ایسٹ پاکستان رہے۔ ان کے ذمے ای پی آر (ایسٹ پاکستان رائفلز) کی کمان تھی وہاں سے واپس آکر ۶۸-۱۹۶۷ء میں حق نواز نو ڈویژن کے ساتھ کھاریاں میں رہے یہاں سے پھر آزاد کشمیر میں ۱۳ اے کے رجمنٹ میں پوسٹ ہوئے۔ یہیں سے وہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ سے پہلے ان پر فقر و درویشی کا رنگ پورے طور پر چڑھ چکا تھا۔ کشمیر کی آزادی جہاد اور شہادت یہ وہ موضوعات تھے جو ان کی گفتگو کے ہی نہیں ان کی زندگی کا بھی مطلوب مقصود بن گئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد

تلوار رکھنے کے بعد حق نواز نے ہل اٹھایا اور جہلم میں بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں فوج سے فارغ ہونے کے بعد اگر وہ چاہتے تو کوئی اور اچھی ملازمت یا کوئی نفع بخش تجارت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے کھلے آسمان کے نیچے کھلی زمین پر ہل چلانا مناسب سمجھا اور یہ عمل ان کی شخصیت اور نفسیات کے عین مطابق تھا۔ حق نواز آزادی پسند تھے

خود دار تھے اپنی جولانی طبع پر کوئی بیجا پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دگو یہ افتاد طبع اکثر ان کے لئے مشکلات کا سبب بنی) بہرحال جیسے تیسے انہوں نے ۱۹۷۱ء کے وسط میں مشینی کھیتی باڑی کا مشغلہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ

۳۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب مغربی سرحد پر بھی باقاعدہ جنگ چھڑی تو ریزرو فوجیوں اور افسروں کو فوجی خدمت کے لئے بلا لیا گیا روایت کے مطابق تو انہیں کسی دفتری کام پہ لگنا چاہیئے تھا۔ لیکن کیانی نے اصرار سے محاذ پر جانا پسند کیا۔ چنانچہ انہیں ایک بار پھر ان کی اپنی پرانی پلٹن ۱۳ اے کے رجمنٹ کی کمان دی گئی اور ایک بار پھر وہ اپنی محبوب وادی کیان یا لیپا ویلی میں پاک سرحدوں کی حفاظت پر مامور ہوئے اسی علاقے میں ۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنی تگ و تاز کا آغاز کیا تھا۔ یہیں ۱۹۶۵ء میں وہ مصروف کارزار رہے تھے۔ ۷۱ء میں پھر ان ہی وادیوں اور کہساروں نے انہیں آواز دی اور حق نواز نے اس آواز پر لبیک کہا وادی کے سبزہ زاروں کو خون کی آبیاری کی ضرورت تھی۔ اس آبیاری کے لئے کیانی سے زیادہ کس کا خون کام آتا۔

دسمبر ۷۱ء میں جنگ بندی کے بعد لام پر بلائے ہوئے افسروں کی واپسی کے احکام جاری ہو گئے۔ لیکن لیپا کے کمانڈر کے ایماء پر حق نواز کو مزید خدمت کے لئے روک لیا گیا۔ یہ قضا و قدر کا اشارہ تھا کہ کیانی تیار ہو جاؤ اب تمہیں زندگی بھر کی حسرتیں نکالنے کا موقع دیا جائے گا۔

لیپا ویلی یا وادی کیان

لیپا ویلی آزاد کشمیر کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کی بلندی ساڑھے چھ ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے سامنے شمشا بھری اور پیچھے کا فرخان رینج ہے دائیں طرف پڈوری ۱۰ پانڈو کی پہاڑیاں ہیں اور بائیں طرف چکوٹھ گاؤں ہے جو مقبوضہ علاقے میں ہے اور

ٹیٹوال سیکٹر سے صرف آٹھ میل دور ہے۔

حق نواز نے اپنی زندگی کا آخری اور عظیم ترین معرکہ اسی لیپا ویلی میں اس چٹان نما پہاڑی پر لڑا پہلے جس کا نام چانناں رج تھا اور اب کیانی رج ہے۔ یہ کیانی رج لیپا گاؤں سے شمال مشرق کی طرف تقریباً پندرہ سو گز کے فاصلہ پر ہے۔ جس کا ایک سلسلہ چک پترا کے نام سے مشہور ہے جس کی اونچائی ساڑھے نو ہزار فٹ ہے۔

معرکہ لیپا ویلی کا پس منظر

۳ دسمبر ۷۱ء کی شام کو دشمن نے لیپا ویلی پر ایک حملہ ٹیٹوال کی سمت سے کیا اور دوسرا حملہ توت مار گلی سے کیا یہاں ہمارے اسکاؤٹس تھے ان کی تعداد کم تھی اور ساز و سامان اس سے بھی کم۔ چنانچہ دشمن حملہ میں کامیاب رہا۔ ۶ دسمبر ۷۱ء سے آزاد کشمیر کی ایک بٹالین نے جم کر مقابلہ کیا۔ دشمن تمام وادی پر قبضہ کرنے میں تو کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس نے کچھ پیش رفت ضرور کی نتیجہ میں اس نے ہماری ایک پوزیشن بیڑ والی ناڑ کو گھیرے میں لے کر کمک اور سپلائی کے راستے کاٹ دیئے اس کے باوجود اس چوکی کے کمانڈر نے جی توڑ کر حملہ روکا۔ جب ۱۷ دسمبر ۷۱ء کو فائر بندی ہوئی تو پوزیشن دشمن کے گھیرے میں تھی۔ فائر بندی کے بعد بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ اس کے چاروں طرف کے پہاڑوں پر دشمن کی پوزیشنیں تھیں۔ بیڑ والی ناڑ تک سپلائی پہنچانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا جو دراصل ایک ندی ہے یہ راستہ آزاد کشمیر فورس کی تحویل میں تھا ادھر سے دشمن کے زیر تصرف علاقے سے گزر کر وہاں تک سپلائی جاتی تھی۔ ۱۷ دسمبر ۷۱ء سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

۲۷ اپریل ۷۲ء کو دشمن نے بیڑ والی ناڑ پوسٹ کی سپلائی کا راستہ بند کر دیا۔ یہ ایک طرح سے انتقامی کارروائی تھی چونکہ اس سے پہلے اس کو جوہا بلیح میں منہ کی کھانی پڑی تھی دشمن کی چال یہ تھی کہ اس پوسٹ پر دباؤ ڈال کر اپنے لئے جوہلا میں راستہ لے جس میں اس کا

ایک بریگیڈ متعین تھا اس پر مقامی کمانڈروں میں جو بات چیت ہوئی تو اس میں دشمن نے یہ مطالبہ دہرایا اور دھمکی دی کہ بصورت دیگر وہ اس پوسٹ تک راشن بھیجنا روک دیں گے۔ ۲ مئی کو جو میٹنگ ہوئی اس میں دشمن نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ آزاد کشمیر فورس بیٹر و والی ناڑ پوسٹ یا جموہا بلج سے گنی پتھراوالی پوزیشن چھوڑ دے۔ ورنہ اس پوسٹ کا راستہ نہیں کھولا جائے گا یہ مطالبہ نہیں جارحانہ دھمکی تھی۔ چنانچہ کرنل کیانی نے چیلنج کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم خود راستہ کھول لیں گے۔ اس پر بھارتی کرنل نے کہا میری طرف سے فائرنگ میں پہل نہیں ہوگی اور میٹنگ ختم ہوگئی۔ لیکن یہ مکاری کا وعدہ تھا۔ اسی رات دشمن نے دو طرف سے حملہ کر کے بیٹر و والی ناڑ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو اس پوسٹ کے کمانڈر نے بڑی جرأت اور فراست سے ناکام بنا دی لیکن اس پوسٹ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود تھے چنانچہ وہاں سے نہ زخمیوں کو پیچھے لایا جا سکتا تھا نہ لاشوں کو مزید برآں ان کا ایمونیشن بھی ختم ہو رہا تھا دوسرے دن بھی دشمن نے اپنی گولہ باری جاری رکھی۔ ناقابل برداشت صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ کرنل کیانی نے جوابی حملے کا پلان تیار کیا اور ضروری منظوری لے کر اس پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا۔ ۴، مئی کی رات اڑھائی بجے دشمن کی چک پترا پوسٹ پر حملہ کرنے کا وقت مقرر کیا گیا جس کی لمبی عمودی چوٹی پر سکھ رجمنٹ کی دو کمپنیاں بڑی مضبوطی سے مورچہ بند تھیں اور انہیں تین بیٹریوں کی سپورٹ حاصل تھی۔ رات کی تاریکی میں خاموشی کے ساتھ ساڑھے چار ہزار فٹ کی عمودی چڑھائی چڑھ کر مضبوطی سے مورچہ بند دشمن پر حملہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن چک پترا پر قبضہ کئے بغیر بیٹر و والی ناڑ پوسٹ محفوظ نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ناممکن کام کو ممکن بنانا بھی لازمی تھا۔

حق نواز کیانی نے وہ کفن سر سے باندھا جو انہوں نے پچھلے جمعے کو لیپا کے بازار سے لیا تھا۔ ایک پرجوش تقریر کی اور حملہ کے کمانڈروں کو ضروری ہدایات دے کر اپنی کمان پوسٹ میں سجدہ ریز ہو گئے۔ حملہ وقت پر شروع ہوا اور مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا دشمن کی سخت

اور سرتوڑ مزاحمت کے باوجود صبح چھ بجے تک کامیابی سے ہمکنار ہوا چک پترا کی بظاہر ناقابل تسخیر پوسٹ تسخیر ہو چکی تھی اور پاکستان کے جانبازوں نے قوت بازو سے بیڑرو والی ناڑ کا راستہ کھول لیا تھا۔

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حق نواز کیانی اس معرکے کی قیادت چانار ج (اب کیانی رج) کے کمانڈ بنکر سے کر رہے تھے۔ جب انہیں چک پترا کی چوٹی سے وائرلیس سے مشن پورا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سجدہ شکر بجا لائے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مورچے سے باہر آگئے اور کھلے میں آکر صورت حال کا جائزہ لینے لگے اس لمحے دشمن کی میڈیم گن کا ایک گولہ ان کے قریب آپھٹا جس سے حق نواز اور ان کے چند رفیق کار شہید ہو گئے۔

صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

لیپا ویلی کے معرکے کی اہمیّت

لیپا ویلی کے معرکے سے پوری آرمی کا حوصلہ بلند ہو گیا پوری قوم نے اس پر فخر کا اظہار کیا۔ پوری دنیا میں پاکستانی فوج کی قوت مدافعت کا سکہ ایک بار پھر بیٹھ گیا اور یہ حیران کن کامیابی بڑی حد تک حق نواز کیانی کے جوشِ ایمانی، جوشِ جہاد شوقِ شہادت اور قیادت کی بے نظیر صلاحیت کی مرہونِ منت تھی۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
کار آفریں و کار کشا و کار ساز

حق نواز کیانی کو اس عظیم کارنامے پر دوسری بار ستارۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔

شخصیت و کردار

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت دوبار کی زندگی اور شخصیت و کردار

پر ہم نے تفصیل سے حق نواز کیانی کی سوانح حیات لیپا ویلی کا ہیرو میں لکھا ہے ان صفحات میں اس کتاب کا ایک انتہائی مختصر خاکہ تبرک کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ ملٹری کالج کے شہداء کا یہ تذکرہ بھی حق نواز کے ذکر سے خالی نہ رہے۔ بہر حال شہید کی شخصیت و کردار پر نمونہ کے طور پر ہم دو اہم انٹرویو "لیپا ویلی کا ہیرو" سے نقل کرتے ہیں۔

میجر جنرل غلام محمد کے تاثرات

سوال:۔ پہلے تو وہ عام سوال کہ آپ حق نواز کیانی کو کب سے اور کیسے جانتے ہیں؟ ذرا عمر رفتہ کو آواز دیجئے؟

جواب:۔ میرا کالج نمبر ۸۸۵ ہے جب ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کو میں کالج میں داخلے کے لئے آیا تو تانگے سے اترتے ہی کالج کے جس لڑکے پر میری نظر پڑی وہ حق نواز کیانی تھے بے حد سمارٹ بے داغ وردی اور پر اعتماد مجھ پر بہت رعب پڑا میں نے دل میں کہا اگر کالج کا اسٹینڈرڈ یہ ہے تو کیا بات ہے بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ بحیثیت کارپول کے وہ نوواردوں کے استقبال پر مامور تھے۔ اور کالج سنٹرل ہال (جو اب میوزیم ہے) کالج میں نئے داخل ہونے والوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی حق نواز مجھے وہاں لے گئے۔

سوال:۔ داخلے کے دن نئے لڑکے کن مرحلوں سے گزرتے تھے ذرا اس کی تفصیل بھی بیان فرمایئے۔

جواب:۔ کالج کے سنٹرل ہال میں جمع ہو جانے کے بعد تمام لڑکے اپنے والد یا کسی بڑے رشتہ دار کے ساتھ باری باری کمانڈانٹ سے ملاقات کے لئے ان کے دفتر جاتے تھے۔ چونکہ ہر لڑکا کسی نہ کسی رجمنٹ کا نامزد کردہ ہوتا تھا اس لئے وہ عموماً اس یونٹ یا رجمنٹ کے بارے میں سوال کرتے تھے اور خود والد یا سرپرست سے ان کے بارے میں باتیں کرتے تھے مقصد اس انٹرویو کا یہ تھا کہ کمانڈانٹ میجر اسٹیبنگ لڑکے اور اس کے والد سے براہِ راست واقفیت حاصل کر لیں۔ ورنہ نامزدگی تو پہلے ہو چکی ہوتی کمانڈانٹ سے ملاقات کے بعد تمام لڑکوں کو چاروں

ہاؤسوں میں برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کرنل اسٹیبنگ جوان دنوں میجر تھے بڑے رُعب داب کے آدمی تھے اور حق تو یہ ہے کہ بے نظیر آدمی تھے۔

سوال:۔ کرنل اسٹیبنگ کے بارے میں کچھ بتایئے ان کا طریق کار کیا تھا؟

جواب:۔ وہ اسپارٹا کے روایتی سخت ڈسپلن کے قائل تھے۔ خود بھی سخت کوش تھے اور جفاکشی سخت کوشی کو بہت اہمیت دیتے تھے خود ان کا اپنا ڈسپلن بھی معیاری تھا۔ ہر معاملے میں پہلے وہ خود پھر کوئی دوسرا ہوتا تھا۔ کالج کی بات بات گوشہ گوشہ ان کی گرفت میں تھا مشہور تھا کہ اسٹیبنگ کی اجازت یا کم از کم ان کے علم کے بغیر کالج میں پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اور واقعی نہیں ہلتا تھا وہ کسی جگہ کسی وقت پر آموجود ہوتے تھے اس لئے سارا کالج ڈرتا تھا کہ اگر کسی کام میں سستی کی یا غلط کام کیا تو خیر نہیں۔

کرنل اسٹیبنگ ہر لڑکے اور اس کے خاندان کو جانتے تھے اور ہر لڑکے پر نظر رکھتے تھے اور اس کی صلاحیت کے مطابق اس کی تربیت کرتے تھے ان کی تربیت کے چند بنیادی اصول سخت کوشی، دیانت داری اور جرأت تھے اس معاملے میں وہ کسی رعایت کے قائل نہیں تھے وہ خود اعلیٰ درجے کے قائد تھے اور انہیں ایک ہی دھن تھی کہ لڑکوں کو اعلیٰ فوجی بنایا جائے۔ کبھی کبھی ان کی سختی ضرورت سے زیادہ بھی ہوتی تھی۔ جیسے رات کو مچھر دانی سے ہاتھ بھی باہر نکل آیا یا منہ ڈھک کر سو گئے تو سخت سزا ملتی لیکن ان کے خلوص میں بھی کلام نہیں تھا۔

سوال:۔ کچھ اسکول کے طریق کار کے بارے میں بھی بتایئے؟

جواب:۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام جے سی اوز اور حوالدار انسٹرکٹر کرتے تھے۔ چند انگریز سارجنٹ انگریزی پڑھانے پر مقرر تھے۔ اس وقت چار ہاؤس تھے۔ ہاؤسوں کا انتظام زیادہ تر پریفکیٹ ہی چلاتے تھے چونکہ تمام لڑکوں کو اسٹیبنگ خود جانتے تھے اس لئے وہ ہونہار لڑکوں کو چھانٹ کر انہیں کمیشن کے لئے خصوصی تربیت دیتے تھے عہدیداروں کو بہت

سی مراعات حاصل تھیں۔

سوال:۔مثلاً۔

جواب:۔ مثلاً یہ کہ وہ جونیئر لڑکوں کو سزا دے سکتے تھے اور جب کالج کو غالباً ۴۳-۱۹۴۲ء میں ایک بٹالین کے انداز پر منظم کیا گیا تو پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈرز (سینئر پریفیکٹس) کو کیڈٹ آفیسرز میس میں رہنے کی آسانی دی گئی مزید برآں جونیئر لڑکوں سے سیلوٹ لینے کا حق بھی دیا گیا تھا۔لیکن ان کی ذمہ داری بھی کم نہیں تھی ہر وقت سختی آتی رہتی تھی۔

سوال:۔کیوں؟

جواب:۔ کسی قصور پر جہاں قصوروار جونیئر کو سزا ملتی تھی وہاں اس کے سینئرز سے بھی بازپرس ہوتی تھی اور اکثر ان کی کھینچائی بھی ہوتی تھی۔ ہاؤسوں کے درمیان مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے۔

سوال:۔کس قسم کے؟

جواب:۔ پی ٹی ڈرل، باکسنگ اور شوٹنگ کے مقابلے عام ہوتے رہتے تھے۔ باکسنگ کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اسکول کی باکسنگ ٹیم آل انڈیا بوائز باکسنگ کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھی یہ مقابلے دہلی میں ہوتے تھے، اجمیر، جالندھر کے جی اسکولوں سے بھی اسپورٹس کے مقابلے ہوتے تھے۔

سوال:۔ شکریہ۔ آپ اب حق نواز کے کارناموں پر کچھ روشنی ڈالیے؟

جواب:۔ کالج میں داخلہ کے بعد خوش قسمتی سے مجھے حق نواز کیانی کی سیکشن ملی تھی۔

سوال:۔ کہاں اور کون سی سیکشن؟

جواب:۔ رابرٹس ہاؤس اب (شیر شاہ ہاؤس) کی پہلی سیکشن (جواب کیانی ڈارم ہے) مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حق نواز ہی کوارٹر ماسٹر سٹور سے میری کٹ اٹھوا کر اپنی سیکشن میں لائے تھے میں تو بالکل نیا تھا کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا کیانی نے اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے

تہہ کیئے اور انہیں لاکر میں منظور شدہ ترتیب کے مطابق رکھ کر دکھایا۔ اس زمانے میں وردی پہننا اور کلاہ پر پگڑی باندھنا بھی ایک مسئلہ تھا میرے لئے یہ مشکل بھی حق نواز نے آسان کی لیکن یہ تصویر کا ایک رخ تھا جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا یہ شخص تو غصے کا بھی کم تیز نہیں اور بہت تند مزاج ہے۔ حق نواز بہت ذہین تھے۔ پڑھائی میں کسی سے کم نہیں تھے لیکن ان کا اصل میدان کھیل کا میدان تھا۔ کھیلوں میں وہ بہت جان لڑاتے تھے اس لئے اکثر چھوٹی موٹی چوٹیں کھاتے رہتے تھے اس کے علاوہ ان جیسی ہمت حوصلہ کا انسان میں نے نہیں دیکھا۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ سچ بولنے سے انہیں ہچکچانا بالکل نہیں آتا تھا چاہے ایسا کرنے کی کتنی سخت سزا ملے غیرت اور خودداری انتہا درجے کی تھی۔

وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ڈرل کرتے وقت ہمارے جمعدار ایجوٹینٹ نے سب کے سامنے حق نواز کے ایک ہلکا سا بید مارا تو حق نواز نے وہ بید پکڑ کر توڑ دیا۔ مزاج کی اسی تیزی کا نتیجہ تھا کہ وہ کالج سے دو ایک دفعہ بھاگے بھی جب واپس لائے گئے اور جو سخت سزا ملی وہ بھی انہوں نے ثابت قدمی سے برداشت کی غلطی کر کے گڑگڑانا یا سزا کے خوف سے جھوٹ بولنا حق نواز کی سرشت میں نہیں تھا۔ سیکشن کمانڈر بننے کے بعد کرنل سٹیبنگ نے انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی ایک دو سال بعد ان کا کمانڈانٹ کے بنگلے پر اچھا خاصا آنا جانا ہوگیا تھا عام طور پر یہی مشہور تھا کہ حق نواز کے والد کی وفات کے بعد کرنل اسٹیبنگ نے انہیں بیٹا بنا لیا ہے۔ کالج میں جب کوئی نیا لباس شروع کیا جاتا تو حق نواز کو ماڈل بنایا جاتا تھا سب سے پہلے وہی لباس پہنتے یا ٹوپی یا جو چیز بھی ہوتی۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ کالج میں ان دنوں باکسنگ پر بڑا زور تھا حق نواز کالج کی باکسنگ ٹیم کے کیپٹن تھے۔ کالج کے ہیڈ بوائے کی حیثیت سے حق نواز نے

ایک نہیں کئی اہم پریڈوں کی قیادت کی اور انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف تک سے اپنی مہارت کی داد لی اس قسم کی رسمی پریڈیں بڑی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ایک خاص ترتیب سے خاص خاص الفاظ دہرانے ہوتے ہیں جن کو یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن حق نواز ایسے نازک موقعوں پر قطعاً نہیں گھبراتے تھے اور بڑے اعتماد سے ساری کارروائی انجام تک پہنچاتے تھے۔

۱۹۴۴ء کے اوائل میں حق نواز کمیشن کے لئے او ٹی ایس مہو چلے گئے انہوں نے آرمی اسپیشل پاس کیا تھا لیکن کمیشن کے لئے کرنل اسٹیبنگ نے ان کی خصوصی تربیت کی تھی جو رائیگاں نہیں گئی۔ حق نواز کے بعد کالج کے ہیڈ بوائے ہونے کا اعزاز میرے حصے میں آیا تھا۔

سوال:۔ حق نواز کے کالج کے بعد آپ کا ان سے کتنا واسطہ رہا؟

جواب:۔ کیانی نے ۱۹۴۵ء میں انڈین آرمی کی مشہور رجمنٹ راجپوتانہ رائفلز میں سیکنڈ بٹالین میں کمیشن لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کی بٹالین کی پوری کمپنی ۴ بلوچ (حال گیارہ بلوچ) میں منتقل ہوئی ۴ بلوچ اس زمانے میں ایبٹ آباد میں تھی اس لئے حق نواز کو لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ایبٹ آباد آنا پڑا ادھر میں انڈین ملٹری اکیڈمی سے منتقل ہو کر پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول ایبٹ آباد آیا۔ اس طرح کئی برس کے بعد ہم دونوں پھر یکجا ہوئے۔ یہ مارچ اپریل ۱۹۴۸ء کی بات ہے کچھ دنوں بعد حق نواز نے مجھے اپنے میس میں لینچ پر بھی بلایا تھا۔ ان دنوں کشمیر کی آزادی کی جدوجہد جاری تھی کشمیر کو آزاد کرانے کا حق نواز کو جنون کی حد تک شوق تھا بہر حال حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ انہیں کشمیر کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ کشمیر میں پانڈو کی چوٹی جیتنے میں حق نواز کی کارکردگی کو بھی دخل تھا۔ ایک عرصے کے بعد ۴ بلوچ کے چند جے سی او مجھے ملے وہ حق نواز کی جرأت اور قائدانہ صلاحیت کے بڑے معترف تھے۔ کشمیر آپریشن میں ان کی بہادری کے قصے اس

علاقے میں خاصے مشہور تھے۔ پی ایم اے سے کمیشن لینے کے بعد جب میں فروری ۱۹۴۹ء تا ستمبر ۱۹۴۹ء میں انفنٹری سکول کوئٹہ میں کورس کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ حق نواز اسٹاف کالج میں جونیئر ٹیکنیکل کورس کر رہے ہیں جب میں ان سے ملنے ان کے کمرے پر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کیانی نے فرش پر بستر لگایا ہوا ہے میں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ کیا چارپائی نہیں ہے بولے نہیں یہ بات نہیں کشمیر کے جہاد کے وقت سے مجھے زمین پر سونے کی عادت ہوگئی ہے۔

سوال :- ۱۹۴۹ء کے بعد پھر آپ ان سے کب ملے ؟

ج :- کوئی آٹھ نو سال کے بعد ۱۹۵۸ء میں ہم پھر کوئٹے ہی میں اسٹاف کالج کرنے کے لئے اکھٹے ہوئے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں لکھنے پڑھنے کے کام یا کورسز کے بکھیڑوں سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں تھی حق نواز کے جوہر میدان جنگ میں کھلتے تھے وہ میدان کارزار کے آدمی تھے۔ امن کے زمانے میں نوکری کرنے کے آداب وہ برتنا جانتے ہی نہیں تھے حد درجہ منہ پھٹ اور خوددار تھے۔ جو دل میں ہوتا خواہ کوئی ہو منہ پر کہہ دیتے۔ مصلحت کا لفظ تو ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ جس بات کو وہ غلط سمجھتے اس کو برملا غلط کہنے سے دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ وہ کئی بار اپنے سینئرز سے الجھے اور بری طرح الجھے۔ غالباً اسی کی پاداش میں وہ اسٹاف کالج سے سند لینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

حق نواز اور میں آخری بار ۱۹۷۰ء منگلا میں یکجا ہوئے میں بریگیڈیئر ہو گیا تھا اور وہ لیفٹیننٹ کرنل سے ریٹائر ہو رہے تھے کچھ دنوں کے بعد میں چراٹ چلا گیا پھر جو خبر ملی تو ان کے سر سے کفن باندھ کے لیپا ویلی میں شہید ہونے کی خبر ملی شہادت کی انہیں بڑی تمنا تھی خدا نے ان کی تمنا پوری کر دی برسوں کی بیقراری کو قرار آگیا حق نواز ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

چیئرمین جوائینٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل محمد اقبال خان نشان امتیاز ستارۂ بسالت کا انٹرویو

جنرل محمد اقبال (کالج نمبر ۱۱۸۷) کالج کے ان فرزندوں میں سے ہیں جن پر ملٹری کالج کو بجا طور پر فخر ہے وہ ۱۹۷۹ء سے ملٹری کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ کالج کے شہداء کی شاندار یادگار ان ہی کی توجہ سے تعمیر ہوئی ہے۔

جنرل اقبال سے ہم نے لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے تو یہ غیر رسمی گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ کالج نمبر ۸۳۵ حق نواز کیانی آپ کے ہمعصر تھے اس زمانے کے کیانی کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ میں اگست ۱۹۴۳ء میں کالج میں داخل ہوا تھا اس زمانے میں حق نواز کیانی کالج کے ہیڈ بوائے تھے۔ پانچ چھ مہینے کے بعد غالباً دسمبر ۱۹۴۳ء میں وہ کمیشن کے لئے منتخب ہو کر او ٹی ایس مہو چلے گئے۔ اس لئے صرف چند مہینے میں نے انہیں کالج میں دیکھا۔ بہرحال اس تعلق کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ حق نواز کالج کے ممتاز ترین طلبہ میں سے تھے۔ جسمانی لحاظ سے بے حد چاق چوبند اور غیر معمولی طور پر خوش لباس۔ طبیعت میں تندی اور تیزی تھی۔ ان کے اصل جوہر کھیل کے میدان میں کھلتے تھے لیکن تعلیم میں ان کو یہ امتیاز حاصل نہ تھا۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب سینئر کیڈٹ افسر تھے۔

سوال:۔ شخصیت و کردار کا نمایاں پہلو کیا تھا؟

جواب:۔ جرأت دلیری اور خود اعتمادی۔

سوال:۔ کالج کے بعد کا کوئی تاثر؟

جواب:۔ فوج میں وہ اپنی مخصوص افتاد طبع کی وجہ سے اتنے کامیاب نہیں رہے۔ لیکن اسکی

تلافی انہوں نے ۱۹۶۵ء میں اپنی غیر معمولی دلیری سے کر دی۔ کیانی امن کے نہیں جنگ کے آدمی تھے۔ میری جوان سے آخری ملاقات ہوئی اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

سوال:- اس کی کیا خصوصیت تھی؟

جواب:- لیپا کے تاریخی معرکے سے پہلے کیانی مجھ سے ملنے جی ایچ کیو آئے تھے۔ اس ملاقات میں انہوں نے جو باتیں کیں اور جس انداز سے کیں اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ اس شخص نے تو گویا شہادت کے لئے سر سے کفن باندھا ہوا ہے۔ کیانی کے ابلتے ہوئے جذبہ جہاد اور ذوق شہادت سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

نوٹ:- شہید کے سوانحی حالات اور کارنامے۔ شہید کی سوانح عمری لیپا ویلی کا ہیرو کمرنل حق نواز کیانی ـــ میں تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

راشد

جُراتوں کے نشان	سعید ارشد	۲۵۰,۰۰ رُوپے
تذکرۂ شہدا	〃	۱۵۰,۰۰ 〃
اکرم نشانِ حیدر	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
حق نواز کیانی	〃	۱۰۰,۰۰ 〃
کردار ساز	〃	۲۰۰,۰۰ 〃
مکالماتِ اقبال	〃	۲۰۰,۰۰ 〃

میجر کاظم کمال شہید (ستارۂ جرأت)

پنجاب رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ـــــــــــــــ ۲۸ مارچ ۱۹۴۴ء

جائے پیدائش ـــــــــــــــ جہلم

کمیشن ـــــــــــــــ ۱۸ پی۔ایم۔اے

تاریخ شہادت ـــــــــــــــ ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ـــــــــــــــ ۲۷ سال (غیر شادی شدہ)

مقام شہادت ـــــــــــــــ تانگیل (مشرقی پاکستان)

اعزاز ـــــــــــــــ ستارۂ جرأت

مدفن ـــــــــــــــ تانگیل ریسٹ ہاؤس

میجر کاظم کمال شہید (ستارۂ جرأت)

"جان کی امان چاہتے ہو تو یہ جھنڈا اپنے ہاتھوں سے اتار کر ہمارے حوالے کر دو۔"

"میں اور پاکستان کا جھنڈا اتار دوں؟ یہ تو کبھی نہیں ہو گا۔ کسی قیمت پر نہیں۔ بلکہ جیتے جی، میں کسی اور کو بھی اس جھنڈے کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔"

یہ جھنڈا جس کو اتارنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ تانگیل ریسٹ ہاؤس (مشرقی پاکستان) پہ لہرا رہا تھا۔ وہ لوگ جو ۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء کی اس گرم دوپہر کو انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں چیخ چیخ کر یہ مطالبہ کر رہے تھے۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باغی تھے اور وہ شیر دل پاکستانی افسر جو جان پر کھیل کر پاکستانی پرچم کی آن پر حرف نہ آنے دینے کا بڑے عزم سے اعلان کر رہا تھا۔ وہ اسی باغی کمپنی کا کمانڈر تھا اور اس کا نام میجر کاظم کمال تھا۔

میجر کاظم کمال شہید ستارۂ جرأت کی داستان حیات منزل بہ منزل پیش کی جاتی ہے۔

آباؤ اجداد

انسان جو کچھ ہوتا ہے اس میں کچھ اثر اس کے خون کا اور کچھ دخل اس کی خاندانی روایات کا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب ہو گا اگر پہلے کاظم کمال کے آباؤ اجداد کا تذکرہ کیا جائے۔

کاظم کمال کا تعلق گکھڑ پوٹھوہار کے قبیلے سے تھا۔ جو تاریخ میں اپنی جنگجوئی کے لئے مشہور رہا ہے۔ کشمیر، اٹک اور جہلم کے درمیانی علاقے میں کبھی اس کی حکومت بھی رہی ہے۔ اس قبیلے

کے دو مشہور فاتح سلطان سارنگ خان اور سلطان مقرب خان گزرے ہیں۔ سلطان سارنگ خان نے رواٹ کے مقام پر قلعہ تعمیر کیا تھا اور سلطان مقرب خان نے پھروالہ (تحصیل کہوٹہ) پر اپنا قلعہ کھڑا کیا تھا۔ گکھڑ سردار شیر شاہ سوری سے بھی ٹکراتے رہے۔ رہتاس کا قلعہ شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کو زیر کرنے کے لئے ہی بنوایا تھا۔

والدین

جہلم سے کوئی اٹھارہ میل دور مغرب کی طرف گکھڑوں کی ایک قدیم بستی ہے۔ ڈومیلی جن کا پیشہ ہی عرصہ دراز سے سپہ گری ہے۔ کاظم کمال کے خاندان کا شمار ڈومیلی کے نہایت معزز گھرانوں میں سے ہوتا ہے۔ کاظم کے والد، کرنل سر شیر محمد مرحوم نے انگریزی دور میں بڑے اعزاز پائے۔ بڑا نام پیدا کیا اپنے علاقے کی اور پنجاب کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ وہ ملٹری کالج جہلم کے محسنوں میں سے بھی تھے۔ ملٹری کالج کو جہلم میں بنائے جانے میں ان کی کوششوں کو دخل بھی تھا۔

کرنل سر شیر محمد خان ڈومیلی ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں فوج میں براہِ راست صوبیدار بھرتی ہوئے۔ جنگ عظیم میں خوب جی توڑ کے لڑے۔ اس کے صلے میں انہیں انڈین آرمی میں کمیشن کیلئے منتخب کیا گیا۔ بعد کو انہوں نے انڈین ملٹری اکیڈمی سے اعزازی تلوار کے ساتھ کمیشن لیا۔

سر شیر محمد انڈین آرمی کے ان چند ہندوستانی افسروں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے کمیشن دیا گیا۔ پہلی اور دوسری جنگ میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ایم۔ بی۔ ای اور سی آئی ای ہوئے۔ سر کا خطاب ملا۔ فوج سے مستعفی ہو کر عملی سیاست میں حصہ لیا۔ تین دفعہ مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن رہے اس کے علاوہ سروسز سیلکیشن بورڈ اور وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بھی رہے سروسز سیلکیشن بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے سر شیر محمد نے مسلم امیدواروں

کے حقوق کا تحفظ کرنے میں اہم کردار کیا ورنہ اس سے پہلے ہندو اور سکھ ممبر مسلمان امیدوار کے ساتھ تعصب کا سلوک کرتے تھے۔ ۳۲-۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی۔ پاکستان بننے کے بعد سر شیر محمد نے پاکستانی فوج کی تنظیم میں اعزازی طور پر مدد دی۔ ضلع جہلم کے سابقہ فوجیوں کی بہبود کے لئے بہت کچھ کیا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں کاظم کمال نے پرورش پائی۔

پیدائش اور بچپن

کاظم کمال ۲۸ مارچ ۱۹۳۴ء کو کرنل سر شیر محمد کی جہلم چھاؤنی کی کوٹھی الطارق میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور کانونٹ اسکول مری میں حاصل کی۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ غلیل چلاتے چلاتے ننھے کاظم کو خیال آیا۔ غلیل کیا ہے۔ پستول چلانا چاہیئے۔ یہ خیال آتے ہی دبے پاؤں والد کے کمرے میں پہنچے دوپہر کا وقت تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ ان کا پستول سرہانے بھرا رکھا تھا۔ اس کو چپکے سے اٹھایا اور باہر آ گئے۔ چھوٹا بھائی عصمت کمال حیرت سے اس نئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ بولے دیکھ تجھے تماشا دکھاتا ہوں۔ دائیں ہاتھ میں پستول لیا اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سامنے کی اور نشانہ باندھ کے پستول داغ دیا۔ انگلی کی اوپری پور اڑ گئی اور گولی سامنے کھڑے بھائی کے پیٹ سے پار ہو گئی۔ بمشکل بھائی کی جان بچی اس کے بعد کاظم کی جو مرمت ہوئی ہو گی وہ اپنی جگہ، لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کاظم کی طبیعت کا رخ کیا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں شہادت کے بعد اسی کٹی انگلی سے ان کی لاش کو پہچانا گیا۔ اور صحیح طریقے سے دفن کیا گیا۔

(جس کی تفصیل آگے آتی ہے)

مری کے پریزنٹیشن اسکول میں وہ چوتھے اسٹینڈرڈ میں تھے کہ انہیں اٹھا کر یکم اگست ۱۹۴۶ء کو ملٹری کالج جہلم میں ساتویں درجے میں داخل کیا گیا۔ داخلے کے وقت ان کی عمر بارہ سال اور چار مہینے تھی انہیں ۱۵۲۳ کالج نمبر ملا اور سب سے پہلے رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس)

کی نمبر دو ڈارمیٹری میں رہائش پذیر ہوئے۔

ملٹری کالج جہلم کی تعلیم کا دور

ملٹری کالج میں کاظم یکم اگست ۱۹۴۶ء کو داخل ہوئے ساتویں درجے میں۔ اس سے پہلے وہ مری کانونٹ اسکول میں چوتھے اسٹینڈرڈ میں پڑھتے تھے اور جیسا کہ اسکول چھوڑتے وقت کانونٹ اسکول کی مدرسپریئر نے ان کی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ فورتھ اسٹینڈرڈ میں کمزور ہیں۔ مزید ایک سال اسی کلاس میں لگانا چاہیئے جو انہوں نے نہیں لگایا۔ چنانچہ بنیادی کمزوری باقی رہی اور وہ اس کلاس میں دوبارہ ناکام ہوئے سوائے انگریزی کے دوسرے مضامین میں ان کے نمبر بہت کم تھے۔ چیف انسٹرکٹر نے بھی یہی رائے ظاہر کی کہ کاظم کو ایک کلاس پیچھے داخل ہونا چاہیئے۔ اس تعلیمی کمزوری کے باوجود کاظم نے کھیلوں اور باکسنگ میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا مئی ۱۹۴۸ء کی رپورٹ میں لکھا گیا کہ کاظم ایک پُرعزم باکسر ہے اور اس کا مستقبل پُرامید ہے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں وہ آٹھویں درجے میں تھے۔ لیکن تعلیمی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے فرسٹ کلاس انگلش کا امتحان پاس کر لیا تھا آٹھویں میں وہ پھر ناکام رہے اور ۱۹۵۰ء میں لانس کارپورل مقرر ہوئے اور پاکستان آرمی فرسٹ کلاس کا امتحان پاس کر لیا اور تعلیمی اعتبار سے بھی کچھ ترقی ہوئی۔ کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض حسین زیدی نے لکھا تعلیم میں تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے کچھ احساس ذمہ داری بھی پیدا ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ نویں اے میں تھے اور کارپورل ہو گئے تھے۔ فٹ بال اور کرکٹ میں نام پیدا کیا۔ اس سال کی رپورٹ میں ان کی قوت تقریر اور دلکش شخصیت اور کھیلوں میں امتیاز کی تعریف کی گئی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں وہ دسویں بی میں تھے اور کیڈٹ سارجنٹ کے عہدے پر ترقی مل گئی تھی۔ فرسٹ کلاس سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس سال وہ رابرٹس ہاؤس میں منتقل ہو گئے تھے اس سال کی رپورٹ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ ذہین لیکن محنتی نہیں۔ مہذب اور شائستہ ایک اچھا افسر بننے

کی تمام صلاحیتیں اس میں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاظم کو اپنے مزاج پر قابو نہ تھا اس سال اگست میں اور اس کے بعد کئی بار سنز ابلی۔ لیکن کھیلوں میں اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں کاظم کمال نے اپنا کمال جاری رکھا۔ کرکٹ کا میدان ہو یا کالج کے کلچرل اینڈ فائن آرٹس کا اسٹیج ان سب میں وہ امتیازی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ۵۳ء میں انہوں نے بی اے اسپیشل کا امتحان دیا لیکن بدقسمتی سے اردو میں رہ گئے۔ اس طرح ۳۰ جنوری ۵۴ء کو انہوں نے کالج کو خیر باد کہا۔ چونکہ بی۔ اے اسپیشل نہ کر سکے تھے۔ اس لئے فرسٹ پنجاب میں ریکروٹ بھرتی ہو گئے۔

کالج میں تعلیمی لحاظ سے کاظم کمال کامیاب نہیں رہے ان کی تعلیمی کمزوری بنیادی تھی جس کو پورا کرنے کی انہوں نے سنجیدگی سے کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے لکھنے پڑھنے کے مقابلے میں انہیں قیادت کے دوسرے مشاغل سے زیادہ دلچسپی تھی اور ان شعبوں میں وہ زیادہ کامیاب ہوتے اسی طرح وہ رولز اور ریگولیشنز کے بارے میں بھی کبھی کبھی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے تھے اور پھر نتائج کی پرواہ نہیں کرتے تھے لیکن آگے چل کر انہوں نے جس ذمہ داری لگن اور جان بازی کا مظاہرہ کیا اس سے ایک واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے کی تعلیمی کارکردگی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ جتنی انسان کی بنیادی شخصیت۔ اگر شخصیت میں دلیری، جرأت عزم اور حوصلہ اور بلند قدروں سے محبت ہے تو یہی سب کچھ ہے جو بندھ جاتے وہ موتی۔

کاظم کمال اپنے دوستوں کی نظر میں

کاظم کمال کی کالج کی زندگی کے بارے میں اب تک جو ہم نے لکھا ہے وہ ان کے ذاتی فائل سے اخذ کیا ہے اس جائزے سے کاظم کمال کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اصل کاظم کمال نہیں کسی آدمی کو بھی صرف اس کے امتحان کے نمبروں سے نہیں جانچا جا سکتا۔ اصل آدمی تو امتحان کے کمرے سے باہر ہوتا ہے خوش قسمتی سے ہمیں کاظم کمال کے چند بہت ہی قریبی دوستوں سے

رابطہ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ بعض سے زبانی گفتگو ہوئی۔ بعض نے اپنے تاثرات کو قلم بند کر کے بھیج دیا۔

بریگیڈیر محمد عثمان خان لکھتے ہیں :۔

کاظم کا کالج نمبر ۱۵۲۳ ہے اور میرا ۱۵۶۴ ہے ہم دونوں ایک ہی دن یکم اگست ۱۹۴۶ء کو کالج میں داخل ہوئے اور رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کی ایک ہی ڈرامیٹری میں تقریباً ایک سال ساتھ رہے۔ کاظم کو انگریزی بولنے میں بڑی مہارت تھی اس ایک بات میں وہ ہم سب سے بہتر تھے۔ کافی اسمارٹ تھے۔ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ ذہین تھے لیکن پڑھنے کی طرف توجہ نہیں تھی۔ کھیل تماشے کا شوق تھا۔ ہنسنا ہنسانا پسند تھا۔ اس زمانے میں کچھ عرصہ رابرٹس ہاؤس میں، میں نے اپنی سیکشن کی نماز میں امامت بھی کی ہے۔ نمبر دو ڈارم کے پیچھے ہم لوگوں نے نماز پڑھنے کے لئے ایک جگہ بنا رکھی تھی۔ آم کے درخت کے نیچے مجھے یاد ہے کہ کاظم پابندی سے ان دنوں میرے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ واقعہ ۴۶۔ ۱۹۴۷ء کا ہے۔ کاظم کمال کے ایک برسوں کے ساتھی کرنل محمد افضل کالج نمبر ۱۵۴۲ سے جب ان کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا۔

ہم دونوں رابرٹس ہاؤس خاصے عرصہ یکجا رہے اس لئے کاظم کی یادیں میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اسٹڈیز میں کاظم کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کلاس بھی گول کرتے رہتے تھے۔ حساب میں بے حد کمزور تھے اس پر اچھی خاصی کھنچائی میں ہوتی رہتی تھی۔

البتہ کلاس سے باہر میرا یار شیر تھا۔ تقریباً ہر معاملے میں۔ فٹ بال کا زبردست کھلاڑی تھا۔ باکسنگ میں بھی باکمال تھا۔ ڈراموں کا بھی شوق تھا۔ حیدری صاحب نے جو انگریزی ڈرامہ کرایا تھا۔

اس میں ۱۴۸۰ میجر محمد رفیق کے ساتھ کاظم کا پارٹ تھا۔

میں کہوں گا کہ کاظم یاروں کا یار تھا بڑا مخلص۔ دوستوں کو خوب کھلاتا پلاتا تھا۔ گھر میں مٹھائی وٹھائی اکثر آتی رہتی تھی کبھی اکیلے نہیں کھاتا تھا۔

شرارت میں بھی طاق تھا سب کو تنگ کرتا رہتا۔ کاظم کی ایک انگلی ٹیڑھی تھی ایک روز میں نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ کہنے لگا کہ یہ بھی شرارت کا نتیجہ ہے۔ ایک روز میں نے پستول سے اپنی انگلی کو نشانہ بنایا تھا۔ گانے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اس کے ساتھ "برسات" فلم دیکھنے لاہور گئے تھے۔

کاظم کی دو خوبیاں بے مثال تھیں ایک تو وسیع القلبی۔ دوست داری اور دوسرے جرأت غلط سے غلط کام ہو جائے اس سے انکار نہیں کرتا تھا۔ ایک آدھ بار اسے اس جرأت کی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ لیکن جھوٹ بول کر اس نے جان نہیں چھڑائی۔ کاظم ۱۹۵۶ء میں ۱۸ پی۔ ایم۔ اے گئے تھے پہلے قاسم کمپنی میں تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پنجاب رجمنٹ میں کمیشن ملا۔

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین (کالج نمبر ۱۶۲۳) رقم طراز ہیں۔

جب میجر کاظم کمال شہید پر کچھ لکھنے کے لئے مجھ سے کہا گیا تو میری یادوں میں برڈ وڈ ہاؤس (موجودہ محمود غزنوی ہاؤس) کے بہت سے منظر گزرے جہاں ہم اکٹھے نمبر ۴ سیکشن میں رہا کرتے تھے کچھ سنیچر کی شامیں جب ہر سیکشن یا پلاٹون اپنا تیار کردہ ڈرامہ وغیرہ پیش کرتی تھی اور ہم میں کاظم کمال کا کردار اہم ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ منظر بھی گزرے جن میں کاظم کمال کی واحد شخصیت برآمدوں میں تیز رفتاری سے اسکیٹنگ کرتی نظر آتی تھی پھر کبھی چھٹی کے دن سائیکل پر عجیب و غریب کرتب کرتے ہوئے ہنستا کھیلتا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا اپر جہلم کنال پر جا کر تیرنے کے کئی منظر بھی یاد آئے۔

مختصر یہ کہ جس پہلو سے بھی اپنے اس پرانے ساتھی کی یاد آئی وہ پر وقار جرأت مند اور ولولہ انگیز ہی دکھائی دی۔ اس کی یہ فطری بہادری آخر دم تک اس کے ساتھ رہی اور اسے ستارۂ جرأت کا مستحق قرار دے گی۔ اللہ تعالیٰ اس جیسے جرأت مند بہادروں سے پاکستان کی زمین کو بھر دے تاکہ دنیا پھر دیکھے کہ مسلمانوں کی بہادری قومی خون کے بجائے دین کی روح سے ابھرتی ہے۔

میجر جنرل محمد اقبال (کالج نمبر ۱۳۳۳) لکھتے ہیں:۔

یہ بات ۱۹۴۸ء کی ہے جب میں اور کاظم کمال رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کی تیسری ڈارمیٹری میں رہتے تھے کہ مجھے ملیریا نے آن لیا۔ بڑا شدید حملہ تھا۔ یوں کوئی ایک مہینہ میں کالج ہسپتال میں رہا جب ہسپتال سے فارغ ہو کر ہاؤس میں آیا تو بھی بہت کمزور تھا۔ روزانہ کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کی سکت نہیں تھی اس موقعے پر کاظم میرے آڑے آئے۔ میرے کہے بغیر میرے حصے کے بہت سے کام کر ڈالتے تھے۔ ڈارم کی صفائی بستر اور لاکر ٹھیک کرنا وغیرہ۔ قریب دو ہفتے تک کاظم میری خدمت کرتے رہے اور اپنے مخصوص انداز میں ہنستے کھیلتے۔ لائٹ موڈ میں اور اس طرح انہوں نے مجھے اپنی بیماری اور کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ گو وہ قدرے لاپرواہ سے تھے۔ بظاہر غیر سنجیدہ نظر آتے لیکن غیر ذمہ دار ہرگز نہیں تھے۔ اس لحاظ سے کاظم کمال کی شخصیت بڑی دلاویز اور قابل قدر تھی۔ خدا مخلص اور بے ریا کاظم کمال کے درجات بلند کرے ممتاز خوبیوں کا انسان تھا وہ۔

بریگیڈیئر سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار (کالج نمبر ۱۷۳۸) نے ایک ملاقات میں کہا۔

کاظم کمال ہم سے سینئر تھے مضبوط جسم، بلند قد اچھے تیراک اور کھلاڑی۔ ایک اور بات جو یاد آئی کہ وہ بہترین گھڑی باندھتے تھے اور رولر اسکیٹنگ کے بہت شوقین تھے کالج میں شاید ہی کوئی اور لڑکا اس ٹھاٹھ باٹھ کا ہو۔

بریگیڈیئر محمد یونس نے کاظم کمال کے بارے میں ان خیالات و تاثرات کا اظہار کیا۔ کاظم کمال کا نمبر ۱۵۲۳ تھا اور میرا ۱۹۴۹ ہے اس لحاظ سے میں کالج میں ان سے بہت جونیئر تھا۔ لیکن مختلف وجوہ سے وہ کمیشن کے لئے پی۔ ایم۔ اے بہت دیر سے گئے۔ اس لئے پی ایم اے میں وہ مجھ سے بہت جونیئر تھے۔ یوں میں نے انہیں پہلی بار ایک جونیئر اور دوسری بار ایک سینئر کی آنکھوں سے دیکھا۔ دونوں حیثیتوں میں، میں نے انہیں دلیر اور بیباک پایا۔ پرجوش پرعزم اور ایک حد تک خودسر۔ جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اسے کر کے رہتے تھے۔ یہی وہ صفات تھیں جنہوں نے انہیں شہادت کے مرتبے تک پہنچایا۔

اب تک ہم نے کاظم کمال شہید کے بارے میں ان کے ہم عصروں، ساتھیوں اور دوستوں کے تاثرات نقل کئے ہیں۔ اب ہم ان کے ایک نامور کمانڈانٹ کے خیالات درج کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے تھوڑے سے تعارف کی ضرورت ہے۔

کوئی تعلیمی ادارہ عمارتوں میدانوں کا نام نہیں ہوتا اور نہ اس کی کارکردگی کا حقیقی معیار ہیچوں اور بورڈ کے امتحانوں کے رزلٹ ہوتے ہیں۔ ادارہ اپنے طلبا سے، ان کے مرتبے سے۔ ان کے کردار سے، ان کے ذہن سے، ان کی قدروں اور رویّوں سے، اور بالآخر زندگی میں ان کی کارکردگی اور خاص طور سے میدان جنگ میں ان کی کارگزاری سے تولا اور پہچانا جاتا ہے اس اعتبار سے ملٹری کالج کا ریکارڈ امن اور جنگ میں بہت ہی قابل قدر اور قابل فخر رہا ہے اس کو قابل قدر اور قابل فخر بنانے میں کالج کے دو کمانڈانٹس کا خصوصیت سے بڑا ہاتھ رہا ہے پاکستان بننے سے پہلے کے۔ کرنل ٹی۔ ایچ۔ ایل سٹیبنگ اور پاکستان بننے کے بعد کے زمانے میں، کرنل (اب بریگیڈیر ریٹائرڈ) محمد رفیق ان کو کالج کا معمار اعظم کہا جا سکتا ہے۔ گزرے دور میں ملٹری کالج کو ملٹری کالج بنانے میں خاص طور سے ان ہی دو کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ استاد وہ ہوتا ہے جو طالبعلم کی زندگی بدل دے اس کی شخصیت کے بہترین امکانات کو بروئے کار لائے۔ یہ کام ان حضرات نے کیا اس لئے ان کا نام کالج کے فرزندوں کے کارناموں کے ساتھ ہمیشہ یاد کیا جائیگا۔

کرنل اسٹیبنگ تو اب اس دنیا میں موجود نہیں کہ ہم ان سے ان کے پرانے شاگردوں کی شخصیت پر تبصرہ کرنے کو کہتے۔ خوش قسمتی سے ہم بریگیڈیر محمد رفیق سے یہ درخواست کر سکتے ہیں چنانچہ ہم نے انہیں زحمت دی کہ وہ اپنے دور کے شہید طلبا پر اظہار رائے کریں۔ بریگیڈیر محمد رفیق سابق کمانڈانٹ ملٹری کالج جہلم کے تاثرات تبرک کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

میجر کاظم کے بارے میں رفیق صاحب لکھتے ہیں:۔

۱۹۵۱-۵۲ء میں پہلی مرتبہ کالج کی کمانڈ میرے سپرد ہوئی تھی۔ اس زمانے میں کاظم کمال کو میں نے جیسا دیکھا اور پایا اس مشاہدے کی اور تجربے کی بنا پر میرا تاثر یہ ہے کہ کاظم میں لیڈرشپ

کی صلاحیت فطری طور پر موجود تھی وہ کھیلوں میں دلچسپی اور خوش اطواری کی وجہ سے لڑکوں میں خاصا مقبول تھا۔ شخصیت پُر اثر تھی۔ کالج کے اسٹیج پر ایکٹنگ کا اسے شوق تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ گاتا بھی تھا اور اسے ساز (ماؤتھ آرگن) کو بجانا بھی آتا تھا۔ لیکن ذہین ہونے کے باوجود پڑھنے میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امتحان میں بار بار فیل ہوتا تھا۔ بدقسمتی سے جب اس نے اپنی ذہانت اور قیادت کی قوتوں کو غلط سمت میں استعمال کیا اور سمجھانے بجھانے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ایک بار مجھے اپنی زندگی کی سخت ترین سزا اسے دینی پڑی اس واقعہ کے برسوں بعد اور مارچ ۱۷ء میں اپنی شہادت سے کچھ دن پہلے میجر کاظم ڈھاکہ کلب میں مجھ سے ملا۔ کالج کی باتوں کو یاد کرتا رہا کاظم نے کہا "سر، مارچ ۵۲ء میں جو سخت سزا آپ نے مجھے دی تھی اس کے بعد میں نے بہت سوچا اور اپنے آپ کو بالکل بدل دیا۔ اپنے تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خلوص سے دی ہوئی سخت سے سخت سزائیں بھی اثر ہوتا ہے" اس کے بعد کاظم نے فراخدلی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ یہ ڈھاکہ میں اور زندگی میں ہماری آخری ملاقات تھی۔ کاظم میں اخلاقی جرأت بھی کم نہیں تھی۔

ملٹری کالج سے پی۔ ایم۔ اے تک

کالج سے کاظم بی اے اسپیشل پورا پاس نہیں کر سکے اردو میں رہ گئے تھے اس لئے انہیں بطور سپاہی پنجاب رجمنٹ سنٹر میں بھرتی ہونا پڑا۔ چونکہ پنجاب رجمنٹ کی یہ بٹالین مشرقی پاکستان میں تھی۔ اس لئے انہیں مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ گھر میں والدہ نے اور سب عزیزوں نے کہا سپاہی بھرتی نہ ہو۔ کوشش کریں گے کہ ریلیز ہو جاؤ" کاظم نے کہا "نہیں بھرتی میں ضرور ہوں گا۔ کوشش ضرور کروں گا اور تقدیر ہے تو کمیشن ضرور لوں گا۔ اب تک میں پڑھنے میں کبھی سیریس نہیں ہوا۔ اب یہ معاملہ میرے لئے چیلنج بن گیا ہے اب میں پیچھے نہیں رہوں گا۔

کمیشن کے قریب

دور کے ڈھول تو سہانے بھی ہوتے ہیں۔ قریب سے جو آواز آئے اور دل کو لگے تب کی بات ہے کمیشن کے بعد کاظم کمال کے طور واطوار کیسے تھے اس کے متعلق کوئی ایسا ہی آدمی بتا سکتا تھا جو ان کی جلوت وخلوت کا ساتھی رہا ہو۔ ایس۔ ایس جی کے مشہور کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود ایس۔ جے (دوبار) کاظم کے ایسے ہی ساتھی اور دوست ہیں۔ کرنل طارق محمود صاحب نے ہماری درخواست پر کاظم کمال کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"آج میں ایک ایسے انسان کے متعلق لکھ رہا ہوں جو کہ نہ صرف ایک عظیم سپاہی بلکہ ایک نیک دل دوست عزیز بھائی اور ناقابل فراموش ہستی تھا"

کاظم کمال سے میری دوستی ۱۹۶۱ء سے آغاز ہوئی میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں کاظم جیسے انسان کے متعلق کہہ سکوں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کاظم کمال اور میں کشمیر کے بلند پہاڑیوں پر تعینات تھے۔ ہم دونوں سپیشل سروس گروپ کمانڈوز میں کیپٹن تھے۔ میں کاظم سے کافی جونیئر تھا لیکن دوستی بہت زیادہ تھی۔ کشمیر کا دشوار گزار علاقہ جہاں پر ان دنوں بہت کم آبادی تھی۔ پاکستان کے مشکل ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ طاقتور انسان بھی ہمت ہار دیتا ہے لیکن کاظم کو میں نے ہمیشہ خوش دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی وہ تھک جاتا تھا تو کہتا تھا کہ فکر نہیں تمام مشکل وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر آرام کا وقت بھی آتا ہے۔ کاظم اللہ تعالیٰ اور قسمت پر بہت ایمان رکھتا تھا ایک دفعہ کاظم اور میں دشمن کے علاقے کے نزدیک سڑک پر چل رہے تھے کہ دشمن کے توپ خانے نے فائر شروع کر دیا یہ فائر دشمن کا معمول کا فائر تھا اور عام طور پر ایسے موقعہ پر جوان آڑ کا استعمال کرتے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے کاظم نے دشمن کے توپ خانہ کے فائر کی آواز نہیں سنی ہم اسی طرح چلتے رہے اور فائر بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاظم سے پوچھا کہ کیا وجہ تھی کہ آپ نے فائر کا ذکر بھی نہیں کیا۔ کاظم کے الفاظ

مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ کہنے لگا "یار، ٹی۔ ایم" (مجھے ٹی ایم کہتے ہیں) فائر تو ہمارا مقدر بنا ہوا ہے۔ اگر روزانہ اڑ لیتے رہیں تو گھٹنے جواب دے جائیں گے۔"

کاظم بہت نیک دل اور سادہ انسان تھا۔ ایک مرتبہ ہم ۱۹۶۵ء میں ایک بہت مشکل مارچ کے بعد واپس اپنے کیمپ میں آ رہے تھے کاظم کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ مگر اس نے مجھے نہ بتلایا۔ بلکہ پیدل چلتا رہا۔ ہم نے مشکل راستہ طے کر لیا تھا اور اب ہمارا کیمپ بالکل نزدیک تھا۔ شام ہونے کو تھی اور ہم دونوں بہت خوش تھے کہ کیمپ میں دونوں کھانا کھائیں گے اور آرام کریں گے۔ اچانک کاظم رک گیا اور کہنے لگا "ٹی۔ ایم تم کیمپ میں جاؤ میں یہاں آرام کروں گا۔" میں نے کاظم کو سمجھایا کہ کاظم اب تو فاصلہ ختم ہو چکا ہے چند منٹ کا مارچ باقی ہے اور میں تم کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن کاظم میں دوسرے کی تکلیف کا اتنا خیال تھا کہ وہ بضد تھا کہ میں جا کر آرام کروں اور وہ بعد میں کیمپ میں آ جائے میں نے بھی ضد کی اور کہا کہ اکٹھے جائیں گے اس پر کاظم نے سامان اٹھایا اور چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم دونوں کشمیر کے جہاد میں شامل تھے۔ کاظم مجھ سے دور دشمن کے خلاف سینہ سپر تھا۔ اس کے جوان اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ میں دشمن کے علاقہ میں کمانڈوز کی ایک ٹولی کا لیڈر تھا۔ کبھی کبھی کاظم کی خبر مل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ کاظم رات کو دشمن کے کیمپ میں گھس گیا اور دشمن کا بہت نقصان کیا۔

۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بعد مجھے ستارہ جرأت ملا تو کاظم پہلا افسر تھا جو مجھے ملنے کیمپ پہنچا اور مبارک باد دی۔

میں ۱۹۶۸ء میں پیراشوٹ سکول کا کمانڈانٹ مقرر ہوا کاظم پشاور میں میرے پاس اکثر ٹھہرتا تھا۔ ان زمانے میں یہ مشہور تھا کہ میں پیراشوٹ میں سختی سے قواعد کی نگرانی کرتا ہوں اور کسی سینئر یا جونیئر کا خیال نہیں رکھتا۔ جو آدمی معیار پر نہیں اترتا اسے پیراشوٹ جمپ نہیں کرنے دیتا میری یہ شہرت عام تھی کاظم کمال بھی پیراشوٹ کی چھلانگ لگانے کے لئے پشاور آیا۔ کاظم

بہت مضبوط افسر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ چھٹی پہ رہنے کی وجہ سے اس کو شک تھا کہ شاید وہ پیراشوٹ کے معیار کے مطابق ٹیسٹ نہ دے سکے میں بھی شش و پنج میں تھا کہ اگر کاظم فیل ہو گیا تو کس طرح اس کو کورس سے واپس بھیجوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ ٹیسٹ سے پہلے میں نے اپنے ٹریننگ جی۔سی۔ او صوبیدار میجر شریف کو بلایا اور کہا کہ صاحب میں مشکل میں ہوں اور پیراشوٹ ٹسٹ ہونے والا ہے۔ اگر کاظم فیل ہو گیا تو میں کس طرح اس کو بتاؤں گا کہ تم کو میں نے فیل کر دیا ہے۔ کاظم میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا اور صبح ٹسٹ کیلئے جانا تھا میں نے کاظم کو ایک شام پہلے ٹسٹ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا تھا اور میرے خیال میں اس کا معیار اچھا تھا اور وہ کامیاب ہونے کی اہلیت رکھتا تھا۔

ناشتے کے بعد میں نے کاظم کو کہا کہ چلو سکول چلتے ہیں کاظم نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ ٹی۔ ایم تم جاؤ میں واپس چراٹ جا رہا ہوں۔ میں حیران ہو گیا اور کہا کہ کاظم آج تو ٹسٹ ہے اور آپ نے چھلانگ لگانی ہے (کاظم نے اس سے پہلے بہت مرتبہ چھلانگ لگائی تھی۔ بلکہ اس نے سمندر میں بھی چھلانگ لگائی تھی) کاظم نے کہا "ٹی۔ ایم میرا موڈ نہیں ہے۔ اور میں پھر آؤں گا میں نے اصرار کیا کہ آپ نے اتنی محنت کی ہے اور اب اس کو رائیگاں نہ کرو۔ کاظم کے الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں " ٹی۔ ایم تم میرے دوست ہو اور چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ جب میں تمہارے انصاف کے قصے پیراشوٹ سکول میں سنتا ہوں تو مجھے تم پہ فخر ہوتا ہے مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ دوستی کی وجہ سے شاید کچھ لحاظ کرو۔ میں تمہیں ایسی پوزیشن میں نہیں ڈالنا چاہتا میں اس وقت ٹسٹ دوں گا۔ جب مکمل فٹ ہوں گا " یہ کہہ کر کاظم نے سامان بند کیا اور واپس چلا گیا۔ یہ بھی ایک لاجواب مثال جو کہ ایک عظیم انسان کی زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

آنے والے واقعات کے سیاہ سائے

ستمبر ۱۹۷۰ء میں کاظم کمال کوئٹہ میں ایک کورس کر رہے تھے۔ کورس کے

اختتام پر ان کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوگئی ڈھاکہ جانے سے پہلے وہ دو مہینے کی اختیاری چھٹی لے کر گھر آگئے۔ اب کے جو وہ گھر آتے تو وہ، وہ کاظم کمال نہیں تھے جو پہلے ہوا کرتے تھے۔

اس دوران کاظم کمال کے پرانے ساتھی اور دوست کرنل۔ ٹی۔ ایم ان سے ملے وہ لکھتے ہیں:۔

مشرقی پاکستان جانے سے پہلے کاظم مجھے آخری مرتبہ جہلم میں اپنے آبائی گھر ملا۔ میں نے پہلی مرتبہ کاظم کو اداس دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ وہ غمگین تھا۔ کاظم مشرقی پاکستان سے محبت کرتا تھا اور اس کو "سنار دیش" کہتا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ مشرقی پاکستان جانے سے کیوں پریشان ہے۔ شاید اس کو اپنا مقدر معلوم تھا۔ کاظم کہنے لگا کہ "ٹی۔ ایم میں مشرقی پاکستان جا تو رہا ہوں مگر نہ جانے کیوں میرا دل پریشان ہے"

ان دنوں کاظم کمال کی جو کیفیت تھی اس کو گھر والوں نے اور شدت سے محسوس کیا تھا۔ کاظم کے بھائی عظمت کمال خان نے ہمیں انٹرویو میں بتایا:۔

کاظم بھائی بڑے زندہ دل ہوا کرتے تھے۔ ساری رات جہلم کلب میں برج کھیلتے گزار دیتے۔ سنجیدہ رہنا تو ان کو آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن نومبر دسمبر ۷۰ کی آخری چھٹی کے دوران وہ بالکل بدل گئے تھے گم سم رہتے تھے۔ زندہ دلی نے سنجیدگی کا روپ دھار لیا تھا۔ کلب لائف یک لخت ختم کر دی تھی پہلے وہ دوستوں کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے۔ اب ان سے رسم و راہ ترک کر دی تھی۔ اپنے کمرے کے بجائے ڈرائینگ روم میں سارا وقت گزارتے۔ رات کو پلنگ کے بجائے وہیں ڈرائینگ روم کے فرش پر سو رہتے ایک آدھ بار گھر والوں نے پوچھا تو کہا:۔

"آخر میں لیٹنا تو زمین ہی پر ہے"

کاظم کمال کی یہ باتیں اس وقت ہمارے لئے ناقابل فہم تھیں ہم سمجھتے تھے کہ موڈی آدمی ہے کچھ دنوں میں افسردگی کی یہ لہر اتر جائے گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا وہ اندر سے ایک بار پھر بدل رہے تھے۔ پہلی بار ان میں اس وقت تبدیلی آئی تھی جب ۱۹۵۴ء

میں وہ فرسٹ پنجاب میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے اور پی اے اسپیشل پاس کر کے کمیشن لینا چاہتے تھے۔ دوسری نفسیاتی تبدیلی نومبر دسمبر ۷۰ء میں رونما ہو رہی تھی ان کے ذہن کا رخ کیا تھا اس کا کچھ اندازہ مجھے اس دن ہوا جب میں رات گئے ڈرائینگ روم میں کسی کام سے گیا۔ کاظم بھائی حسبِ معمول صوفے کا سہارا لئے فرش پر نیم دراز تھے اور اسلامی تاریخ پر ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ کاظم اور اسلامی تاریخ؟ میں چونکا اس سے پہلے تو وہ پڑھتے ہی بہت کم تھے اور اگر کبھی کچھ پڑھتے تھے تو مار دھاڑ سے بھرپور امریکی ناول پڑھتے تھے۔ اب ایک اسلامی تاریخ کتاب کے مطالعے میں محو تھے مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا "بھائی جان یہ اسلامی تاریخ سے آپ کو کب سے دلچسپی ہو گئی؟" وہ مسکرائے لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے لیکن میں ان کی مسکراہٹ کا مطلب اس وقت نہیں ان کی شہادت کے بعد سمجھا۔ اس زمانے میں ان کا پیار بچوں سے بہت بڑھ گیا تھا۔ چھوٹے بچوں سے کھیلتے رہتے خصوصاً میرے بیٹے سے بہت مانوس تھے۔

سوئے مقتل پہلا قدم

ڈھاکہ میں کاظم کمال کا ہوائی جہاز سے اترنا گویا مقتل کی طرف پہلا قدم تھا۔ شروع ۷۱ء سے اواخر مارچ ۷۱ء تک کاظم کمال پر کیا بیتی؟ اس کا کھوج لگانا آسان کام نہ تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل رب نواز کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کاظم کمال کی شہادت سے پہلے کے اہم واقعات سے واقف ہیں۔ اس لئے ہم نے کرنل رب نواز سے کہا کہ وہ کاظم کمال کی زندگی کے آخری چند مہینوں کے حالات پر روشنی ڈالیں۔ خاص طور پر ان کی شہادت کی تفصیلات بتائیں۔ کرنل رب نواز نے جواب دیا۔

اس سلسلے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۱۴ ڈویژن کے ہیڈکوارٹر ڈھاکہ میں تعینات تھا۔ دسمبر ۷۰ء میں مجھے خبر ملی کہ کاظم ڈھاکہ آرہے ہے۔ چنانچہ میں اور افتخار کیانی

(لیفٹیننٹ کرنل افتخار کیانی سی او ۱۵ پنجاب) کاظم کو لینے ائرپورٹ پر گئے۔ کاظم سے ملٹری کالج میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی کالج میں داخل ہوئے تھے۔ کاظم کا نمبر ۱۵۲۳ ہے اور میرا ۱۵۱۹۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کاظم سے پوچھا یہ کون سا وقت ہے ڈھاکہ آنے کا۔ ادھر ہی کیوں نہ رہ گئے کاظم نے کہا "چاہتا تو شاید رہ سکتا تھا کچھ ذرائع تھے کچھ امکانات بھی تھے۔ لیکن میں فوج کے سیدھے راستے کا قائل ہوں۔ جو قسمت میں ہو گا ہو کے رہے گا۔ پھر میرا بلیف ہے کہ بیل کو جب تک سینگوں سے نہ پکڑو تو قابو نہیں آتا۔ میری کمانڈو کی ٹریننگ بھی یہی ہے۔"

کاظم کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوئی تھی۔ ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ سے ۴۵ میل دور جولے پور میں تھا اور کاظم کی کمپنی تانگیل میں متعین تھی جو ڈھاکہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔" اس زمانے میں ایسٹ پاکستان میں حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مارچ ۷۱ء کے اوائل میں ای بی آر میں خاص طور سے سرکشی کی خبریں آنے لگیں اور مغربی پاکستان کے افسروں کے خلاف خاص طور پر سازشیں ہونے لگیں۔ کاظم کی کمپنی کا ایک بنگالی این۔ سی او۔ سپاہیوں کے ساتھ خاص طور پر بری طرح پیش آرہا تھا (غالباً جان بوجھ کر ان کو بھڑکانے کے لئے) ایک روز کاظم نے اس بنگالی حوالدار کو بلاکر سمجھایا کہ اتنی سختی ٹھیک نہیں۔ خاص طور پر جوانوں کو گالی نہیں دینا چاہیئے۔ وہ حوالدار تو باغیوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے باہر جاکر سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور کہا مجھے تو حکم ملا ہے کہ تمہیں ذلیل کروں۔ تم ہو ہی اس قابل۔ اتفاق سے ایک سپاہی اس وقت کہیں پاس کھڑا تھا۔ جب کاظم حوالدار کو سمجھا رہے تھے کہ گالی نہیں دینا۔ اس نے کہا بھی کہ یہ غلط ہے صاحب تو کہتا ہے گالی نہ دو۔ یہ سن کر کچھ جوان اس پر پل پڑے چونکہ کاظم بھی اپنی کمپنی میں مقبول تھے کچھ ان کی حمایت میں بولنے لگے۔ مختصر یہ کہ وہاں خاصا جھگڑا شروع ہو گیا۔ مار دھاڑ بھی ہوئی۔ جب کاظم کو اطلاع ہوئی تو یہ وہاں پہنچے تو بیچ بچاؤ کرایا۔ لیکن وہاں اتنا کنفیوژن تھا کہ بچاتے ہوئے کاظم بھی زخمی ہو گئے۔ ان کے سر کے پیچھے

زخم آیا۔ اس زخم کی پٹی کرانے جیپ میں کاظم ڈھاکہ سی۔ ایم۔ ایچ آئے۔ مجھے خبر ملی تو میں بھاگا بھاگا سی ایم ایچ گیا ملاقات ہوئی۔ حادثے کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو میں نے کہا حالات کا رخ بدل رہا ہے یہ تو بغاوت کے آثار ہیں۔ تم فوراً تنگیل واپس نہ جاؤ۔ چونکہ پٹی ہو چکی تھی اور زخم ایسا نہ تھا کہ ہسپتال میں داخل کیا جاتا۔ کاظم جیپ میں بیٹھے اور روانہ ہونے لگے تو میں نے کہا اچھا میس تک تو چلو۔ میں کاظم کو میس لایا چائے وائے پی۔ پھر میں نے کہا تم ذرا میرے کمرے میں آرام کرو میں دفتر ہو آؤں۔ میں نے باہر نکل کر کمرے کو تالا لگا دیا اور چابی میس حوالدار کو دے دی مجھے یقین تھا کہ کاظم کا تنگیل جانا خطرے سے خالی نہیں۔ ای بی آر کے بنگالی افسروں کے بارے میں ہمارے پاس جو رپورٹیں آ رہی تھیں وہ خراب تھیں بہر حال میں لاک کر کے دفتر آ گیا۔ جب دوپہر واپس پہنچا تو کاظم اپنی کمانڈو ٹرک کر کے جیپ لے کر جا چکے تھے۔

کاظم کمال تنگیل پہنچ گئے ان کو واپس آتا دیکھ کر تو وہ لوگ حیران ہو گئے ان کا خیال تھا کہ کمپنی کمانڈر ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ انھوں نے جاتے ہی نارمل انداز میں حکم احکام دیئے تاکہ ساری کمپنی کو اندازہ ہو جائے کہ کمان کمپنی کمانڈر کی ہے۔ اسی رات کمپنی نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر کاظم کا گھیراؤ کر لیا اس وقت تنگیل ریسٹ ہاؤس میں تنگیل کے اسسٹنٹ کمشنر بھی جو مغربی پاکستان کے تھے پناہ لینے آ گئے تھے۔ باغیوں اور مکتی باہنی کا اصرار تھا کہ ہتھیار ڈال دو پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتار کر ہمیں دو تو ہم جان کی معافی دے دیں گے۔ کاظم نے کہا "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتاروں یہ تو کیا ہوتا۔ میں جیتے جی کسی کو جھنڈے کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔ کاظم نے اپنا ذاتی اسلحہ لے کر ریسٹ ہاؤس میں پوزیشن لے لی۔ ایک جو آگے بڑھتا ان کی گولی کا نشانہ بنتا۔ ایک دن ایک رات یہ مقابلہ جاری رہا دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں دوسرے دن سہ پہر کو کاظم کا اسلحہ جواب دے گیا۔ تو باغیوں نے اور مکتی باہنی کے سرکشوں نے ان کے کمرے پر ہلہ بولا۔ اور بری طرح زخمی کر کے شہید کر دیا۔

لیکن صرف شہید کر دینے پر اکتفا نہیں کیا لاشوں کی بے حرمتی بھی کی۔ اس کے بعد لاشوں

کو ریسٹ ہاؤس کے قریب کے جوہڑ میں پھینک دیا۔ تنگیل میں جو لوگ پاکستان کے وفادار تھے انہوں نے باغیوں اور سرکشوں کے چلے جانے کے بعد لاشوں کو جوہڑ سے نکالا اور ریسٹ ہاؤس کے ایک گوشے میں گڑھا کھود کر دفن کر کے اوپر سے مٹی برابر کر دی۔

اپریل ۷۱ء میں ۸ بلوچ نے تنگیل پر دوبارہ قبضہ کیا۔ تو ملٹری کالج ہی کے ایک اولڈ بوائے افضل ملک (کالج نمبر ۱۸۷۷) نے بڑی مشکل سے ان آدمیوں کو ڈھونڈا جنھوں نے جوہڑ سے لاشیں نکال کر گڑھے میں دفن کی تھیں۔ گڑھے میں بہت سے مغربی پاکستانیوں کی لاشیں تھیں اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد لاشیں بگڑ چکی تھیں۔ بہر حال کاظم کو ایس ایس جی کے لمبے بوٹوں اور ٹیڑھی انگلی سے پہچانا گیا۔ ان سب کو تنگیل ریسٹ ہاؤس ہی کے ایک گوشے میں دفنا دیا گیا۔

ڈھاکہ کے سقوط کے بعد پھر مکتی باہنی والوں کی بن آئی وہ پھر قبروں کو توڑنا پھوڑنا اور بے حرمتی کرنا چاہتے تھے اس سیکٹر کا ہندوستانی کمانڈر کوئی بریگیڈیئر جوشی تھا جب اس نے ان کی بہادری کی داستان سنی تو قبروں کو مسمار کرنے سے روک دیا۔

کاظم کمال کی شہادت سے پہلے اور بعد کے واقعات کے ایک اور عینی شاہد لیفٹیننٹ کرنل کرنل افتخار کیانی کمانڈنگ افسر ۱۵ پنجاب بھی ہیں۔ کرنل افتخار کاظم کے خاندان کے بھی ہیں کاظم کمال کے گہرے دوست رہے ہیں۔ خود بھی اپنے خاندان کے بہت سے افراد کی طرح ملٹری کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ ان کے والد کیپٹن فتح روز خان کالج کے پہلے چیف انسٹرکٹر اور صوبیدار میجر تھے۔ ان ہی کی نگرانی میں کالج کی بنیادیں رکھی گئیں۔

کاظم کمال کی شہادت سے پہلے اور بعد کے حالات و واقعات کے بارے میں لیفٹیننٹ کرنل محمد افتخار کیانی لکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بغاوت کے آثار تو اوائل جنوری ۱۹۷۱ء ہی سے تھے لیکن مارچ میں عملی طور پر یہ بغاوت شروع ہو چکی تھی۔ جس میں عوامی لیگ کی مکتی باہنی کے علاوہ ای پی آر کے بیشتر بنگالی فوجی بھی کھلے یا چھپے شریک تھے۔ وہ علاقے جہاں اس شورش کا اثر زیادہ نمایاں

تھا ان میں سے تانگیل کا علاقہ بھی تھا جہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک کمپنی میجر کاظم کمال کے زیر کمان متعین تھی اور تانگیل ریسٹ ہاؤس ان کا کمپنی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کمپنی میں میجر کاظم کمال ایک لیفٹیننٹ اور چند عہدیداروں کے سوا ہر درجے کے فوجی بنگالی تھے۔ جن کی وفاداری مشکوک ہو چکی تھی لوائل مارچ سے اکا دکا ایسے واقعات ہونے لگے تھے جن سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ گو ابھی تک کمپنی کے بنگالی فوجیوں نے کھلم کھلا بغاوت نہیں کی تھی۔ ان پر خطر حالات میں کاظم چاہتے تو تانگیل سے کسی نہ کسی طریقے سے خود بھی نکل سکتے تھے جس طرح ہوا کا رُخ دیکھ کر انہوں نے اپنے کمپنی افسر کو دانتوں کے علاج کے بہانے سے سی ایم۔ ایچ بھجوا دیا تھا۔ کاظم کے دوستوں اور بہی خواہوں نے انہیں اشارے کنائے سے سمجھایا بھی کہ بہتر ہے کہ وہ جان بچا لے جانے کی فکر کریں۔ لیکن خطرے سے ڈرنا تو کاظم کمال نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جس کسی نے ان سے جان بچانے کو کہا اس کو انہوں نے یہی جواب دیا ان حالات میں کمپنی کو چھوڑنا باغیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوگا جس کا میں جیتے جی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر میں اپنے مغربی پاکستان کے عہدیداروں کو باغیوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دوں؟ لوگوں کو اس دنیا میں اور آخرت میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" مختصر یہ کہ یہ شیر تند و باد مخالف کے باوجود تانگیل میں ڈٹا رہا۔ اور اپنے معمولات میں خلل نہیں آنے دیا۔ شورش سے پہلے کاظم اپنی کمپنی میں شیر و شکر ہو کر رہتا تھا۔ کاظم کے اس رویے اور مقبولیت کی وجہ سے پوری ایسٹ بنگال رجمنٹ کی بغاوت کے زمانے میں بھی کاظم کی کمپنی نے کاظم یا دوسرے مغربی پاکستانی عہدیداروں کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے۔ یہ محض کاظم کی قیادت کا کمال تھا۔ کہ اس وقت تک اس کے ماتحت اس کے خلاف صف آرا ہونے کی جرأت نہیں کر سکے یہاں تک کہ ۲۵ مارچ کی رات کو بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوجی ایکشن شروع ہوا۔ اس کے دباؤ سے ۲۷ مارچ کو ای۔ بی۔ آر کا ایک دستہ جودے پور سے فرار ہو کر تانگیل کے راستے ہندوستانی سرحد کی طرف روانہ ہوا یہ دستہ سیکنڈ ای بی آر کے میجر صفی اللہ کے زیر کمان تانگیل سے گزرا۔ اس نازک

وقت بھی کاظم کے خلاف کوئی ہتھیار نہیں اٹھا۔ اس دستے کے گزرنے کے بعد ایک بنگالی افسر کے اشتعال دلانے پر ان کی کمپنی نے بغاوت کی اور ان کو تانگیل ریسٹ ہاؤس سے پاکستانی جھنڈا اتارنے پر مجبور کیا۔ جس کا جواب انہوں نے خون سے دیا۔ سنگدل باغیوں نے ان کی لاش کو جیپ سے باندھ کر بازاروں میں کھینچا اور بے حرمت کیا۔ یہ واقعہ اواخر مارچ ۱۹۷۱ء کا ہے۔

کاظم کمال کے بڑے بھائی پاکستان نیوی کے کمانڈر طارق کمال (جواب چیف آف نیول سٹاف ہیں) اس وقت چٹاگانگ میں جہانگیر جہاز کی کمان کر رہے تھے۔ ای بی آر سنٹر اور ای پی آر ونگ کی بغاوت کے دوران انہوں نے بغاوت کو فرو کرنے میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔

کچھ عرصے کے بعد جب حالات قدرے بہتر ہوئے اور مکتی باہنی کا زور ٹوٹا تو طارق کمال صاحب میرے پاس ڈھاکہ آئے۔ وہ کاظم کی شہادت سے بہت دل گرفتہ تھے۔ شہادت کی موت تو خیر عظمت کی موت ہوتی ہے انہیں اصل صدمہ کاظم کی تدفین سے متعلق متضاد اور بہت تکلیف دہ افواہوں سے تھا بہر حال طے یہ ہوا کہ تانگیل جاکر ہم خود صورت حال معلوم کریں اور ضروری کارروائی کریں۔ جب ہم تانگیل ریسٹ ہاؤس پہنچے تو وہاں ہو کا عالم تھا نہ آدم نہ آدم زاد۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد ایک خستہ حال چوکیدار برآمد ہوا۔ اس سے ہم نے اپنا تعارف کرایا اور کاظم کی شہادت اور کفن دفن کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو اس نے کہا میجر صاحب کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم نہیں البتہ یہ سامنے جو ڈھیر ہیں ان میں کچھ فوجی ضرور دفن ہیں سنا ہے کہ ان میں ایک سول افسر اور ایک فوجی افسر ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے آس پاس کے سویلین لوگوں سے جو پوچھ گچھ کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ قبریں انہیں فوجیوں کی ہیں جو ریسٹ ہاؤس میں شہید ہوئے تھے۔ فوجی ایکشن کے زمانے میں یہاں ایک پلٹن آئی تھی اس کے آدمیوں نے یہ قبریں تیار کیں تھیں۔ پلٹن کے آدمی ان فوجیوں کی لاشیں شہر کے قبرستان سے لائے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ تنگیل میں ایک مسلم لیگی رہنما

ہیں ان سے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہم ان صاحب کے یہاں پہنچے۔ ان سربرآوردہ رہنما کا تعلق خان قیوم کی لیگ سے تھا اور یہ صاحب سچے پاکستانی تھے۔ دل سے بھی اور عمل سے بھی۔ انہوں نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی اور حالات پر بڑے دکھ سے تبصرہ کرتے رہے جب ہم نے ان سے کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانیوں کی تدفین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا ان تلخ اور تکلیف دہ تفصیلات میں جانے سے کیا حاصل۔ مختصر یہ کہ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ چند فوجیوں کی لاشوں کے ٹکڑے تنگیل کے قبرستان میں باہر بکھرے پڑے ہیں جنہیں جنگلی جانوروں نے مسخ کردیا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا میں نے خاموشی سے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور لاشوں کے ٹکڑے اکٹھے کرواکے وہیں ایک گڑھے میں دبوادیئے۔ باقاعدہ تدفین کا موقع نہ تھا۔ کہنے کی بات نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان لاشوں کی بہت بے حرمتی کی گئی تھی کچھ دنوں کے بعد جب تنگیل میں ایک فوجی دستہ آیا تو اس نے ان لاشوں کو گڑھے سے نکال کے باقاعدہ فوجی اعزاز کے ساتھ تنگیل ریسٹ میں دفن کیا۔ یہ سارے واقعات انہوں نے بہت آبدیدہ ہوکر بیان کئے۔

ان مسلم لیگی رہنما سے رخصت ہوکر ہم دونوں تنگیل کے ایک دینی مدرسے میں گئے۔ وہاں کے بزرگ صورت اور بزرگ سیرت بنگالی مہتمم صاحب سے ملے وہ اور ان کے طلبہ کاظم کی شہادت کے سانحہ اور اس کے بعد کے دلدوز واقعات سے واقف تھے۔ انہوں نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اسی مدرسے میں ہم نے کاظم کمال اور دوسرے شہداء کیلئے ختم قرآن کا اہتمام کرایا جس میں سارے بنگالی طلبہ نے حصہ لیا اور مہتمم صاحب نے بڑے خضوع و خشوع سے دعا کی۔ ان مسلم لیگی رہنما اور مدرسے کے ان مولانا صاحب سے مل کر میرا تاثر یہ تھا کہ ہماری بدقسمتی سے بات بگڑ گئی ورنہ مارچ ۷۱ء کی بغاوت کے بعد بھی وہاں پاکستان سے محبت کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔

تنگیل سے واپس آکر میں اس کھوج میں پڑ گیا کہ کاظم کی شہادت کے ذمہ دار افراد کا

پتہ لگانا چاہیئے۔ اتفاق سے جلد ہی اس کا سراغ مل گیا۔ ہوا یہ کہ کیپٹن سائیگل نامی ایک بنگالی افسر انڈو پاک سرحد پار کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس کو تفتیش کے لئے ڈھاکہ لایا گیا یہ تفتیش میرا ماتحت عملہ کر رہا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ کاظم کمال کی بٹالین کا ایک افسر پکڑا گیا ہے تو اس کیس کو میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تفتیش کے دوران بہت اہم انکشافات ہوئے۔ سائیگل کا باپ پنجابی اور ماں بنگالن تھی۔ ماں کے زیر تربیت رہنے کی وجہ سے وہ سخت متعصب بنگالی ہو گیا تھا اور پشتینی بنگالیوں سے زیادہ مغربی پاکستانیوں کا دشمن تھا ای بی آر کے ساتھ اس نے بھی بغاوت کی اور فوجی ایکشن کے بعد دوسرے باغیوں کے ساتھ وہ بھی ہندوستان فرار ہو گیا وہاں جب انڈین انٹیلی جنس کے عملہ کو پتہ چلا کہ سائیگل کا باپ پنجابی تھا تو وہ اس کی سخت نگرانی کرنے لگے۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر وہاں سے بھاگ کر پھر مشرقی پاکستان میں آگیا اور سرحد کو عبور کرتے ہوئے اس کو مشکوک حالت میں پکڑ لیا گیا۔

یہ کیپٹن سائیگل کاظم کمال کو خوب جانتا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ اپنے دوست کو تم بچا نہ سکے اب یہ تو بتا دو کہ یہ حادثہ ہوا کیسے۔ اس نے جواب دیا۔ میرا تعلق ای بی آر سے ضرور ہے لیکن میں کاظم کی کمپنی میں نہیں تھا۔ اس حادثہ کے وقت میں وہاں موجود بھی نہیں تھا۔ بہرحال بعد کو میجر کاظم کمال کی کمپنی کے جوانوں سے یہ سنا کہ ای بی آر کی بغاوت کے بعد کاظم کی کمپنی کے جوان ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آدھے سے زیادہ جوان اور عہدیدار ان سے ذاتی طور پر مانوس تھے اور وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ یہ تھی کہ جب بغاوت عروج پر تھی تو اس وقت بھی کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانی عہدیدار ننگیل میں محفوظ رہے۔ دراصل فساد اس وقت شروع ہوا جب ای بی آر کا ایک باغی دستہ میجر صفی اللہ کی زیر کمان ننگیل سے گزرا۔ میجر صفی اللہ نے بھی ان سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ بات اس وقت بگڑی جب اس دستے کا ایک میجر ننگیل میں رہ گیا (یہ میجر کبھی بحیثیت کیپٹن ڈپو ہیڈ کوارٹر میں

میجر جنرل خادم حسین راجہ کا اے ڈی سی سے رہ چکا تھا) اس میجر نے کاظم کی کمپنی کو کاظم اور دوسرے مغربی پاکستانی عہدیداروں کے خلاف اکسایا بلکہ بھڑکایا۔ یہی شخص اس کمپنی کی بغاوت کا لیڈر تھا۔ باغیوں نے کاظم سے کہا کہ اگر وہ پاکستان کا جھنڈا اپنے ہاتھ سے اتار کر ان کے حوالے کر دیں تو ان کی جان بخشی کی جا سکتی ہے۔ کاظم نہ مانے اور باغیوں نے ان کے کمرہ کا محاصرہ کر لیا اس میں محصور ہو کر کاظم جب تک ان کے پاس ایمونیشن رہا۔ باغیوں کا مقابلہ کرتے رہے آخر میں انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ بعد کو مکتی باہنی والوں نے ان کی لاش کو جیپ سے باندھ کر تنگیل کے بازاروں میں کھینچا اور لاش کے ٹکڑے کر کے ایک جوہڑ میں پھینک دیا۔

صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

کاظم کو اس طرح پاکستان کی آن پر کٹ مرنے کیلئے ستارۂ جرأت عطا کیا گیا۔

ستارۂ جرأت کا فرمان

کاظم کمال کی شہادت کا واقعہ ۲۹ مارچ ۷۱ء کو پیش آیا تھا۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ۵۷ بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈیر (اب لیفٹیننٹ جنرل) جہانزیب ارباب ایس جے نے کاظم کمال کیلئے ستارۂ جرأت کے اعزاز کی سفارش کی اس سند نامے کا ترجمہ جس پر انہیں ستارۂ جرأت عطا ہوا تھا۔ درج ذیل ہے۔

یہ شیر دل افسر کاظم کمال، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک کمپنی تنگیل کے علاقے میں مارچ ۷۱ء کے پر آشوب زمانے میں کمانڈ کر رہا تھا۔ اگرچہ ان دنوں ان کی کمپنی کے جوانوں کی وفاداری حد درجہ مشکوک ہو چکی تھی۔ بظاہر مصلحت اسی میں تھی کہ وہ کسی طرح ان سے جان چھڑا لیتے خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس کے باوجود کاظم نے فوج کے مفاد کو مقدم رکھا اور نہ صرف اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی کمپنی کو مختلف پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ یہ کچھ کم حوصلے اور فراست کا کام نہیں تھا۔ لیکن حالات اس حد تک خراب ہو چکے تھے اور علاقائیت کا زہر

اس حد تک ان لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکا تھا کہ بالآخر انہوں نے قانونی اقتدار کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ کاظم کمال اب مسلح باغیوں میں مکمل طور پر گھر چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ذلت انگیز حالات میں ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور تن تنہا باغیوں کی ایک کثیر تعداد کا ۲۸ گھنٹے تک بڑے حوصلے سے مقابلہ کرتے رہے اور بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خاصی تعداد میں زخمی کیا۔ آخر کار انتہائی نامساعد حالات میں جب اسلحہ بارود ختم ہو گیا تو باغیوں نے انہیں بیدردی سے شہید کر دیا۔

کاظم کمال کے اس طرح بے جگری سے مقابلہ کرنے اور بہت سے باغیوں کو کیفر کردار کو پہنچانے سے باغیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ آخر کار وہ ہتھیار پھینک کر جنگلات میں روپوش ہو گئے۔ کاظم کمال کی غیر معمولی جرائت اور پیشہ وارانہ فراست، ملک و فوج سے وفاداری، عسکری تاریخ میں یاد رہے گی۔

شخصیت کا جائزہ

بزدل اور خود غرض شخص خواہ دنیا کے اور کتنے کام کامیابی سے کر لے، لیکن وہ میدان جنگ میں لڑ نہیں سکتا۔ جان نہیں دے سکتا، چھوٹے دل کا حسابی، جوڑ توڑ کا آدمی، جس کو دنیا بڑا ہوشیار اور کامیاب انسان کہتی ہے صرف امن کے زمانے میں، دفتروں کے کمروں میں، میز کرسی پر براجمان، بہار دکھاتا ہے اور اچھی رپورٹیں لیتا ہے۔ میدان جنگ میں ہوشیار نہیں دیوانے کام آتے ہیں۔

کاظم کمال میں اس دیوانگی، اس جرائت رندانہ کی ایک رمق بچپن سے تھی۔ اس رمق کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بچپن میں خود اپنی انگلی کو نشانہ بنا کر اپنی زندگی کا پہلا خطرناک تجربہ کیا۔ اسی طرح اپنی بات پہ اڑنے کا نتیجہ تھا کہ ملٹری کالج میں اپنے سات آٹھ برس کے قیام میں انہوں نے کبھی پاس ہو کے نہیں دکھایا کالج میں ہر چیز میں نام پیدا کیا، باکسنگ، دوڑیں، فٹ بال،

تیرنا، ڈرامہ، لیڈر شپ لیکن پڑھ کے نہیں دیا۔ اس لئے نہیں کہ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بس ایک ضد سی تھی۔ پڑھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کالج سے نکل کر فرسٹ پنجاب میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے گھر میں برادری میں ایک طوفان آگیا۔ لیکن کاظم کو تو جیسے طوفان اٹھانے اور اس کا مقابلہ کرنے میں مزہ آتا تھا۔ کاظم سپاہی بھرتی ہوئے اور ڈنکے کی چوٹ ہوئے پھر کمیشن کو ایک چیلنج سمجھ کر انہوں نے بی اے اسپیشل پاس کر کے کمیشن بھی لیا۔ اور بڑے دھڑلے سے لیا اور دو سال اپنی رجمنٹ میں نوکری کرنے کے بعد کمانڈوز میں جانے کی پیش کش کی اور خود اپنی مرضی سے کی۔ چونکہ ایس ایس جی میں جانا مشکل سمجھا جاتا تھا۔ کاظم کی مہم جو طبیعت مچل اٹھی کہ یہ کام ضرور کرنا۔ ۶۵ء کی جنگ میں انہوں نے کمانڈو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور خوب انجام دیں۔ مہم جوئی کاظم کی فطرت کی خاصیت تھی۔ اسی نے انہیں کمانڈو بنایا۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے انہوں نے فضا سے چھلانگیں لگائیں۔ پیراشوٹ کورس کیا۔ سمندر میں چھلانگیں لگائیں۔ فراگ مین بنے۔ مہم جو وہی ہو سکتا ہے جو فطرتاً دلیر ہو۔

جنوری ۱۹۷۱ء میں ایسٹ پاکستان پہنچے۔ ڈھاکہ میں اس وقت بھی فضا میں کھینچاؤ تھا اور سب لوگ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے لگے تھے ڈھاکہ کے جی او سی میجر جنرل محمد جمشید ایم سی بار ایس جے نے دیکھا کاظم لاپرواہی سے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں چونکہ کاظم کو جانتے تھے اور ان کے خاندان سے پرانے مراسم تھے شفقت سے کہا۔ ”کاظم احتیاط کرو کیسے پھر رہے ہو؟“ کاظم نے فوراً کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں“۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ میں بغاوت کے آثار شروع مارچ ہی سے تھے۔ کاظم کمال چاہتے تو کسی طرح پیچھا چھڑا سکتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ معمولی زخمی ہو کر سی ایم ایچ ڈھاکہ سر کی پٹی کرانے آئے تھے۔ کرنل رب نواز نے جو ان کے کالج کے زمانے کے دوست تھے اور ان سے خاندانی مراسم رکھتے تھے ان سے بااصرار کہا بھی کہ تنگیل واپس نہ جاؤ۔ بلکہ ان

کی طبیعت کو جانتے ہوئے انہیں اپنے میس کے کمرے میں بند کرکے ڈیلو ہیڈ کوارٹر چلے گئے تھے کہ کہیں نکل نہ جائیں۔ لیکن کاظم کی منچلی طبیعت نے چیلنج سے گریز کرنا پسند نہیں کیا اور اپنی جیپ لے کر کھٹ سے تنگیل پہنچ گئے اور پھر جس طرح اور جن حالات میں انہوں نے وطن عزیز کے لئے جان دی، وہ جرأت کی ایک لازوال داستان ہے۔

اخلاقی جرأت میں بھی کاظم کمال کا اپنا انداز تھا۔ کاظم کمال کے چھوٹے بھائی عظمت کمال نے انٹرویو میں ایک واقعہ بیان کیا جو قابل ذکر ہے۔ عظمت کسی یونٹ میں۔ ٹو۔ آئی۔ سی تھے۔ عید آئی تو کاظم نے چھٹی کی درخواست دی۔ تو سی او نے کہا اس چھوٹی عید پر میں چھٹی چلا جاتا ہوں بڑی عید پر تم چلے جانا۔ بڑی عید آئی تو کاظم نے چھٹی لکھ دی جب رجسٹر سی او کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے لکھ دیا پلیز سپیک (براہ مہربانی بات کیجئے) اس کا صاف مطلب تھا کہ نیت بخیر نہیں کاظم نے دیکھا تو بپھر گئے اسی پر لکھا "بات ہو گئی سات روز کی چھٹی پر جا رہا ہوں" اور چھٹی چلے گئے۔ ہر چند کہ ایسا کرنا قانون کے لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ اور ایسا کرنے پر سخت تادیبی کارروائی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کاظم کے مزاج کا رخ کیا تھا۔ غلط بات تو وہ کسی کی بھی برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔

جرأت کی ایک تیسری قسم ذہنی بھی ہے یعنی ذہنی جرأت یعنی انسان اپنی غلطی مان لے۔ اپنی خامی کا اعتراف کرے جب رفیق صاحب کالج کے کمانڈانٹ تھے تو انہوں نے کاظم کو مار پیٹ کے ایک کیس میں سخت ترین سزا دی تھی لیکن جب اوائل فروری ۷۱ء میں ڈھاکہ میں وہ بریگیڈیئر رفیق صاحب سے ملے تو بہت عزت اور شوق سے ملے۔ اپنی غلطی کا اعتراف بلکہ سزا کا شکریہ تک ادا کیا اور کہا۔ اس سزا نے میری آنکھیں کھول دیں۔ چونکہ بہت خلوص سے دی گئی تھی۔ ذہنی جرأت اور اخلاقی جرأت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے۔

ایثار اور احسان کا جذبہ

جرأت کے بعد کاظم کمال کی شخصیت کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی فراخ دلی،

ایثار اور احسان کرنے کا جذبہ شوق تھا۔

جب کالج میں تھے تو ساتھیوں کی خوب تواضع کرتے رہتے تھے۔ خوب کھلاتے پلاتے تھے اور احسان جتائے بغیر اس صفت کے بارے میں عظمت کمال خان لکھتے ہیں۔

کاظم لا ابالی مزاج کے آدمی تھے۔ شاہ خرچ اور موڈی۔ تنخواہ آتی۔ آٹھ دس روز میں خوب عیش کرتے اور کراتے۔ خوب کھلاتے پلاتے۔ تاش کی بازی لگاتے جب پیسے ختم ہو جاتے تو کمرے میں پڑے رہتے۔ دوست احباب کہتے اٹھو یار اب ہماری باری ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر جان چھڑا لیتے۔ لیکن یار دوستوں پر بار نہیں بنتے تھے اصل میں جو مزہ انہیں خرچ کرنے میں آتا تھا وہ خرچ کرانے میں نہیں۔

کالج میں بھی وہ اپنی ایثار پسندی کی وجہ سے مقبول تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ میجر جنرل محمد اقبال (۱۳۳۳) کالج میں کاظم کمال کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کس طرح وہ ایک بار ملیریا کے شکار ہوئے تو صحت یاب ہونے کے باوجود کمزور تھے اور روز کے چھوٹے موٹے کام آسانی سے نہیں کر سکتے تھے کاظم نے ان کے حصے کا بوجھ اٹھایا اور خوش دلی سے اٹھایا۔

کاظم کے سب سے چھوٹے بھائی میجر اسد کمال خان نے جو خود بھی کالج میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

کاظم بھائی بڑے مست الست قسم کے آدمی تھے۔ کپڑے کا شوق نہیں تھا۔ ٹھاٹ باٹھ کیا کرتے وہ تو سوٹ پہننے تک کے روادار نہیں تھے۔ ایک قسم کا لا ابالی پن ان کی طبیعت کا خاصا بن گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ جب تیس کے ہو گئے تو بھائی بندوں کا اصرار شروع ہوا کہ شادی کر لو تو کہتے۔ اب کیا کرنا بہت دیر ہو گئی ہے کاظم بھائی ہم سب بھائیوں میں سب سے زیادہ جرأت مند اور وسیع القلب تھے۔"

کاظم کمال کی تمام زندگی کے مطالعے سے ایک نکتہ بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ شہید کا اپنا ایک ٹائپ ہوتا ہے۔ جرأت اور ایثار سے اس کی شخصیت کا تانا بانا بنتا ہے۔ ایسا شخص

فکروعمل کے عام سانچوں میں پورے طور پر فٹ نہیں ہوتا اس میں ایک طرح کی خودسری ایک تندی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں پر ذرا احتیاط سے فیصلہ دینا چاہیئے جن لوگوں کو غیر معمولی کام کرنا ہوتے ہیں ان کے تیور بھی غیر معمولی ہوتے ہیں۔ جو بندھ جائے سو موتی۔

آخر میں کاظم کمال شہید کے دو تین ساتھیوں کے انٹرویو نقل کرتے ہیں جن سے کاظم کمال کی شخصیت کے اس جائزے کی تائید ہوتی ہے۔

میجر محمد صفدر کا انٹرویو

سوال:۔ صفدر آپ کا کالج نمبر ۱۵۰۰ ہے کاظم کمال ۱۵۲۳ تھے اس لحاظ سے آپ دونوں ایک ساتھ کالج میں داخل ہوئے ہوں گے؟ کاظم کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ کاظم میں کچھ خامیاں بھی تھیں مثلاً سخت لاپرواہ اور کھلنڈرا تھا۔ لیکن لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی بھی اس میں ایسی تھی جو کسی میں ہوتی ہے۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ یاروں کا یار تھا وفا میں یکتا دوستوں کی خاطر خطرہ مول لینا اور قربانی دینا اس کی ہابی سی تھی۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ مثلاً یہ کہ کاظم جب کمپنی سارجنٹ تھا تو لڑکوں کو واکنگ آؤٹ پر بھیجنا گو اس کے دائرہ اختیار میں تو نہیں تھا مگر اکثر ایسا ہوا کہ جب کاظم کسی جونیئر کو باہر جانے واکنگ آؤٹ کے لئے زیادہ بے چین پاتا (اس زمانے میں واکنگ آؤٹ یعنی کالج سے باہر جانے کی چھٹی بڑی مشکل سے ملتی تھی) تو وہ اسے اپنے رسک پر باہر جانے کی اجازت دے دیتا کہتا تم جاؤ میں بھگت لوں گا۔ چنانچہ کبھی کبھی اسے اچھی طرح بھگتنا پڑتا۔ اسی طرح دوسروں کے لئے تکلیفیں اٹھاتا رہتا تھا۔ میں صرف ایک بات کہوں گا۔ کاظم کا دل

بڑا تھا اور خود غرضی تو اس میں نام کو نہیں تھی۔ جب میں نے اس کی شہادت کی خبر سنی تو دل نے بے اختیار کہا۔ دوستوں پر جان چھڑکنے والا آج پاکستان کے ناموس پر جان نچھاور کر بیٹھا جس کی ابتدا وہ ہو اس کی انتہا یہ ہونا تھی۔ زندگی میں سارا کھیل قدروں کا ہوتا ہے۔ جو آدمی روزمرہ کی زندگی میں خود غرض ہو وہ میدان جنگ میں سب سے پہلے خود غرض ثابت ہوتا ہے۔ کاظم کی زندگی اور موت اس لحاظ سے بے داغ تھی ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

راجہ محمد اعظم خان کا انٹرویو

راجہ محمد اعظم خان میجر کاظم کمال کے خاص دوستوں میں سے ہیں اور ان کا شمار کالج کے ان اولڈ بوائز میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے سول میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ اعظم سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ اعظم آپ کا کالج نمبر ۵۲۰ ہے، کاظم کمال کا ۵۲۳ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ دونوں ایک ساتھ کالج میں داخل ہوئے اور ایک ساتھ رہے ہوں گے۔ آپ دونوں کے تعلقات کیسے تھے؟

جواب:۔ میں اور کاظم ۱۹۴۶ء میں داخل ہوئے تھے۔ برسہا برس ساتھ رہے چونکہ ہم دونوں کا مزاج ایک تھا اس لئے خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ گہرے دوست تھے۔

سوال:۔ اگر یکایک کاظم کا نام لیا جائے تو کون سی تصویر آپ کے ذہن میں آتی ہے؟

جواب:۔ میں اور کاظم برڈ وڈ ہاؤس میں کئی سال یکجا رہے۔ کاظم کو کتابی پڑھائی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا وہ دراصل میدان کا آدمی تھا کرکٹ سے تو اسے عشق تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جس زمانے میں پاکستان کی کرکٹ ٹیم انگلستان گئی تھی اور فضل محمود نے اوول کا میچ جیتا ہے ہم راتوں کو جاگ کر اور چھپ چھپ کے کمنٹری سنتے تھے۔ کاظم کو کمنٹری کا اتنا

شوق تھا کہ پاکستان ٹیم کا میچ اگر کاونٹی ٹیموں سے بھی ہوتا تو وہ بھی ضرور سنتا۔ کاظم کے کردار کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کرکٹ کی اسپرٹ اس کے کردار میں بھی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی اننگ بہت شان سے کھیلی۔

سوال:۔ کوئی اور یاد؟

جواب:۔ کاظم کو گانوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں ٹرانسسٹر وغیرہ تو تھے نہیں ہاؤس میں جہازی سائز کا ایک بڑا ریڈیو تھا۔ کاظم کی آدھی جان اس ریڈیو میں تھی۔

سوال:۔ کوئی خاص گانا جو کاظم کو زیادہ پسند تھا؟

جواب:۔ وہ جو ایک پرانا گانا ہے محبت کر کے بھی دیکھا۔ محبت بھی ایک دھوکا ہے اور یہ زندگی کے میلے .....

سوال: سنا ہے کہ ڈراموں میں بھی حصہ لیتے تھے؟

جواب:۔ جی ہاں۔ انگریزی کے ڈراموں میں جو حیدری صاحب ڈائریکٹ کرتے تھے۔ وہ کیا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے شاندار ڈرامے ہم نے کالج اسٹیج پر کئے۔ ان وزبل ڈیوک، چنار کا درخت ورجی نین می، کہاں بھولنے کی چیزیں ہیں۔ کاظم کمال نے شاید اس می والے ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں آرہا ہیں۔ ۱۹۴۰ میجر رفیق سے پوچھ کے بتاؤں گا۔ وہ اس ڈرامے میں تھے۔

سوال:۔ آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟ کاظم کمال کی شخصیت کا؟

جواب:۔ بہت اچھا کھلاڑی۔ میدان میں بھی، زندگی میں بھی۔

لیفٹیننٹ کرنل منظور حسین کے تاثرات

۱۹۶۹ لیفٹیننٹ کرنل منظور حسین لکھتے ہیں:۔

کالج میں میرا زمانہ تعلیم ۴۳-۱۹۵۴ ہے اس حساب سے کاظم مجھ سے بعد کالج میں داخل

ہوئے لیکن کلاس میں اور ہاؤس میں کئی سال ساتھ رہا۔ کاظم کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ لیکن دوسرے مضامین سے کوئی خاص کیا قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ سب کھیل خصوصاً فٹ بال خوب کھیلتا تھا اس زمانے میں حیدری صاحب نے جو پہلا انگریزی ڈرامہ کرایا اس میں کاظم کا پارٹ بوڑھے کا تھا۔ ڈرامے میں کاظم کی گوند سے چپکائی داڑھی ایک آدھ بار گری بھی تھی۔

کاظم کو اسکیٹنگ کا شوق بھی تھا۔ برڈوڈ ہاؤس سے رابرٹس ہاؤس تک کی سرکلر روڈ ان کی اسکیٹنگ گراؤنڈ تھی۔ اس زمانے میں یہ چیز ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔

کاظم کو پاپ میوزک کا شوق بھی تھا۔ مغربی دھنوں پر دائیں بائیں پیر مارتے میں نے سب سے پہلے انہیں ہی دیکھا۔ کاظم کی طبیعت نرالی تھی۔ کئی بار عہدہ ملا۔ کارپورل سے سارجنٹ بھی ہوئے۔ لیکن بار بار اتارے گئے تھے جیسے اوپر چڑھنے سے انہیں ضد تھی۔ لیکن ان کی لاپرواہی بھی اوپری تھی۔ لڑکوں کے حلقے میں بہت مقبول تھے۔ وفاداری بشرط استواری کی مکمل تصویر اگر کوئی تھا تو وہ کاظم کمال تھے۔ پہلے وہ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ آخر میں وطن پر جان قربان کردی۔ بظاہر ان میں بہت سی خامیاں تھیں لیکن یہ ایک خوبی ہزار خامیوں پر بھاری ثابت ہوئی۔ کاظم کمال کی زندگی سے میں یہ ایک نتیجہ بھی نکالتا ہوں کہ کردار اور ڈسپلن کے معاملہ میں بھی انسان کے بنیادی طرز احساس کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ بعض اوقات بظاہر اچھا ڈسپلن یا اچھا کتابی نتیجہ انسان کی بزدلی یا بنیادی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ محتاط انسان سے بھی محتاط رہنا چاہیئے۔ زندہ باد میرے شیروں کے شیر۔ کاظم کمال زندہ باد۔

راجہ محمد افضل خان سے انٹرویو

... راجہ محمد افضل خان بھی کاظم کمال کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ راجہ افضل سے کاظم کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ افضل۔ آپ کی رسم و راہ کاظم سے کب اور کہاں شروع ہوئی؟

جواب:۔ کاظم مجھ سے بہت سینئر تھے لیکن چونکہ ان کی عادت امتحانات جلد جلد پاس کرنے کی نہیں تھی ۔اس لئے بہت سے جونیئرز کو بھی ان کی رفاقت کا موقعہ ملا میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ہماری دوستی ایک مشترک حادثہ سے شروع ہوئی۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ ۱۹۵۱۔۵۲ء کی بات ہے کہ آکلنک ہاؤس میں وہ سی ایس ایم تھے اور میں سارجنٹ ہم دونوں کو ان عہدوں سے ایک ساتھ محروم کیا گیا یہ مشترک محرومی ہی ہماری دوستی کی بنیاد تھی۔

سوال:۔ ذرا وضاحت کیجیے؟

جواب:۔ کاظم کی اردو انتہائی کمزور تھی۔ایک بار نہیں چار پانچ بار اردو لازمی اسپیشل کا امتحان دیا اور کبھی پاس نہیں ہوئے۔پاس کیا خاک ہوتے۔پاس ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔حالت یہ تھی کہ اردو میں اپنا نام بھی ذرا تکلف سے لکھتے تھے۔اسی لئے دوستوں میں ،بابائے اردو کے نام سے مشہور تھے۔سراج احمد علوی صاحب نے بہت زور لگایا کاظم کچھ پڑھ لیں لیکن توبہ ہے۔کاظم ایسی غلطی کرنے پر تیار نہیں تھے۔میں بھی اردو میں کچھ کم فاضل نہیں تھا۔لہذا یہ مشترک نالائقی ہماری دوستی کی بنیاد بنی۔کبھی کبھی ہم دونوں سنجیدگی سے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے کا پروگرام بناتے۔جو اکثر کاظم کے شاہانہ مزاج کی نذر ہو جاتا۔

سوال:۔ کالج کے بعد بھی ان سے ملاقات رہی؟

جواب:۔ جی ہاں۔۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں وہ میرے پاس کراچی سیر کے لئے آئے تھے۔میں ان دنوں وہاں قطر جانے سے پہلے ملازمت کر رہا تھا۔سیر سپاٹے کے تو وہ رسیا تھے۔خوب گھومے پھرے اسی زمانے میں کاظم کے بڑے بھائی طارق کمال صاحب انگلستان سے نیوی کمیشن لے کر یا کوئی ٹریننگ لے کر آئے تھے۔مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں ان کے جہاز پر بھی ان سے ملنے گئے تھے۔پھر ۱۹۵۶ء میں ملاقات ہوئی جب وہ مشرقی پاکستان جا رہے تھے۔آخری بار ۱۹۶۴ء

میں دیکھا۔

سوال:۔ افضل اس لحاظ سے آپ نے کاظم کو مختلف حیثیتوں میں دیکھا وہ بھی چودہ پندرہ برس کے عرصے میں۔ آپ کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ میرا یار کاظم زندگی کے بارے میں روپے پیسے کے بارے میں، راحت و آرام کے بارے میں حریص بالکل نہیں تھا۔ عجیب شاہانہ اور درویشانہ طبیعت تھی۔ ہے تو سب کچھ ہے اگر نہیں تو نہ سہی۔ گویا وہ جو اقبال کا شعر ہے ؎

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ والی بات تھی

اب آپ جو سمجھیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لٹانے والے آدمی تھا۔ لیکن زندگی کی متاع اس نے صحیح مقصد پر لٹائی۔ یہی اس کی جیت ہے۔ ورنہ دیر سویر مرنا سب کو ہے۔ حیرت ہے کہ وہ شخص جس کی ساری زندگی لاپرواہی میں گزری اس نے آخری قدم کتنا سوچ سمجھ کر اٹھایا اور کتنا صحیح اٹھایا۔ ایسا دیوانے پر ہزار ہوشیاریاں قربان۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارۂ جرأت کا انٹرویو

۲۰۹۸ لیفٹیننٹ کرنل محمد یوسف ستارۂ جرأت کاظم کمالی کے ہم عصر رہے ہیں۔ یوسف سے کاظم کے بارے میں یہ چند باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ یوسف، ماشاء اللہ آپ خود بھی ایس جے ہیں۔ کاظم کمال بھی ایس جے تھے آپ کے یعنی ایک ایس جے کے دوسرے ایس جے کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟

جواب:۔ کاظم کمال صاحب واقعی باکمال تھے اور مجھ سے بہت سینئر تھے۔ میں نے انہیں دوست اور ایک جونیئر کی حیثیت سے دیکھا۔

سوال:۔ پھر بھی اس حیثیت سے آپ نے انہیں کیسا پایا۔

جواب:۔ وہ برڈوڈ ہاؤس میں کارپورل تھے تو میں ۱۹۵۱ء میں کالج میں داخل ہوا تھا اس زمانے کا ایک گہرا تاثر جو آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے یہ ہے کہ جس طرح جونیئر دوسرے سینئر لڑکوں سے ڈرتے تھے ان سے نہیں ڈرتے تھے۔

سوال:۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب:۔ غالباً یہ کہ وہ جونیئرز پر خواہ مخواہ رعب نہیں گانٹھتے تھے۔ بلکہ ان کا انداز "تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا"، قسم کا تھا۔

اس وقت تو خیر ہم خود بچے تھے اب ان کے کردار کا تجزیہ کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ان کے مزاج میں شاہانہ مزاج کی خوبیاں اور کوتاہیاں تھیں۔

سوال:۔ کاظم سے متعلق کوئی واقعہ یا بات آپ کے ذہن میں محفوظ ہے؟

جواب:۔ میرے ذہن میں ان کی ایک تصویر جو بار بار آتی ہے یہ ہے کہ ہاؤس کے ریڈیو پہ کہنی دھرے کھڑے ہیں اور بڑے انہماک سے سُن رہے ہیں؟

سوال:۔ کیا خبریں؟

جواب:۔ چھوڑیئے۔ خبریں کہاں، ریڈیو سیلون یا بی بی سی سنتے رہتے تھے وہ بھی اکثر گانے چھٹی کے دن اکثر مین گیٹ کے باہر ایک کار کھڑی ہوتی تھی جوں ہی باہر آتے اسٹیرنگ سنبھال لیتے اور بہت تیز چلاتے تھے۔

سوال:۔ آخر میں یہ بتایئے کہ آپ کا تاثر ان کی شخصیت کے بارے میں کیا ہے؟ کوئی چیز ان کے اندر ایسی تھی جس کا رشتہ ان کی شہادت سے ملایا جا سکے؟

جواب:۔ جس جذبے نے انہیں مظلوم جونیئرز پر کرم کرنا سکھایا اسی جذبہ نے انہیں شہادت کے رتبہ بلند پر پہنچایا۔ جو وضو کرتا ہے وہ نماز بھی پڑھتا ہے جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں فراخ دلی اور فیاضی کا ثبوت دیتا ہے وہ بڑے بڑے مرحلوں میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔

کموڈور سید سجاد حیدر کے تاثرات

کالج میں کاظم مجھ سے بہت سینئر تھے۔ پھر بھی جو وقت میں نے ان کے ساتھ گزارا اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کاظم میں ایک انوکھی انفرادیت تھی۔ بظاہر وہ تعلیم کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے۔ غیر ذمہ داری کی حرکتیں کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی۔ جس سے اور بہت سے لڑکے بظاہر بہت اچھے لڑکے عاری تھے۔ ان کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ اتھارٹیز کی نظر میں جتنے معتوب تھے طلبہ کی نظر میں اتنے ہی مقبول تھے اس وقت تو ہم خیر کیا سمجھتے لیکن اب جو میں کاظم کی شخصیت کا تجزیہ کرتا ہوں تو جو خصوصیت انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی توئے دلنوازی ہے وہ بات کے کھرے بھی تھے اور دل کے کھرے بھی۔ اور یہی ان کی بے پناہ مقبولیت کا راز تھا۔ اور وہ چیز جسے جرأت رندانہ کہتے ہیں اس کی بھی ان کے اندر کوئی کمی نہیں تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی خاصی زیادتی تھی۔ یہی چیز آخر کار انہیں سرخ رو کر گئی۔ جو بندھ جائے وہ موتی۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد سعید ستارۂ جرأت تمغہ بسالت کا انٹرویو

سوال:۔ کالج میں کاظم کمال آپ کے ہم عصر تھے اس زمانے کی کوئی یاد؟

جواب:۔ میں ۱۹۵۲ء میں رابرٹس ہاؤس اور برڈ وڈ ہاؤس میں کاظم کمال کے ساتھ رہا ہوں لیکن چونکہ وہ مجھ سے خاصے سینئر تھے اس لئے ان سے کوئی خاص ربط وضبط نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس زمانے کی کوئی واضح یاد میرے ذہن میں نہیں سوائے اس کے کہ انگریزی ڈرامے وغیرہ میں وہ حصہ لیتے تھے اور آزاد طبع سے نظر آتے تھے۔ میرا اصل واسطہ ان سے ۱۹۶۹ء میں پڑا جب وہ ایسٹ پاکستان میں تھے۔

سوال:۔ کس سلسلے میں؟

جواب:۔ وہ اس زمانے میں میجر تھے اور تھرڈ کمانڈو بٹالین کی کمال کمپنی کمان کر رہے تھے۔ میں بھی اس بٹالین میں تھا۔ ۱۹۶۹ء کے اواخر یا ۱۹۷۰ء کے شروع میں چراٹ واپس آکر انہوں نے فرسٹ کمانڈو بٹالین کے سیکنڈ ان کمانڈ کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ان کی پوسٹنگ ایسٹ بنگال رجمنٹ میں ہوئی۔ وہاں جانے سے پہلے ہم نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔

سوال:۔ کہاں؟

جواب:۔ یہ پارٹی شیزان راولپنڈی میں دی گئی تھی۔ میرے علاوہ اس میں کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) طاہر علی قریشی بھی شریک تھے۔ ٹی۔ ایم (لیفٹیننٹ کرنل طارق محمود ستارۂ جرأت) کو بھی شریک ہونا تھا وہ کسی وجہ سے نہ آسکے تھے۔

سوال:۔ اس پارٹی کی کوئی خاص بات؟

جواب:۔ اس پارٹی میں، میں نے میجر کاظم کمال کو معمول سے مختلف پایا۔ وہ ایک دم کچھ سنجیدہ اور گھمبیر سے نظر آرہے تھے اور کچھ اس طرح اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے تھے۔ جیسے یہ واقعی آخری ملاقات ہو۔

سوال:۔ تمہیں یہ تاثر کن باتوں سے ملا؟

جواب:۔ مثلاً بار بار کہتے تھے اس بار مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں کمانڈو ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا۔ ایسٹ پاکستان میں پہلے بھی رہا ہوں۔ پھر جو فقرہ کہا وہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

سوال:۔ مثلاً کیا؟

جواب:۔ اپنے کوٹ کی جیبوں کو تھپتھپاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ میں موت کو اپنی جیب میں پھڑکتا محسوس کر رہا ہوں۔

سوال:۔ اس طرح کی کوئی بات انہوں نے پہلے بھی کبھی کی تھی؟

جواب:۔ میرے سامنے تو اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی البتہ میں نے سنا کہ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے شہادت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

سوال:۔ مثلاً کیا؟

جواب:۔ یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا واقعہ ہے، جو ایس ایس جی کی شاہین کمپنی کے صوبیدار محمد محمد اسحاق نے مجھ سے بیان کیا۔ میجر کاظم کمال کشمیر میں ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے کہ ان کی کمپنی کا ایک آدمی شہید ہوگیا۔ جب اس کی شہادت کی اطلاع ان کو ملی تو انہوں نے کہا، اچھے لوگ ہی شہید ہوتے ہیں ہم جیسے گنہگار پیچھے رہ جاتے ہیں۔

سوال:۔ اب جبکہ ہم کاظم کمال کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں آپ کے دل میں اس وقت کیا احساسات ہیں؟

جواب:۔ اس شخص کا دل سمندر تھا۔ یاروں کا یار، اور وفادار، اور جونیئرز کا مربی اور ہمدرد، اتنا کھلا دل کسی کسی کا ہوتا ہے۔ ان کا مزاج رندانہ تھا۔ شروع شروع میں کافی لاپرواہی سے رہتے سہتے تھے۔ تاش کھیلتے تو بازی ضرور لگاتے میس میں راتیں گزارتے لیکن ۱۹۷۱ء کے اوائل میں ایسٹ پاکستان جانے سے پہلے ان کے اندر ایک نیا انسان جنم لے رہا تھا۔ شہادت ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ اور اس کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ان پر مجاہدانہ اور درویشانہ رنگ غالب تھا۔ پرانی عادتیں یعنی تاش فلم وغیرہ ترک کر دی تھیں تنگیل میں ان کی شہادت جرأت وہمت کی ایک حیرت انگیز اور ایمان افروز داستان ہے۔

میجر علم الدین شہید

آرٹلری

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ———— ۱۱ مئی ۱۹۳۲ء

جائے پیدائش ———— بھڈیارہ کانگڑہ

کمیشن ———— ۶ پی۔ایم۔اے

تاریخ شہادت ———— ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

مقام شہادت ———— واہگہ (لاہور)

مدفن ———— مقام شہادت

میجر علم الدین شہید

کشمیر میں جنگ چھڑ گئی ہے یہ پاکستان کی آزادی کا سوال بھی ہے۔ یار! اقبال! کیا میں مجاہدین کے اس جہاد میں حصہ نہیں لے سکتا؟

بظاہر تو مشکل نظر آتا ہے۔

مشکل کیوں ہے؟ میں پی اے اسپیشل کر چکا ہوں، جوان ہوں، پریڈ کی ہے۔ رائفل چلا سکتا ہوں۔ میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ کمانڈانٹ کو درخواست دوں کہ وہ مجھے مجاہدوں کے دستے میں شامل ہونے کی اجازت دے دیں۔

لیکن پکی فوجی ٹریننگ تو تم نے لی نہیں۔ اتنے کم عمر ہو، لڑو گے کیسے؟

کیسے لڑوں گا؟ یہ تو، تم میدان جنگ میں دیکھنا جہاد کرنے کے لئے میری روح بے چین ہے۔ پاکستان بنتے وقت میرے عزیزو اقارب شہید ہو گئے۔ اگر میں اپنی مرضی سے شہید ہو گیا تو کیا ہوا۔

اگر اتنا شوق ہے تو کمانڈانٹ صاحب سے بات کر دیکھو ویسے مجھے تو یقین نہیں کہ وہ تمہیں اجازت دیں۔

کوشش تو کرنی چاہیئے۔

یہ وہ باتیں تھیں جو اوائل جنوری ۱۹۴۸ء کی ایک سرد صبح کو ملٹری کالج جہلم کے دو سینئر لڑکے رابرٹس ہاؤس کی ایک ڈارمیٹری میں کر رہے تھے۔ جو لڑکا کشمیر میں جہاد پہ جانے کے لئے بے چین تھا۔ وہ چھوٹے قد کا ایک دبلا پتلا متین صورت لڑکا تھا۔ جس کا کالج نمبر ۱۵۹۹ اور نام علم الدین تھا اور وہ دوسرا سینئر کیڈٹ جو مصروف گفتگو تھا۔ اس کا کالج نمبر ۱۳۳۳ اور نام محمد اقبال تھا۔

(اب میجر جنرل محمد اقبال)

اس نوجوان کا شوق جہاد اور ذوق شہادت آخر کار رنگ لایا۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں وہ پہلا پاکستانی افسر تھا جس کا خون پاک وطن کی پاک مٹی پر گرا۔

علم الدین شہید کی زندگی کے چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔

میجر علم الدین شہید

والدین

میجر علم الدین شہید کے والد چوہدری امیر بخش بھڈ ہیارہ تحصیل دھرم سالہ ضلع کانگڑہ (مشرقی پنجاب) کے ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے اپنے شوق سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگ عظیم میں ۱۰/۱۷ ڈوگرا رجمنٹ میں بھرتی ہوئے کچھ دنوں حوالدار رہے۔ پھر فوج سے فارغ ہوکر کانگڑہ میں سول ملازمت کی۔ پاکستان بننے کے بعد راولپنڈی کی ضلع کچہری میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ۵۵ سال کی عمر میں ڈی سی کے ریڈر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں واہگہ بارڈر پر اپنے بیٹے کے ساتھ شہید ہوئے۔

علم الدین کی والدہ گو ان پڑھ تھیں لیکن قلب نور ایمانی سے روشن تھا۔ نہایت پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ بیٹے اور شوہر کی شہادت دیکھی اور صبر و شکر کرتی رہیں۔ ۱۹۷۳ء میں یہ بھی اللہ کو پیاری ہوئیں۔

میاں امیر بخش کے جو چند خطوط اور درخواستیں ملٹری کالج میں محفوظ ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قابل آدمی تھے اچھی انگریزی لکھی ہے اور جو لوگ ان سے ملے ہیں کہتے ہیں کہ قومی اور اسلامی درد رکھتے تھے۔ علم الدین نے یہ خصوصیت اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی۔ سچ ہے جیسا گل ہوتا ہے ویسی بو ہوتی ہے۔

علم الدین کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

علم الدین بھڈبھیارہ ضلع کانگڑہ میں ۹ ستمبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور ابتدائی جماعتیں انہوں نے بھڈبھیارے ہی میں پڑھیں یکم اپریل ۱۹۴۴ء کو وہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانگڑہ کی نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں وہ دسویں جماعت سے اس سکول سے اٹھا لئے گئے اور اسی جولائی ۱۹۴۵ء کی ۲۲ تاریخ کو کنگ جارج رائل ملٹری کالج جالندھر میں نویں جماعت میں داخل ہوئے۔

علم الدین ملٹری کالج جالندھر میں

جالندھر کالج میں علم الدین کا نمبر ۱۱۵۶ تھا۔ یہاں انہوں نے آرمی انگلش سرٹیفکیٹ کلاس سیکنڈ پاس کیا اس کو پاس کرنے کے بعد وہ پری اسپیشل کلاس جماعت نہم میں داخل ہوئے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں انہوں نے نہم سی سے جماعت نہم یا پری اسپیشل کا امتحان پاس کیا۔ ہسٹری اور ریاضی میں انہوں نے ۹۰ سے اوپر امتیازی نمبر لئے۔ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد وہ آرمی اسپیشل کے آخری سال میں آگئے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں انہوں نے انڈین آرمی کا اسپیشل امتحان دیا۔ جالندھر سکول کے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل ایف مچل کی لکھی ہوئی ان کی سالانہ رپورٹ یہ تھی۔

ایک محنتی اور ذہین کیڈٹ دوسروں کا خیال رکھتا ہے قابل اعتماد ہے کھیلوں میں زیادہ حصہ لینا چاہیئے جسمانی طور پر اب بھی قدرے کمزور ہے۔

جالندھر میں علم الدین کی کارکردگی اور رنگ ڈھنگ کے بارے میں خوش قسمتی سے ہمارے پاس اور بھی چند شہادتیں موجود ہیں۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کے چاروں کے۔ جی کالجوں میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے تھوڑے تھوڑے کیڈٹ شامل کر دیئے تھے۔ اس سے پہلے تک کے جی آر جہلم مسلم طلبہ کے لئے کے جی آر جالندھر اور اجمیر ہندو

سکھ طلبہ کے لئے مخصوص تھے۔ ۱۹۴۴ء میں کچھ مسلم طلبہ جہلم سے اجمیر اور جالندھر بھیجے گئے اسی طرح تبادلے میں وہاں سے ہندو اور سکھ طلبہ آئے ۱۹۴۵ء سے دوسری قوم کے کچھ طلبہ کا براہِ راست داخلہ بھی ہونے لگا اس لئے ۱۹۴۵ء سے کے۔جی۔آر جالندھر میں کچھ مسلم طلبہ ہوتے تھے یہ مسلم طلبہ اگست ۱۹۴۷ء میں جالندھر سے جہلم آئے۔ کچھ مسلم اسٹاف بھی ساتھ آیا۔ اس طرح ملٹری کالج کے کچھ طلبہ ایسے بھی ہیں جو علم الدین کے ساتھ جالندھر میں تھے ان سے دو چار سے ہم رابطہ قائم کر سکے۔ ان اولڈ بوائز کے تاثرات علم الدین کے بارے میں نقل کئے جاتے ہیں۔

کرنل عبدالعزیز (کالج نمبر ۱۶۰۰) لکھتے ہیں۔

"جالندھر کے جی آر میں ہندو اور سکھ کیڈٹوں کی کثرت تھی کچھ مسلمان لڑکے بھی تھے۔ وہاں سالانہ تقریب انعامات کے موقعہ پر تین تین ہندو مسلمان، سکھ طلبہ کو اپنے اپنے مذہبی مشاغل میں اوّل دوم سوم آنے پر انعامات دیئے جاتے تھے۔

علم الدین اس زمانے میں بھی سنجیدہ اور متین تھے چپ چاپ، اپنے کام سے کام، نماز کا شوق تھا۔ مسجد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

علم الدین کو دو سال متواتر مذہبی امور میں دلچسپی کا اوّل انعام ملا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں سب مسلمان لڑکے جہلم ملٹری کالج میں آگئے۔ تو یہاں بھی مذہبی مشاغل اور اسلامی کتابوں سے ان کی دلچسپی برقرار رہی۔

میجر علم الدین شہید سے میری پہلی ملاقات اگست ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب میں ملٹری کالج جالندھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ ان کے کردار سے میں بہت متاثر ہوا کیونکہ وہ خاموش طبع نیک سیرت، نمازی اور بہت ہی شریف تھے۔ چونکہ مسلمان لڑکے زیادہ تر دیول ہاؤس میں تھے (صرف تھوڑے سے رائس ہاؤس میں تھے) اس لئے آپس میں جلد گھل مل جاتے تھے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ہم مسلم طلبہ ملٹری کالج جہلم لائے گئے۔ یہاں پر بھی علم الدین اپنی فطرت پر قائم رہے۔"

لیفٹیننٹ کرنل محمد صادق (کالج نمبر ۵۹۵) نے جو کالج کے ہیڈ بوائے بھی رہے ہیں علم الدین کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"میں کنگ جارجز رائل ملٹری کالج جالندھر میں ۱۹۴۵ء میں داخل ہوا تھا۔ وہاں مسلمان لڑکے بہت تھوڑے تھے۔ ان میں علم الدین سینئر تھے۔ بہت اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مسلمان لڑکوں کا ایک گروپ سا بن گیا تھا۔ اس گروپ کی غیر رسمی قیادت علم الدین کے ہاتھ میں تھی وہ مسلم طلبہ کو سمجھاتے رہتے تھے اور ان کے کردار پر نظر رکھتے تھے۔ اگر کوئی مسلمان لڑکا کوئی ہلکی بات کرتا تو کہتے "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو۔ یہ ہندو اور سندھ کیا کہیں گے"

آزادی کے بعد جالندھر کے مسلمان لڑکے ملٹری کالج جہلم آ گئے۔ یہاں وہ گروپ تو نہ رہا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن علم الدین کے طور طریقے وہی رہے۔

دیکھنے میں بہت سیدھے سادھے اور معصوم سے نظر آتے تھے لیکن اندر سے وہ بہت مختلف تھے۔ بے حد حساس۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ان کے خاندان اور گاؤں کے بہت سے مسلمان شہید کر دیئے گئے تھے ان واقعات کا ان کے ذہن پر بڑا اثر تھا اندر سے ان کے اندر ایک لاوا سا ایک رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ شخص ضرور ایک دن کوئی بڑا کارنامہ انجام دے گا"

علم الدین آرمی اسپیشل کا امتحان دے چکے تھے کہ ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد پنجاب میں شدید ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تو جی ایچ کیو دہلی نے فیصلہ کیا کہ جہلم سے ہندو سکھ لڑکے جالندھر بھیج دیئے جائیں اور وہاں کے مسلمان بچے جہلم آجائیں۔ چنانچہ ایک کنوائے کی شکل میں یہاں کے غیر مسلم لڑکے جالندھر چلے گئے۔ یہ ۱۷ اگست کی بات ہے عید کے دوسرے دن صوبیدار میجر انور حسین کی قیادت میں تقریباً تیس مسلمان لڑکے ملٹری کالج آ گئے ان میں علم الدین بھی تھے۔ علم الدین نے یہاں آنے سے پہلے ایک کام ایسا بھی کیا جس کا ذکر ضروری ہے۔ کے۔ جی۔ آر جالندھر میں مسلم طلبہ کے لئے ایک مسجد بھی تھی جس کی دیکھ بھال کے لئے ایک مسجد کمیٹی بھی بنی ہوئی تھی۔ اس کے سیکرٹری مسٹر عبدالحمید قریشی اور علم الدین

مسجد کمیٹی کے ممبروں میں سے ایک تھے جب مسلم طلباء کا قافلہ چلنے لگا تو یہ تجویز ہوئی کہ مسجد سے متعلقہ سازوسامان کو بھی ساتھ لے جانا چاہیئے۔ اس سامان میں مسجد لائبریری کی دو تین سو کتابیں بہت سے قیمتی قالین اور دریاں وغیرہ ایسی چیزیں شامل تھیں۔ علم الدین ان لڑکوں میں سب سے آگے تھے۔ جنہوں نے نہایت جوش و خروش سے سخت محنت کر کے راتوں رات سارے سامان کو پیک کیا اور بحفاظت اپنے ساتھ ملٹری کالج جہلم لے آئے۔ مسلم طلبا کا قافلہ یہاں ۲۰ راگست ۱۹۴۷ء کو پہنچا تھا۔ علم الدین کا نام دوسرے طلباء کے ساتھ کالج میں ۲۱ راگست ۱۹۴۷ء کو درج ہوا۔

علم الدین ملٹری کالج جہلم میں

ملٹری کالج جہلم میں علم الدین کا باقاعدہ داخلہ جالندھر سے آتے ہی دوسرے طلباء کے ساتھ ۲۱ راگست ۴۷ء کو ہوا اور ۱۵۹۹ کالج نمبر ملا۔ چونکہ وہ آرمی اسپیشل کا امتحان دے کر آئے تھے اس لئے انہیں ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں داخل کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد انہیں ان کی کارکردگی کی بنا پر کارپورل بنا دیا گیا۔ مئی ۱۹۴۸ء کے ایف ایس سی کے فرسٹ ایئر کے امتحان میں وہ فرسٹ آئے ان کے نمبر ۵۰۰/۳۶۴ تھے گو کل طلبا کی تعداد ۵ تھی۔ کالج کے کمانڈانٹ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض حسین زیدی نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

"ہونہار کیڈٹ ہے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے بہت کم سن نظر آتا ہے" بات یہ تھی کہ ان کی عمر واقعی کم تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لکھی ہوئی عمر پر نظر ثانی کے لئے کمانڈانٹ کو درخواست دی کہ ان کی عمر کسی غلطی سے نومبر ۱۹۳۰ء درج ہو گئی ہے جبکہ ان کی عمر کم از کم دو سال کم ہے۔ کمانڈانٹ نے درخواست سی ایم ایچ جہلم بھیج دی۔ وہاں کے کمانڈانٹ افسر نے ان کی عمر ۱ا مئی ۱۹۳۲ء متعین کی۔ اس وقت سے یہی میجر علم دین شہید کی تاریخ پیدائش شمار ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں وہ ایف ایس سی کے دوسرے سال میں تھے لیکن امتحان نہیں دیا۔ اس سال کی رپورٹ میں لکھا ہے

کہ یہ کیڈٹ خوش اطوار ہے۔ ذمہ دار ہے اور اچھا باکسر ہے۔

جب علم الدین اگست ۱۹۴۷ء میں کالج میں آئے تو اسکین ہاؤس (حال بابر ہاؤس) میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں کارپورل بنا دیئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں سی کیو ایم ایس ہو گئے۔ پھر کیڈٹ آفیسر ہو کر رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) چلے گئے۔

اوائل ۱۹۵۰ء میں وہ کمیشن کے لئے آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی گئے منتخب ہونے کے بعد ۲۶ مارچ ۱۹۵۰ء کو انھوں نے جے ایس پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کوئٹہ جانے کیلئے کالج کو خیرباد کہا۔ کالج میں ان کی آخری رپورٹ جو کرنل زیدی نے لکھی وہ یہ تھی۔

اس کا ضمیر بیدار ہے، محنتی ہے، ایک اچھا کھلاڑی اور باکسر ہے۔ ذمہ داری کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ قابل اعتماد ہے گو قدرے خاموش طبع ہے۔ کچھ سوشل ہونے کی ضرورت ہے۔

پی۔ ایم۔ اے، کمیشن اور اس کے بعد

جوائینٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کوئٹہ میں چھ مہینے کی کامیاب تربیت کے بعد علم الدین ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کو پی۔ ایم۔ اے پہنچے اور ۲۲ اگست ۱۹۵۲ء کو آرٹلری میں کمیشن لیا ۱۹۵۵ء میں کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۲۸ جنوری ۱۹۶۰ء کو میجر بنا دیئے گئے۔ اس حیثیت میں مختلف مقامات پر خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر ستلج رینجرز کے واہگہ ونگ کے کمانڈر مقرر ہوئے ان کا ہیڈکوارٹر واہگہ پوسٹ کے قریب تھا جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھے۔ رینجرز کے کمانڈر کی حیثیت اپنے ہیڈکوارٹر کے قریب ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح ان کی شہادت واقع ہوئی۔

واقعہ شہادت

میجر علم الدین نے ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء سے ستمبر ۱۹۶۵ء تک ستلج رینجرز میں خدمات انجام دیں میجر علم الدین کے واقعہ شہادت کے بارے میں مختلف روایتیں سننے میں آئی تھیں۔ مصدقہ بیان

کے لئے ہم نے رینجرز کے ہیڈ کوارٹرز سے رجوع کیا تو لیفٹیننٹ کرنل سید حسن جعفر شاہ نے واقعہ شہادت کی جو تفصیل بھیجی وہ یہ ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میجر علم الدین ستلج رینجرز کے تیسرے ونگ کی کمان کر رہے تھے کہ ہندوستان نے ان کے تمام ونگ پر بین الاقوامی سرحد کے ساتھ ساتھ چالاکی سے آگے بڑھ کر بغیر اعلانِ جنگ کے حملہ کر دیا۔ میجر علم الدین کو ۴۸ گھنٹے پہلے سے اس علاقے میں دشمن کے ارتکاز کا علم تھا اور وہ صورت حال پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ستلج رینجرز اور ویسٹ پاکستان رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کو پہنچا رہے تھے۔ ۶ ستمبر کو صبح سویرے جب ہندوستانی فوج نے بین الاقوامی سرحد کو پار کیا تو میجر علم الدین کے ونگ نے شدید مزاحمت کی اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ پوزیشن لیں یہ بڑا نازک وقت تھا۔ سرحد پر جو صورت حال پیدا ہو رہی تھی وہ علم الدین لمحہ بہ لمحہ اوپر پہنچا رہے تھے۔ ونگ ہیڈ کوارٹر میں جو بھی تھوڑے بہت آدمی ان کے زیر کمان تھے۔ ان کی مدد سے انہوں نے علاقے کا دفاع منظم کیا اور ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے کہ وہ دشمن کو پاک زمین پر قدم نہ جمانے دیں ان کے ونگ ہیڈ کوارٹر پر مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک ٹرینچ سے دوسرے ٹرینچ تک اور ایک سیکشن سے دوسرے سیکشن تک جا جا کر دفاع کو منظم کرتے رہے حالانکہ دشمن تعداد میں بے انتہا زیادہ تھا اور ہر طرح سے لیس تھا اس کے باوجود انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور دشمن کو آگے بڑھنے نہیں دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ زیادہ دیر دشمن کو روکا نہیں جا سکتا اور شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہیں دشمن ونگ ہیڈ کوارٹر پر قبضہ ہی نہ کر لے تو انہوں نے ٹاپ سیکرٹ کاغذات اور دوسری مفید دستاویزات ستلج رینجرز کے ہیڈ کوارٹر میں بھیج دیں جب ان کی پوزیشن پر دشمن کے انفنٹری نے ٹینکوں اور توپ خانے کی مدد سے شدید حملہ کیا اور مقابلہ جاری رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا تو بھی اس دلیر افسر نے ہتھیار ڈالنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں اور آخر وقت تک وہ حد درجہ مستقل مزاجی جرأت اور احساس ذمہ داری سے مقابلہ کرتے رہے ان کی کوششوں کے

نتیجے میں جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ دشمن کی پیش قدمی تین گھنٹے رکی رہی جو دفاعی لحاظ سے انتہائی قیمتی وقت تھا یہ وہ نازک لمحے تھے جن کے دوران پاکستانی فوج نے پوزیشن مستحکم کر لی۔ اس معرکے میں علم الدین شہید نے اپنی جان قربان کردی اس کارنامے کے لئے ان کے لئے ستارۂ جرأت (بعد شہادت) کی سفارش کی گئی تھی۔

گو یہ سفارش منظور نہیں کی گئی۔ لیکن ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور کے کامیاب دفاع میں جو کردار میجر علم الدین شہید نے ادا کیا اس کی تفصیل تاریخی کتابوں میں اور اس کی یاد قوم کے دلوں میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

میجر علم الدین شہید کا خون وہ پہلا خون تھا جو پاک وطن کی مٹی پر پاک وطن کے دفاع کے لئے گرا۔

علم الدین شہید کا خاندان

علم الدین کی شادی نسرین علم الدین سے ۱۳ مارچ ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ بڑا لڑکا افتخار الدین تھا جس کا بدقسمتی سے ۱۹۷۸ء میں ۱۸ سال کی عمر میں موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ دوسرا بیٹا عارف جاوید ابھی پڑھ رہا ہے بیٹی روبینہ پروین بھی زیر تعلیم ہے۔ شہید کی دو بہنیں ہیں ایک کے شوہر ۷۱ء جنگ میں سیالکوٹ میں شہید ہوئے۔ دوسری بہن میجر فتح محمد کی زوجہ ہیں میجر فتح محمد نے علم الدین کی شہادت کے بعد سے اس گھر کی سربراہی کا بوجھ بڑی خندہ پیشانی سے اٹھایا ہوا ہے۔

شخصیت و کردار

علم الدین کی شخصیت اور کردار پر ان رپورٹوں سے بھرپور روشنی پڑتی ہے جو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ان کے کمانڈنٹوں نے ان پر لکھیں۔

جالندھر کالج کے کرنل ایف آر مچل نے ۴۷ء میں انہیں ذمہ داراور دوسروں کا خیال رکھنے والا اور قابل اعتماد لکھا۔ دوسروں کا خیال رکھنے کا تعلق انسان کی قدروں سے ہوتا ہے۔ دوسروں کا خیال وہی رکھ سکتا ہے جو خود غرض اور تنگ دل نہ ہو۔ احسان اور ایثار کر سکتا ہو اور قابل اعتماد ہونے کیلئے بھی بڑے کردار، بڑے احساس ذمہ داری اور بڑے پختہ عزم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرنل مچل نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ پاکستانی فوج اور قوم نے جو اعتماد ان پر کیا تھا اسے انہوں نے ٹھیس نہیں لگنے دی۔ ۱۹۴۸ء کی رپورٹ میں کرنل زیدی نے انہیں ہونہار اور روشن مستقبل کا حامل کہا۔ ایسا وہی ہو سکتا ہے جس کے اندر صلاحیتیں ہوں اور وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ دبلا پتلا ہوتے ہوئے انہوں نے باکسر بن کر دکھایا۔ ایک گاؤں کا بچہ جالندھر اور جہلم کے ملٹری کالجوں میں اپنی جگہ بلکہ ممتاز جگہ پیدا کر لیتا ہے یہ ہونہار ہونا نہیں تو کیا ہے۔

علم الدین کی ۱۹۴۹ء کی سالانہ رپورٹ کے ریمارکس یہ ہیں:۔

"بہت ہی خوش خلق اور شائستہ ہے، ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے باکسنگ میں اچھا ہے"۔ اس رپورٹ میں جس خوش خلقی اور خندہ پیشانی کا تذکرہ ہے۔ اس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جسے ایک بار بھی شہید سے ملنے یا بات کا موقعہ ملا ہے۔ اس رپورٹ کی جان دوسرا فقرہ ہے جس میں احساس ذمہ داری کی نشاندہی کی گئی ہے ذمہ داری کا احساس علم الدین کے کردار کا وہ نمایاں وصف تھا جو ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح واہگہ بارڈر پر بھی بروئے کار آیا۔ یہی وہ وصف ہے جو کرنل زیدی نے ان کی آخری رپورٹ میں نوٹ کیا۔

" ذمہ داری کا گہرا احساس رکھتا ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ بعد کے حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ پاکستان نے جو اعتماد ان پر کیا تھا وہ اس پر پورے اترے۔

علم الدین اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی نظر میں

اب تک ہم نے علم الدین کی شخصیت و کردار کا جائزہ ان کی کالج کی رپورٹوں کی روشنی

میں لیا ہے۔لیکن چونکہ انسان کی شخصیت کے اصل بھیدی اور رازدان اس کے اپنے ساتھی اور دوست ہوتے ہیں۔جو شخص ان کی نظر میں محترم ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ واقعی وہ کچھ وزن رکھتا ہے۔

شریف النفس اور کریم النفس

بریگیڈیر عثمان خان (کالج نمبر ۱۵۶۴) لکھتے ہیں۔

علم الدین ملٹری کالج میں مجھ سے ایک کلاس سینئر تھے۔پستہ قد، ذہین اور پڑھنے میں اچھے۔فٹ بال کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔زندگی میں، میں جن تھوڑے سے انتہائی شریف النفس آدمیوں سے ملا ہوں وہ ان میں سے ایک تھے، بہت ہمدرد، احسان کرنے والے اور نرم خو۔غربت میں پلے بڑھے تھے لیکن حد درجہ خود دار اور بلند نظر تھے۔گھر سے بڑی اچھی تربیت لے کر آئے تھے۔ 1950ء کے اواخر کی بات ہے کہ وہ پری کیڈٹ ٹریننگ کوئٹہ سے فارغ ہو کر پی ایم اے جانے سے پہلے چند روز کی چھٹی راولپنڈی میں گزار رہے تھے۔اس عرصے میں، میں ایک دن ان کے گھر میں ٹھہرا تاکہ پری کیڈٹ سکول کوئٹہ جانے سے پہلے ان سے کچھ رہنمائی حاصل کروں۔علم الدین نے میری بڑی مدد کی۔اس حد تک کہ جب کچھ ضروری چیزیں خریدنے کیلئے مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تو علم الدین نے بکمال مہربانی اس کا انتظام بھی کیا۔

خدا علم الدین کی روح پر رحمتوں کی بارش کرے۔وہ صحیح معنوں میں شریف النفس انسان تھے ان کا شمار ملٹری کالج کے بہترین فرزندوں میں ہوگا۔

مسٹر محمد رشید (کالج نمبر ۱۳۶۵) قطر میں سرویئر ہیں۔کالج میں علم الدین کے ہم عصر تھے وہ لکھتے ہیں۔

علم الدین کے بارے میں جو پہلی بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نماز کے بڑے پابند تھے۔

وہ لوگ جنہیں کالج کی زندگی کا تجربہ ہے خوب جانتے ہیں کہ کالج میں اکثر وبیشتر سانس لینے کی فرصت نہیں ہوتی۔ اتنے زیادہ کام ہوتے ہیں اور اتنی زیادہ دوڑ دھوپ رہتی ہے کہ حد نہیں اس کے باوجود علم الدین کو اگر ذرا سا بھی موقع ملتا تو وہ پہلے نماز پڑھتے۔

دوسری بات جو مجھے یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ اس زمانے میں ہفتے کی نصف اور اتوار کی پوری چھٹی ہوتی تھی۔ اتوار کو خاصے لڑکے واکنگ آؤٹ پر نکل جاتے تھے۔ سیر و تفریح، سینما، عزیز و اقارب سے ملنا اس میں سب کچھ شامل تھا۔ علم الدین کو باہر جاتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تمام دن نماز کے کپڑوں، شلوار قمیص میں، ہاؤس میں رہتے اور پڑھائی وغیرہ جیسے سنجیدہ کاموں میں لگے رہتے۔ کھیلوں کا انہیں کوئی غیر معمولی شوق نہیں تھا۔

جب وہ سینئر ہو گئے تو انہیں سیکشن کمانڈر بنا دیا گیا تھا اس دور میں سیکشن کمانڈر کے معنی جلاد کے تھے وہ اپنے آپ کو جونیئرز کا مالک۔ آقا۔ حاکم سب کچھ سمجھتا تھا۔ اس کی مرضی ہوتی تو بیچارے لڑکوں کو دو منٹ کو آرام کرنے دیتا اور اگر مرضی نہ ہوتی تو دن بھر طرح طرح کی سزائیں دے کر انہیں ستاتا رہتا۔ عام تاثر بھی یہی تھا کہ سیکشن کمانڈر کوئی بڑی خوفناک چیز ہے۔ لیکن علم الدین بالکل مختلف قسم کے سیکشن پریفیکٹ تھے۔ جونیئرز کے ساتھ خصوصاً چھوٹے اور نئے لڑکوں کے ساتھ نہایت نرمی اور ہمدردی سے پیش آتے اور نماز کی تلقین کیا کرتے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نیکی، حب الوطنی اور شرافت کا یہ صلہ دیا کہ وہ شہید ہوئے ان کے جونیئر انہیں اب بھی دعائیں دیتے ہیں۔ مجھے بھی ان کا ساتھی ہونے پر فخر ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت (کالج نمبر ۱۶۶۳) نے علم الدین کے بارے میں کہا۔

علم الدین کے جی آر جالندھر سے آئے تھے اور ہیں کے جی آر اجمیر سے ان کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ انتہائی سادہ اور شریف النفس انسان تھے۔ محنتی اور خوش اخلاق۔ نماز کے بڑے پابند تھے ذمہ داری کا احساس غیر معمولی تھا۔ ۴۷ میں ان کے خاندان نے ہجرت کے وقت جو مصائب اٹھائے تھے ان کا ذکر اکثر کرتے تھے کہتے تھے ہندوؤں سے انتقام ضرور لوں گا۔

بریگیڈیر سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار (کالج نمبر ۱۷۳۸) نے ایک ملاقات میں میجر علم الدین شہید کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"علم الدین کا عرف نمازی تھا دبلے پتلے سے تھے قد بھی زیادہ نہیں تھا لیکن اس زمانے میں جبکہ سینئرز جونیئرز کیلئے قہر ہوتے تھے ان کا رویہ جونیئرز کے ساتھ نہایت ہمدردی اور شفقت کا ہوتا تھا۔ ان دنوں سینئرز کو سلوٹ کرنے کا رواج بھی تھا۔ جونیئرز انہیں بڑے شوق سے سلوٹ کرتے تھے۔ وہ عہدے ہی میں نہیں کردار میں بھی بڑے تھے۔

کرنل محمد افضل (نمبر ۱۵۴۲) نے علم الدین کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی:۔

علم الدین کا نمبر (۱۵۹۹) مجھ سے جونیئر ہے چونکہ وہ جالندھر سے آئے تھے۔ لیکن کلاس کے لحاظ سے سینئر تھے ان کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ حد درجہ شریف تھے۔ نمازی۔ مولوی کے نام سے معروف تھے۔ اس زمانے میں سینئرز کا بڑا رعب ہوتا تھا، جونیئرز، سخت سینئرز سے تھراتے تھے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ علم الدین بڑے حلیم اور کریم سینئر تھے۔ ہمدرد اور نرم خو۔"

کرنل محمد عباس خان ستارۂ امتیاز (ملٹری) نے پری کیڈٹ سکول کوئٹہ اور پی ایم اے میں علم الدین شہید کے ساتھ دو کورس کئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

علم الدین کا قد چھوٹا تھا لیکن حوصلہ بڑا تھا۔ دو تین سال میں جو کچھ میں نے ان کا مطالعہ کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب کی طرف رجحان زیادہ تھا بڑی بات یہ کہ عملاً بھی مذہبی تھے۔ دنیا داری ان میں نہیں تھی دوسری بات میں نے یہ نوٹ کی کہ والدین کا بہت ہی احترام کرتے تھے۔

غریب مگر غیور

کرنل عبدالعزیز (کالج نمبر ۱۶۰۰) نے ایک انٹرویو میں کہا:۔

"ایک بات جو علم الدین کے بارے میں بہت واضح طور پر میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ علم الدین نے اپنی غریبی کو کبھی چھپایا نہیں اس دور میں سب ہی جے۔ سی۔ اوز یا اور رینکس

کے لڑکے ہوتے تھے زیادہ تر رجحان اس حقیقت کو چھپانے یا شرمندہ ہونے کا تھا۔ لیکن علم الدین کی بات ہی اور تھی۔ انہوں نے اپنی غربت پر پردہ نہیں ڈالا۔ کبھی بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بنائیں اب خیال آیا ہے تو کہہ سکتا ہوں کہ علم الدین کو اپنے کردار پر، اپنی قدروں پہ اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ انہیں اپنی غربت پر بھی فخر تھا۔ یہ بھی کریکٹر کی بات ہے۔

شوق جہاد

میجر جنرل محمد اقبال ملٹری کالج میں علم الدین کے ہمعصر تھے وہ لکھتے ہیں :۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر میں ایک مجاہد کی حیثیت سے شامل ہونے کے لئے وہ بیتاب اور بے چین تھے ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ ہندوستانی جارحیت کے خلاف جہاد میں عملی حصہ لیں ظاہر ہے کہ ایک کیڈٹ کو محاذ پر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ اور نہ ملی۔ لیکن اس کا انہیں افسوس بہت رہا۔

آگے چل کر جنرل اقبال لکھتے ہیں :۔

" میرا ان کا ایک کمرے میں تقریباً ایک سال ساتھ رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی ایک وقت کی نماز بھی قضا کی ہو۔ یہ مشکل کام ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنہیں کسی کیڈٹ کالج میں کبھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

میں اپنے علم اور تجربے کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ علم الدین بہت ہی پاک اور شائستہ عادتوں اور خصلتوں کے انسان تھے ایسے کہ اس وقت بھی وہ اپنے دائرے میں قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہمیں تو وہ کچھ غیر معمولی سے نظر آتے تھے۔ جیسے کسی جذبے یا خیال یا روح نے انہیں اپنے قبضہ میں لے رکھا ہو۔

والدین کا اچھا بیٹا، بہنوں کا اچھا بھائی، اچھا شوہر اور اچھا باپ

کسی انسان کو پرکھنے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ گھر میں کیا ہے، اور کیسا ہے، باہر رستم بن جانا آسان ہے۔ گھر میں ہیرو بننا مشکل ہوتا ہے علم الدین اپنے گھر میں بھی ہیرو تھے ان کے قابل قدر بہنوئی میجر فتح محمد صاحب لکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے پر علم الدین جالندھر کالج سے برائے راست جہلم آئے تھے ان کے والدین کانگڑہ سے مہاجروں کے ساتھ پہلے لاہور آکر ٹھہرے پھر راولپنڈی چلے گئے۔ والدین کو بیٹے کی اور بیٹے کو والدین کی خبر نہیں تھی کہ ایک دوسرے پر کیا بیتی کوئی ایک سال بعد والدین اور بیٹے میں ملاقات ہوئی اس عرصے میں علم الدین کی جدائی سے بہت بے چین رہتے تھے۔

موصوف کی والدہ پر ۱۹۵۷ء کے آغاز میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ دو سال تک سخت بیمار ہیں۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ والدہ کے لاڈلے تھے اور انہیں بھی والدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہوئے اور ان کے علاج کے لئے انہیں اور اپنے والد اور چھوٹی بہن کو مردان، نوشہرہ اور پشاور میں اپنے پاس رکھا۔ اس وقت تک وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ان کی شادی مارچ ۱۹۵۸ء میں ہوئی ان کی والدہ کی طبیعت ۱۹۵۹ء میں قدرے بہتر تھی ۸ راگست ۱۹۵۹ء کو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹا عطا فرمایا جس کی خوشی میں ان کی والدہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگئیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ دوسرا بیٹا ستمبر ۱۹۶۲ء میں اور بیٹی اگست ۱۹۶۴ء میں پیدا ہوئی شادی کے بعد چند باتیں جو انہوں نے اپنی بیگم سے کہیں ان میں چند ایک یہ ہیں:۔

میں نہیں چاہتا کہ گھر میں ساس اور بہو کی روایتی نوک جھونک ہو۔

گھر کا ماحول بہت اچھا ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ خراب نہ ہو اور گھر کے تمام افراد ایک فرد کی طرح ہیں۔

میں ناراض ہوجاؤں تو برداشت کر لینا مگر میرے والدین اور بہنیں ناراض نہ ہونے پائیں۔

اللہ کے فضل وکرم سے ان کی یہ خواہش پوری ہوئی گھر کا ماحول مثالی رہا۔ ان کی طرف سے ان کی بیگم کو کوئی شکایت نہیں ہوئی ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا شوہر ہو جو والدین اور بہنوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیگم کو بھی خوش اور مطمئن رکھ سکے ان کے باقی رشتہ دار بھی ان سے بہت خوش تھے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آتے تھے ان کی خواہش تھی کہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں ان کا بڑا بیٹا کے۔ جی۔ ٹو میں پڑھ رہا تھا جب ان کی شہادت ہوئی۔

بھائی علم الدین کے والد بہت حلیم الطبع اور تہجد گزار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بھائی بھی نہایت شریف اور نیک تھے۔ جس کی ان سے ایک دفعہ ملاقات ہو جاتی وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ آج بھی ان کے ملنے والے ان کی شرافت کے گن گاتے ہیں۔

وہ اپنے والدین خصوصاً والدہ کے بہت فرمانبردار تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ والدین کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی ہر خواہش پر لبیک کہتے تھے ایک دفعہ جب وہ رحیم یار خان میں رینجرز میں تعینات تھے وہ ایک ماہ کی رخصت لیکر لاہور آئے تاکہ سٹاف کالج کے امتحان کی تیاری کر سکیں انکی والدہ انکی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ قدرے علیل ہو گئیں۔ جب انہیں اطلاع ملی تو فوراً واپس آ گئے اور کہا تیاری ہو یا نہ ہو میں اب والدہ کے پاس ہی رہوں گا۔

بھائی علم الدین کو اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت تھی ان کے حقوق کا انہیں پورا پورا احساس تھا اپنے والد بزرگوار سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنی بیٹیوں کو اپنی جائیداد میں سے ان کا حصہ دے دیں ان کے والد بھی ضرور ایسا ہی کرتے مگر مکانوں کی ملکیت کے پورے کاغذات نہیں ملے تھے اور نہ ہی ساہیوال کی زمین کا بیع نامہ ملا تھا۔ یہ کاغذات ان کی شہادت کے بعد ملے موصوف کی بہنوں پر آفرین ہے کہ انہوں نے اپنا حصہ اپنے شہید بھائی کے بیٹوں

ان کے والد اکثر کہا کرتے تھے مجھے بھی بندوق لے دو میں بھی کافروں سے جہاد کروں گا۔ ۱۹۶۵ء کے آغاز میں جب ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خراب ہوئے تو کہا کرتے تھے میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میرا بیٹا رحیم یار خان کے باڈر پر اور میرا داماد کشمیر کے باڈر پر کافروں سے برسرِ پیکار ہے ان کا یہ جذبہ رنگ لایا جب ان کے بیٹے کی تبدیلی ۱۸ اگست ۱۹۶۵ء کو رحیم یار خان سے واہگہ ہوئی تو وہ خود ساہیوال ضلع میں زمینوں پر تھے۔ ۵ ستمبر کی شام کو وہ اپنے بیٹے کے پاس واہگہ پہنچ گئے۔ ۶/۵ ستمبر کی رات واہگہ پر حملہ ہوا تو بھائی علم الدین نے اپنے خاندان کو ہندوستانی نرغے سے نکلنے کیلئے کہا اور ایک گاڑی مہیا کر دی خود اپنے جوانوں کے ساتھ مورچوں کی طرف چلے گئے۔ گھر والے جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ان کے والد نے وہاں سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً وہ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ شہید ہو گئے اور ان کی جہاد کرنے کی خواہش اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی۔

بھائی علم الدین کی والدہ نے بڑے حوصلے سے اپنے شوہر اور بیٹے کی شہادت کو قبول کیا اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اس عالم فانی سے کوچ کر گئیں۔

آخر میں ہم علم الدین کے دو بہت قریبی دوستوں کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

بریگیڈیر محمد شریف، تمغہ امتیاز لکھتے ہیں۔

علم الدین سے میری پہلی ملاقات مارچ ۱۹۵۰ء میں بری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کوئٹہ میں ہوئی۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ قدر مشترک ملٹری کالج جہلم تھا۔ میں نے ملٹری کالج جہلم ۱۹۴۷ء میں چھوڑا تھا علم الدین ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جالندھر سے جہلم آئے تھے اور وہاں تین سال گزار کر اب بری کیڈٹ اسکول پہنچے تھے۔ اتفاق سے اسی کورس میں ہمارے ساتھ ملٹری کالج کے جو اور لڑکے تھے ان میں علی عابد حسین شہید بھی تھے ایک موقع پر میں نے علم الدین اور علی عابد کا ایک ساتھ فوٹو کھینچا تھا جو اب بھی میرے پاس محفوظ ہے ان دونوں کی شہادت کے بعد سے یہ تصویر میرے لئے ایک قیمتی یادگار کی حیثیت

رکھتی ہے۔

علم الدین کا قد چھوٹا تھا اکہرا بدن تھا لیکن جسمانی طور پر خاصے مضبوط تھے وہ پری کیڈٹ پلاٹون کی باکسنگ ٹیم میں تھے اور وہ انٹر پلاٹون چیمپئن شپ کے مقابلے میں اپنے وزن میں جیتتے بھی تھے۔

پری کیڈٹ اسکول کوئٹہ میں میرا نمبر ۱۳ تھا اور علم الدین کا ۱۹۔ ہم دونوں ایک ہی ڈارمیٹری میں رہتے تھے۔ حسن اتفاق سے ہمارا ٹیوٹوریل گروپ بھی ایک ہی تھا۔

پری کیڈٹ اسکول سے فارغ ہوکر ہم دونوں پی ایم اے گئے۔ پی۔ ایم۔ اے میں انہیں خالد کمپنی ملی اور میں قاسم کمپنی گیا اس کے باوجود ہمارے تعلقات بڑھتے گئے۔ پی ایم۔ اے کی دو سال کی تربیت کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ علم الدین ایک بہت ہی پر خلوص دوست ہیں۔ اس کا حتمی ثبوت مجھے اس وقت ملا جب میں ایک نئے افسر کی حیثیت سے ان کے ساتھ آرٹلری سکول نوشہرہ میں کورس کر رہا تھا کورس کے دوران میں بیمار رہنے لگا اور بہت کمزور ہوگیا۔ اس وقت تو سبب معلوم نہ ہو سکا تھا بعد کو پتہ چلا کہ ایک گردہ ٹھیک کام نہیں کر رہا کچھ عرصے کے بعد مجھے آپریشن کرانا پڑا۔ اس تکلیف کے دوران جب کہ مرض کی تشخیص بھی ٹھیک طریقے سے نہیں ہو سکی تھی اور میں بڑا پریشان تھا۔ بیماری اور پریشانی کے اس تمام عرصے میں علم الدین نے میری تیمارداری بھی کی۔ ہاتھ بھی بٹایا اور دکھ بھی۔ علم الدین کی اس ہمدردی اور غم گساری کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

نوشہرہ آرٹلری سکول سے علم الدین کی پوسٹنگ ۹ ٹینک شکن رجمنٹ کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں علم الدین ملتان میں تعینات تھے وہاں سے ان کا تبادلہ کوئٹہ ہوگیا۔ ملتان میں ان کی والدہ ان کے ساتھ تھیں اور بیمار تھیں۔ کوئٹے کی ٹھنڈ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس بنا پر علم الدین نے درخواست کر کے اپنا تبادلہ کوئٹے سے منسوخ کرایا۔ اس کے بعد انہیں رینجرز میں پوسٹ کر دیا گیا دو سال بعد یہیں ان کی شہادت ہوئی۔ تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہیں ایک طرح سے لاہور کا تبادلہ انہوں نے خود کرایا تھا۔ جہاں شہادت ان کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک استاد کا تاثر

آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مسٹر ضمیر احمد صدیقی، علم الدین کے بارے میں لکھتے ہیں۔
علم الدین کی سنجیدگی تو خیر سامنے کی چیز تھی لیکن یہ کم کسی کو معلوم ہو گا کہ وہ اپنے گنے چنے دوستوں کی محفلوں میں خوب ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ ایک آدھ بار میں ان کی ڈارم کے پاس سے گزرا تو حیرت ہوئی کہ یہ آواز علم الدین کی ہے۔ علم الدین کا خط بہت صاف ستھرا تھا لاکر میں ہر چیز بڑے قرینے اور نفاست سے چنی ہوئی تھی ایک چیز جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ چھٹی پر جاتے ہوئے بھی ان کے بوٹ ہمیشہ کی طرح چمکتے ہوتے تھے۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

جالندھر سے علم الدین کے ساتھ آنے والوں میں کرنل محمد یونس (کالج نمبر ۱۶۰۶) بھی تھے کرنل یونس ہی نے ہمیں میجر علم الدین شہید کے بارے میں بہت سی معلومات مہیا کیں اور شہید کے لواحقین سے متعارف کرایا۔ جب ہم نے ان سے علم الدین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ عزیز دوستوں کے بارے میں خصوصاً اس وقت جب وہ اس دنیا میں موجود نہ ہوں۔ کچھ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال ہمارے اصرار پر کرنل یونس نے ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"کہا جاتا ہے کہ جنگ بہترین آدمیوں کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ قول علم الدین پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ اپنے رینک کے بہترین افسروں میں سے تھے۔ اکہرے بدن کے تھے قد بھی زیادہ نہیں تھا۔ لیکن تھے بہت باوقار، نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو شہید میں نرمی اور گرمی کا عجیب امتزاج تھا بظاہر باکسروں کا تن و توش نہیں تھا۔ لیکن باکسنگ رنگ میں تندی و توانائی کے شعلوں کی طرح لپکتے تھے۔ اسی طرح بظاہر بڑے نرم خو تھے۔ حد درجہ شائستہ کوئی دیکھے تو پہلی نظر میں فنکار یا دانش ور سمجھے (افسانے تو لکھتے ہی تھے ایک آدھ افسانہ مجھے خیال پڑتا ہے کالج میگزین میں چھپا بھی تھا،

لیکن عزم وحوصلے وثبات میں یہ شخص لوہے بلکہ فولاد کا تھا۔ کالج کے بعد پی ایم اے میں بھی ان کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ آرٹلری کے افسر کی حیثیت سے بہت کامیاب تھے۔ ۶ ستمبر کی صبح واہگہ بارڈر، پر جب حملہ ہوا تو جہاں اپنے بیوی بچوں کو جیپ میں لاہور بھیجا وہاں خود بھی جان بچا سکتے تھے۔ لوگوں نے کہا بھی کہ مقابلہ بیکار ہے لیکن علم الدین نے کہا نہیں یہ نہیں ہو سکتا میں اپنی پوسٹ اور اپنے جوانوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جو لوگ علم الدین سے ملے ہیں وہ میری تائید کریں گے کہ بظاہر بڑے حلیم اور نرم خو، انسان کے اندر ایک نڈر بیباک اور مضبوط ارادے کا انسان چھپا ہوا تھا۔ شہید کی شہادت سے کم از کم میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آدمی کے سراپا اور شکل وصورت اور اندازِ گفتگو پر نہیں جانا چاہیئے۔ اصل چیز اندرونی انسان ہے دل کے نہاں خانے میں چھپا جذبہ ہے اور قدروں کا شعور ہے۔ دوسرے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہادر اور دلیر وہ بھی ہوتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں جو خاموش رہتے ہوں۔ تنہائی پسند ہوں اور بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناتے ہوں۔ ظاہر باتوں کو دیکھ کر کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کون کیا بنے گا آگے چل کر کیا کرے گا۔ علم الدین (۱۵۹۹) اور عابد حسین (۱۶۶۰) اور (۱۸۱۱) محمد اکرم نشان حیدر کو میں نے قریب سے دیکھا تھا۔ اس وقت گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ شہید ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو بندھ جائے سو موتی۔

آخر میں، میں علم الدین کے بارے میں اتنا اور کہوں گا کہ اس شخص کا دل بڑا تھا اور صاف بھی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ کالج کی زندگی میں لڑکے کیسی چھوٹی چھوٹی تنگ دلیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں (ہر بات میں مقابلے کی کچھ ایسی فضا ہوتی ہے کہ شاید اس کے بغیر چارہ بھی نہیں) لیکن علم الدین کارپورل تھے کیڈٹ آفیسر بھی ہوئے لیکن کبھی کسی پوزیشن میں، میں نے علم الدین کو کم ظرف، خود غرض اور ناقابل اعتبار نہیں پایا۔ سچ ہے کہ کوئی چھوٹا آدمی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔

قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

راجہ محمد افضل خان کے تاثرات

۱۷۰۰ راجہ محمد افضل خان لکھتے ہیں:۔

آکنلک ہاؤس میں (۱۹۴۹ء میں) علم الدین میرے کمپنی کمانڈر تھے۔ چونکہ میرا گاؤں کریالہ کالج سے چند میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے کبھی کبھی چھٹی کے دن چھپ چھپا کر گاؤں چلا جایا کرتا تھا۔ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ آخر کار ایک دن راز فاش ہوگیا۔ کمپنی کمانڈر علم الدین صاحب کے سامنے پیشی ہوئی آج کے زمانے کے لوگ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اس زمانے میں کمپنی کمانڈر کیا چیز ہوتا تھا۔ اور اس کا کتنا رعب ہوتا تھا چونکہ علم الدین جلاد قسم کے کمپنی کمانڈر نہیں تھے اس لئے امید تھی کہ سستا چھوٹ جاؤں گا۔ وہی ہوا انہوں نے وارننگ دی اور چھوڑ دیا۔ دوسری بار جب وہی ڈرامہ کیا تو قدرے ناراض ہوئے۔ آکنلک ہاؤس کے کچے فرش پر تھوڑی سی سزا دی اور آخر میں کہا۔ جب زیادہ ضرورت ہو تو مجھے بتا کر جایا کرو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے ان کی کرم نوازی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن ایک بار معاملہ ٹیڑھا تھا اس لئے دھر لیا گیا۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ ایک چھٹی کے دن کالج کے سامنے سرائے سے سائیکل کرائے پر لی اور شام تک اسے خوب گھسیٹا کچھ اس کے انجر پنجر بھی ڈھیلے تھے کچھ ہماری بے احتیاطی نتیجہ یہ ہوا کہ سائیکل کی تیلیاں وغیرہ ٹوٹ گئیں۔ میں شام کو سائیکل والے کی دوکان پر سائیکل واپس کرنے گیا تو اس نے بہت واویلا کیا کہ دیکھو نئی سائیکل کا ستیاناس کر دیا۔ میں بھی خوب جھگڑا۔ میں نے کہا بھلے مانس شرم کر۔ پرانی سائیکل ہمارے سر منڈھ دی اب شور کرتا ہے وہ نہ مانا میں نے کرائے کے پیسے پھینکے اور بھاگ کر کالج آگیا۔ اس کمبخت نے کالج آکر شکایت کر دی۔ اور مقدمہ پھر کمپنی کمانڈر صاحب بہادر کے سامنے پیش ہوا۔ سائیکل والے نے مبلغ دو روپے نقصان کے معاوضے کے طور پر طلب کئے تھے۔ معاملہ صاف تھا۔ فیصلہ ہمارے خلاف ہونا تھا۔ جو ہوا۔ ہم نے دو روپے مدعی کو ادا کئے اور دوکاندار سے جھگڑنے کی سزا ہمیں یہ ملی کہ ایک ہفتہ تک آکنلک ہاؤس کے وسیع و عریض کچے

صحن پر صبح سویرے نو آرے سے پانی ڈالا کریں۔ سردیوں میں یہ سزا بہت سخت تھی۔ بہر حال مرتا کیا نہ کرتا۔ یہ سزا بھگتی اور شکر کیا کہ کمپنی کمانڈر کا بید حرکت میں نہیں آیا۔

علم الدین کا نام کریم الدین ہونا چاہیئے تھا بڑے حلیم اور کریم تھے۔ جونیرز کے لئے وہ فرشتہ رحمت سے کم نہیں تھے جو نور چہرے پر نظر آتا تھا وہ دل میں بھی تھا۔

شخصیت کا ایک اور پہلو

علم الدین کی شخصیت کا اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ جہاں باکسر تھے۔ وہاں ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اپریل ۱۹۴۷ء کے "تربیت" میں علم الدین کا ایک افسانہ چھپا تھا معصوم قاتل ہم اسے یادگار کے طور پر نقل کر رہے ہیں۔

افسانہ

معصوم قاتل

چاندنی رات تھی۔ آسمان پر جھلملاتے ہوئے تارے زمین پر رہنے والی معصوم ہستیوں کی معصومیت دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اونچے درختوں میں سے چاندنی چھن چھن کر مخملی سبزہ کو نور ریز بنا رہی تھی۔ جھنڈوں کا سایہ ایسا نظر آتا تھا۔ جیسے ایک نقاش دنیا کے تمام گناہوں کا ایک بھیانک نقشہ کھینچ کر قدرت کے سامنے پیش کیا چاہتا ہے۔

میں پلنگ پر پڑا قدرتی مناظر سے جی بہلا رہا تھا اور قدرت کی صناعی کی داد دینا چاہتا تھا کہ دل سے آواز آئی ارے میاں! سمندر میں ایک قطرے کی کوئی حقیقت نہیں۔ تیری داد قدرت کی عزت و شان میں کوئی فرق نہیں ڈال سکتی ابھی یہ طے کرنے نہ پایا تھا کہ داد دی جائے یا نہ دی جائے۔ کہ نزدیک ہی کسی طرف سے ایک دبی ہوئی چیخ سکوت کو توڑتی ہوئی گونج اٹھی۔ اٹھ کر آواز کے فاصلے اور رُخ کا اندازہ کرتے ہوئے اسی سمت کو روانہ ہوا۔

اسی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ ایک مکان میں مدھم سی روشنی دکھائی دی مجھے گمان ہوا شاید

یہ وہی مقام ہے جہاں سے چیخنے کی آواز آئی تھی۔ چنانچہ میں کچھ رکتا ہوا آگے بڑھا۔ قریب ہی ایک کھڑکی دکھائی دی میں نے ڈرتے ڈرتے اندر جو جھانکا تو دیکھتا کیا ہوں دو ضعیف العمر مرد و عورت چارپائی پر بندھے ہوئے ہیں۔ اور دو نقاب پوش جوان ان کے سامنے کھڑے ہیں چنانچہ میں فوراً آڑ میں ہوگیا اور ایک جھری میں سے تمام ماجرا دیکھتا رہا۔

اور نقاب پوش نہایت مغرورانہ انداز میں مظلوم بوڑھوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا۔ ہم نے تمہیں بہتیرا سمجھایا۔ لیکن تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگی"۔ یہ مکان ہمارے پڑوس میں ایک تاجر کا تھا جس کا شباب کے ایام میں شہر بھر میں طوطی بولتا تھا۔ لیکن بدقسمت انسان اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ یہ وہی بدنصیب اور اس کی بے گناہ بیوی تھی۔

میں ان کی گفتگو سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ نقاب پوش شہر کے ایک مشہور و معروف تاجر کا لڑکا ہے اور دونوں کا قریبی رشتہ دار بھی ہے۔

اس بے رحم نے اپنے ساتھی کو کچھ اشارہ کیا اور دونوں نے ان میاں بیوی کا گلا گھونٹ دیا اور آن کی آن میں دونوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر گئیں۔ بعد ازاں دونوں نوجوانوں نے ایک آہنی صندوقچہ کھولا اور اس میں سے کچھ نکال کر چل دیئے۔

اس حادثہ کو دیکھ کر میں وہیں نامعلوم عرصے کے لئے مبہوت کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور میرے دماغ کے سامنے دنیا کی خود غرضی، لالچ، بے ایمانی اور ظلم جیسے گناہوں کی اور ان کے انجام کی سینکڑوں تصویریں پھر گئیں۔ اچانک کسی نے کہا چور، خون، قاتل، پکڑو، پکڑو۔

میں آواز سن کر چونک پڑا۔ ناگاہ پولیس کے سپاہیوں سے اپنے آپ کو گھرا پایا۔ بیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا۔ انسپکٹر کا اشارہ ملتے ہی فوراً گرفتار کر لیا گیا اور چند ہی منٹ میں حوالات کی تاریک کوٹھڑی میں بند تھا۔ دوسرے دن مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں کچہری کے نزدیک تمام ہجوم کو دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا۔ خدا سے دعا کی کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس

میں سما جاؤں۔

مجسٹریٹ نے سوال کیا، کیا تم ان مقتولوں کے قاتل ہو۔

سوال کو سن کر دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ دماغ چکر کھانے لگا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو ایک ہسپتال میں پڑا پایا آخر سوچ بچار کر کے اور فرد جرم کو اپنا مقدر سمجھ کر میں نے جینے کا فیصلہ کیا اور انصاف کو خدا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دل کو دلاسا دیا۔ دوسرے دن میں تندرست و توانا تھا۔ اگلی پیشی پر میرے قاتل ہونے کا یقین مجسٹریٹ کے دل میں پختہ ہو گیا۔ کیونکہ میری طرف سے نہ کوئی صفائی تھی اور نہ کوئی عذر۔ اگرچہ تھا تو سب کچھ مگر نامعلوم آنکھوں سے اوجھل۔ چنانچہ سات سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا اور جیل خانہ میری ہفت سالہ رہائش گاہ مقرر ہوئی تعجب ہے کہ پھانسی نہ ہوئی۔ ۔ ۔ ۔

شہر کا ہر فرد و بشر ہر قسم کی چہ میگوئیاں کر رہا تھا قاتل یعنی مجھ پر لعنت بھیجتا تھا۔ گناہ کے انجام کو سوچ کر کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا میں لوگوں کی نظروں میں چور ظالم قاتل تھا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ کون ۔ ۔ ۔ جانتا ہے ۔ ۔ ۔ کہ دنیا میں ۔ ۔ ۔ حقیقی چور ۔ ۔ ۔ ظالم ڈاکو ۔ ۔ ۔ قاتل کہاں ہے؟ ۔ ۔ ۔

میجر علی عابد حسین شہید

آرٹلری

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ——————— ۱۵ر مارچ ۱۹۳۱ء

جائے پیدائش ——————— کھرالی۔ ضلع راولپنڈی

کمیشن ——————— ۶ پی۔ ایم۔ اے

تاریخ شہادت ——————— ۱۰ر ستمبر ۱۹۶۵ء

مقام شہادت ——————— کھیم کرن۔ قصور سیکٹر

مدفن ——————— فیصل آباد

میجر علی عابد حسین شہید

"فاطمہ! اب تم مجھے اجازت دو، وقت کم ہے۔"

"میں کس دل سے، آپ کو رخصت کروں۔ اس بار تو میرا دل اک انجانے خوف سے ڈوبا جا رہا ہے۔"

"انجانا خوف؟ خوف کس بات کا؟"

"بس میرا دل قابو میں نہیں۔"

"فاطمہ تمہارا نام بڑا ہے۔ اس نام کی لاج رکھو۔"

"آنسو پونچھو۔ مجاہدوں کی بیویاں۔ آنسوؤں کے ساتھ نہیں، مسکراہٹوں کے ساتھ مجاہدوں کو رخصت کرتی ہیں۔"

"آپ ناراض نہ ہوں میں آنسو پونچھتی ہوں۔ لیکن ان آنسوؤں پر میرا اختیار نہیں، میرے لئے دل سے دعا کرنا۔ خداوند کریم مجھے شرمندگی سے بچائے۔"

یہ وہ گفتگو ہے جو میجر علی عابد حسین اور ان کی بی بی، فاطمہ عابد حسین میں اس وقت ہوئی جب وہ ان سے آخری بار رخصت ہو رہے تھے۔ علی عابد کے آخری الفاظ تھے۔

"خداوند کریم مجھے شرمندگی سے بچائے۔"

ایسے لوگ جو زندگی سے شرمندہ نہ ہونا چاہتے ہوں اور عزت کی موت (شہادت) کو اپنے لئے سرمایہ عزت سمجھتے ہوں خال خال ہوتے ہیں۔

علی عابد ایسے ہی نادر و نایاب انسانوں میں سے ایک تھے۔ ان کی زندگی اور کارناموں کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

خاندانی پس منظر

تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی میں ایک گاؤں ہے کھرالی۔ جہاں نسلاً جنگجو راجپوتوں کے کئی خاندان آباد ہیں یہی علی عابد حسین کا آبائی گاؤں ہے۔ یہیں علی عابد حسین گاؤں کے ایک معزز راجپوت گھرانے، راجہ غلام حسین کے ہاں ۱۵ر مارچ ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ راجہ غلام حسین نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کیا۔ اور راجپوتانہ رائفلز میں بھرتی ہوکر فوجی ملازمت کا آغاز کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں صوبیدار کی حیثیت سے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء تک برما کے محاذ پر مصروف کارزار رہے جنگی کارکردگی اس پائے کی تھی کہ جنگی انعام کے طور زرعی زمین پائی تھی۔ علی عابد کے ماموں کرنل صدیق راجہ نے جو کرنل صدیق بابا کے نام سے معروف تھے ۱۱ر سکھ رجمنٹ کے ساتھ لڑتے ہوئے دوسری جنگ عظیم میں عراق کے محاذ پر ملٹری کراس حاصل کیا تھا۔ کرنل صدیق بابا اپنے دور کی مشہور شخصیت تھے اپنی بٹالین میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ بے حد دلیر اور جرأت مند۔ بڑوں کے سامنے شیر چھوٹوں کے لئے شیر و شکر علی عابد بچپن میں ان ماموں صدیق بابا کے پاس ڈھوک قاضیاں تحصیل چکوال میں بھی رہے تھے ایک طرح انہی نے انہیں پرورش کیا تھا۔ کرنل صدیق بابا کی شاندار اور موثر شخصیت کا علی عابد پر بڑا اثر تھا۔

صدیق بابا کے علاوہ علی عابد کے دوسرے ماموں راجہ غلام رسول فیصل آباد کے مشہور بیرسٹر تھے۔ یہ تھا وہ فوجی اور علمی ماحول جس کے پس منظر میں علی عابد پیدا ہوئے۔

علی عابد کا بچپن اور ابتدائی تعلیم

بھائی کے حالات بھائی سے بڑھ کر اور کون جانے گا۔ اور بتائے گا۔ علی عابد کے بچپن کے

حالات وواقعات اور ابتدائی تعلیم کے لئے ہم نے ان کے بڑے بھائی راجہ عبدالرشید سے رجوع کیا تو راجہ رشید صاحب نے جواباً یہ لکھا۔

"عابد شہید ۱۵ مارچ ۱۹۳۱ء بروز اتوار ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں کھرالی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب چار سال کے ہوئے تو قصبہ کو نتریلا کے اسکول میں داخل ہوئے میں پہلے سے وہاں پڑھتا تھا۔ ہم دونوں بھائی اکٹھے اسکول جایا کرتے تھے گھر سے اسکول تک خاصا فاصلہ تھا۔ اس لئے سویرے چلتے راستے میں آس پاس کے گاؤں کے دوسرے لڑکے بھی آ ملتے۔ بعض تو آپس میں کھیل کھیلنے لگ جاتے اور اسکول یا تو بالکل نہ جاتے یا پھر پہنچتے تو بہت دیر میں۔ گاؤں کے اسکولوں میں ان باتوں کا کون خیال کرتا ہے۔ کبھی کبھی میرا جی بھی چاہتا کہ ذرا ادھر ادھر پھروں عابد مجھ سے دو سال چھوٹے تھے۔ لیکن وہ مجھے ادھر ادھر نہ ہونے دیتے۔ سیدھے سکول جاتے پھر وہاں سے سیدھے واپس گھر۔ ان دنوں کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ انہیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اسی وجہ سے استاد صاحبان ان سے خاصے خوش تھے۔ ان کی پٹائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد عابد از خود اپنا بستہ کھولتے۔ تختی سلیٹ نکالتے اور جو کام ہوتا پہلے اسے کرتے۔ اس کے بعد شام کو کھیل کے لئے نکلتے۔ کھیل بھی وہ جو عام گاؤں میں کھیلے جاتے ہیں۔ مغرب کے بعد رات کو لالٹین اور دیئے کی روشنی میں پھر پڑھنے بیٹھتے تھے۔ مجھے کتابوں سے اتنی دلچسپی نہیں تھی اس لئے رات کو وہ اکثر اکیلے ہی پڑھتے تھے۔

پڑھنے میں شوق کی وجہ سے وہ کبھی اسکول سے غیر حاضر نہیں ہوتے تھے اور نہ جانے کا کبھی کوئی بہانہ بناتے تھے۔ حالانکہ میرا کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ سبق گول کیا جائے لیکن ان کی وجہ سے مجھے بھی ساتھ جانا پڑتا تھا مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ چونکہ اسکول خاصے فاصلے پر تھا اس لئے ہم دونوں صبح سویرے گھر سے نکلتے تھے کبھی صبح روٹی کو دیر ہو جاتی تو وہ بغیر کچھ کھائے چلنے کو تیار ہو جاتے ایسے موقعوں پر مجھے ان کے ساتھ جانا بہت کھٹکتا تھا۔

پڑھنے لکھنے کے اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ وہ تیسرے درجے ہی میں خط لکھ پڑھ لیتے تھے۔ گاؤں میں یہ بات بہت مشہور ہوگئی تھی کہ راجہ غلام حسین کا چھوٹا لڑکا اتنی چھوٹی عمر میں خط پتر لکھنے پڑھنے لگ گیا ہے۔

عابد بہت خوش مزاج تھے۔ ہنستے ہنساتے رہتے ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے والدہ سے ان کا خاص تعلق تھا۔ اگر باہر کوئی نئی بات ہوتی تو گھر آکر سب سے پہلے والدہ کو بتاتے تھے۔ گاؤں میں جھگڑے قصے چلتے ہی رہتے ہیں اگر والدہ کسی سے کسی کا گلہ شکوہ کرتیں یا کسی جھگڑے ٹنٹے کی بات ہوئی تو چھوٹا عابد بڑی سنجیدگی سے والدہ سے کہتا "امی جان اپنے گھر کی فکر کیا کریں دوسروں کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گاؤں میں جو کچھ ہوتا ہے ہوا کرے۔ ہمیں اس سے کیا۔ اگر دوسرے ہمارے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو کیا کریں۔ ہمیں دوسرے کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے"

یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب ان کی عمر آٹھ دس برس کی تھی۔ جب وہ پانچویں جماعت میں چڑھے تو جہلم ملٹری کالج میں داخل ہوگئے۔

انہیں شروع ہی سے فوج میں جانے کا شوق تھا۔ وہ اپنی خوشی سے کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے کالج میں داخل ہونے کے بعد میں فیصل آباد آگیا ان کا زیادہ وقت کالج میں گزرتا تھا۔ جہلم سے وہ ملٹری اسکول اجمیر چلے گئے تھے آزادی کے بعد پھر واپس آئے۔

ایک اور بات بھی یاد آرہی ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے کالج کے زمانے میں جب کبھی گھر آتے تو اکثر ہم دونوں لمبی سیر کو نکل جاتے تھے۔ اکثر یہ گیت بڑے مزے لے لے کر گاتے تھے۔

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا
بہتے ہوئے آنسو رک نہ سکے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

اس گیت کے علاوہ ایک اور گیت کے دو بول بھی وہ بڑے دلسوز لہجے میں گاتے تھے۔

یہ دنیا کے میلے کم نہ ہوں گے
پر افسوس کہ ہم نہ ہوں گے

اس وقت مجھے کیا معلوم تھا یہ ان کی اپنی داستان ہے۔ دنیا کے میلے واقعی کم نہ ہوئے لیکن عابد نہ رہے۔"

سدا رہے نام اللہ کا

علی عابد کے۔جی۔آر جہلم میں (پہلا دور)

علی عابد نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں فوجیت رچی بسی تھی۔ ان کے والد صوبیدار غلام حسین صاحب سے روایت ہے کہ علی عابد ابھی چھوٹے سے ہی تھے کہ سپاہی، سپاہی کھیل کھیلتے تھے اور درخت کی ٹہنیوں کی رائفل بنا کر لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کرتے تھے وردی پہننے کا بہت شوق تھا۔ والد کی ٹوپی اور فوجی بوٹ پہن پہن کر دیکھتے تھے۔ غلیل سے نشانے بازی کرتے تھے اس کے علاوہ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی اپنے بڑے بھائی سے زیادہ تھا۔ غرض ہر لحاظ سے فوجی زندگی کے لئے موزوں تھے۔ چنانچہ علی عابد کو ان کے شوق کے پیش نظر ملٹری کالج جہلم میں داخل کرا دیا۔ ان دنوں صوبیدار غلام حسین راجپوتانہ رائفلز کے ساتھ بنگال میں تھے بہرحال انہوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اور بڑی امیدوں کے ساتھ ملٹری کالج بھیجا۔

علی عابد کے ایک ہم سبق، بریگیڈیر محمد اسلم ستارۂ جرأت (۱۲۲۱) کے قول کے مطابق علی عابد ملٹری کالج جہلم میں دسمبر ۱۹۴۳ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے اس وقت ان کا نمبر ۱۲۷۴ تھا۔ ۴۶ء کے اوائل میں علی عابد کو ایک خاص اسکیم کے تحت اجمیر کے، کے۔جی۔آر کالج میں بھیج دیا گیا۔

علی عابد اجمیر میں

علی عابد کی اجمیر کی زندگی کے بارے میں ہم نے لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت

(۱۶۶۳) سے ایک طویل انٹرویو لیا۔ اس کے خاص نکتے کرنل یونس ہی کے الفاظ میں نقل کئے جاتے ہیں۔

میں کے۔جی۔آر ایم اسکول اجمیر میں براہِ راست داخل ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں وہاں علی عابد سے ملاقات ہوئی۔ وہ نویں جماعت میں تھے۔ گو میری سیکشن دوسری تھی۔ لیکن ملتے رہتے تھے۔ وہ ہر ٹیسٹ میں اپنی سیکشن میں فرسٹ آتے تھے چونکہ وہاں بیشتر لڑکے تو ہندو سکھ ہی تھے۔ اس لئے ایک مسلمان لڑکے کا فرسٹ آنا انہیں بہت کھٹکتا تھا اور ہم بہت خوش ہوتے تھے اس ملنے میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور ہندو مسلم کش مکش درپردہ اجمیر اسکول میں بھی تھی۔ اجمیر سکول میں مسلمان لڑکوں کی تعداد ۴۰ کے لگ بھگ تھی۔ دس سات آٹھ ملٹری کالج جہلم سے گئے تھے۔ علی عابد ان میں سے ایک تھے۔ لیکن اس وقت وہاں سب مسلمان لڑکوں میں سب سے سینئر علی عابد ہی تھے۔ دوسرے سینئر لڑکوں میں محمد غیاث، محمد اقبال (۱۶۵۹) عبدالوحید اور محمد یسین تھے۔ ۴۷ء میں جب کشیدگی بڑھی اور اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب ہندو سکھ مسلمان لڑکوں کے خلاف کھلم کھلا جتھا بندی کرنے لگے تو ایک طرح سے مسلمان لڑکوں کے لیڈر علی عابد ہی تھے وہی نگران وہی محافظ اور وہی مشیر۔ جب کبھی ہندو سکھ لڑکے آپس میں کچھ سازش کرتے نظر آتے مسلمان لڑکے فوراً علی عابد کے گرد جمع ہو جاتے۔ مسلمان لڑکوں کو علی عابد پر بڑا ناز اور اعتماد تھا اور علی عابد ہر لحاظ سے اس اعتماد کے قابل بھی تھے۔ نہایت مضبوط بدن، دراز قد بڑی اور تیز آنکھیں، گھنگریالے بال، علی عابد جسمانی طور پر بھی ہم ہی میں نہیں ہندوؤں اور سکھوں میں بھی ممتاز نظر آتے تھے لیکن علی عابد کی دھاک صرف جسمانی تنومندی کی وجہ سے نہیں تھی۔ اصل چیز وہ حوصلہ وہ جرأت وہ پاکستانی اسپرٹ تھی جس کا وہ اکثر مظاہرہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم ان پر فخر کرتے تھے اور ہندو سکھ حسد کرتے تھے اور ڈرتے تھے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کا ایک واقعہ سناتا ہوں پاکستان بن چکا تھا خیال تھا کہ ہم پاکستان چلے جائیں گے لیکن ابھی جانے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی اسکول میں اندر ہی اندر لاوا پک

رہا تھا۔ ہندو سکھ لڑکے ہمارے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اس عرصے میں، میں ملیریا میں مبتلا ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ علی عابد روز ملنے آتے تھے۔ ایک شام ایم آئی روم کے باہر ہم بنچ پر بیٹھے تھے کہ ایک ہندو لڑکا جس کا نام لکھی رام تھا اور جو بڑا سورما بنتا تھا آیا اور بڑے جارحانہ انداز سے علی عابد کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اوّل فول بکنے لگا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو یہاں تک کہ گالی پر اُتر آیا۔ علی عابد نے تنبیہ کی گالی دو گے تو مزہ چکھا دوں گا۔ جب وہ باز نہ آیا تو علی عابد نے باکسنگ والا ایک زبردست مُکا اس طرح رسید کیا کہ لکھی رام بنچ سے نیچے جا گرا۔ پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے ہم نے بیچ بچاؤ کرایا اتنے میں سکھ ڈاکٹر آ گیا اس نے دونوں کو ڈانٹا علی عابد اس وقت جوش میں تھے۔ اگر ڈاکٹر نہ آجاتا تو لکھی رام کی خیر نہ تھی بہر حال اس کی اچھی خاصی تواضع تو ہو ہی چکی تھی۔ دور جا کر کہنے لگا تم مسلوں کو ہم مزہ چکھائیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ آج رات ہندو سکھ لڑکے مارنے آئیں گے اور سب سے پہلے علی عابد کو نشانہ بنائیں گے۔ وہ تمام رات مسلمان لڑکوں نے جاگ کر گزاری۔ کمان علی عابد ہی کی تھی۔

دسمبر ۴۷ میں ہم لوگ اجمیر سے ملٹری کالج جہلم آ گئے۔

علی عابد کے۔ جی۔ آر کے ایک اور ہم عصر لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق (۱۶۷۰) لکھتے ہیں:۔

میں ۱۹۴۵ء سے کے۔ جی۔ آر اجمیر میں تھا۔ عابد ملٹری کالج جہلم سے ۱۹۴۶ء میں وہاں پہنچے میں اس وقت آٹھویں میں تھا اور وہ نویں میں۔ ہاؤس بھی مختلف تھا۔ وہ جیکب ہاؤس میں تھے اور میں اسکین ہاؤس میں۔ اس کے باوجود ہم بلکہ سب مسلم کیڈٹس ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

عابد کا قد ۵ فٹ ۱۱ انچ تھا سرخ سپید رنگ چہرے مہرے سے ہی افسر نظر آتے تھے۔ وہ مسلم طلبا میں سب سے زیادہ سینئر تو نہیں تھے لیکن سب سے زیادہ ڈیشنگ اور قابل اعتماد تھے۔ مسلم طلبا کی قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی اور تھے بھی ہر لحاظ سے بہتر۔ پڑھائی میں بھی اور کھیلوں میں بھی۔ وہاں کے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ باکسنگ میں تو خیر ان کا جواب نہیں تھا مجھے یاد نہیں انہوں نے کبھی کوئی باوٹ ہاری ہو۔

علی عابد بظاہر زیادہ مذہبی نظر نہیں آتے تھے لیکن دل کا حال اور تھا۔ اس کے ثبوت میں، میں یہ واقعہ پیش کروں گا۔ کہ، کے۔ جی۔ آر۔ اجمیر میں اس وقت کوئی مسجد نہیں تھی۔ قرآن شریف پڑھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ علی عابد ہی تھے جنہوں نے دوسرے سینئر طلباء کے تعاون سے ایک ٹینٹ (خیمے) میں مسلم طلباء کے لئے نماز اور قرآن خوانی کا انتظام کیا تھا۔

علی عابد ملٹری کالج جہلم میں (دوسرا دور)

میجر علی عابد حسین کے ملٹری کالج میں دوسرے دور کے متعلق ان کے ایک کلاس فیلو ۱۲۲۱ بریگیڈیئر محمد اسلم جنجوعہ ستارۂ جرأت نے استفسار پر بتایا۔

علی عابد اجمیر سے پاکستان بننے کے خاصے دنوں کے بعد دسمبر ۴۷ میں آئے تھے۔ وہ حد درجہ محنتی تھے پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ چیز جسے مقصد کا احساس یا سمت کا احساس کہتے ہیں ان میں بے انتہا تھا۔ اتنے سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آؤٹ ڈور میں خاص طور پر باکسنگ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے اس زمانے میں ملٹری اسکولس باکسنگ ٹورنامنٹ دہلی میں ہوتا تھا اس کے لئے کالج کی ٹیم بنتی تھی۔ خود کالج میں باکسنگ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علی عابد کالج کے بہترین باکسروں میں سے تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کالج ٹیم میں رہے اور بڑے اچھے اچھے باوٹ جیتے۔

بریگیڈیئر سلطان احمد (۱۷۳۸) ستارۂ جرأت نے ایک ملاقات میں علی عابد کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

علی عابد آزادی کے بعد اجمیر آئے تھے۔ جسمانی طور پر بڑے مضبوط اور ممتاز تھے۔ خوش شکل اور وجاہت سے بھرپور۔ ایسے شاندار لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

باکسر بھی بہت اچھے تھے۔ اس زمانے میں کالج کی باکسنگ ٹیم بہت اچھی تھی ۱۲۲۱ محمد اسلم، محبوب علی اور چکوال کے مہر محمد خان بڑے زوردار باکسر تھے۔ علی عابد ان کے مقابلے میں دوسرے

نمبر پر تھے۔ لیکن پھر بھی بہت اچھے تھے۔ کالج کی باکسنگ ٹیم میں تھے۔ اس زمانے میں کالج باکسنگ ٹیم میں ہونا بہت بڑی بات تھی۔

میجر جنرل محمد اقبال، علی عابد حسین کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

پہلا تاثر تو یہ ہے کہ علی عابد بڑے وجیہہ اور شکیل تھے بڑے شاندار ڈیل ڈول کے مالک آواز میں گھن گرج تھی اور چہرے مہرے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص ارادے اور دھن کا پکا ہے۔ اس کی نظر بلندیوں پر ہے یہ کچھ ہونا اور کچھ کرنا چاہتا ہے۔ طالب علمی میں اور عمر کے اس دور میں مقصد و منزل کا اتنا شعور ہر کسی میں نہیں ہوتا علی عابد میں واضح اور نمایاں طور پر یہ شعور تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ لئے دیئے رہتے تھے۔

ایک واقعہ میں خاص طور سے بیان کرنا چاہتا ہوں میں علی عابد کی سیکشن میں جونیئر کیڈٹ تھا اور غالباً آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ ایک روز میں ریڈنگ روم میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ علی عابد آ گئے اور پوچھا آج کی خبریں کیا ہیں؟ میں نے دو چار عام سی خبریں سنا دیں، قتل، اغوا اور حادثات کی کہنے لگے تم اخبار نہیں پڑھ رہے وقت ضائع کر رہے ہو۔ پھر پڑھو اور اہم خبریں تلاش کرو۔ پھر خود ہی کہا۔ اخبار کا اداریہ ضرور پڑھا کرو۔ اخبار خبروں کے لئے ہی نہیں مسائل کو جاننے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو تیس سال سے اوپر ہو گئے لیکن آج بھی میں اس قیمتی مشورے کو بھولا نہیں۔

علی عابد کی قوت ارادی بہت مضبوط تھی حوصلہ بہت بلند تھا۔ زندگی میں جو چھوٹے موٹے مسئلے پیدا ہوتے ہیں طوفان آتے رہتے ہیں۔ علی عابد ان حالات میں گھبراتے نہیں تھے۔ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے جو تصویر گھوم رہی ہے وہ ایک بہت ہی پُر وقار، باہمت اور پُر اعتماد نوجوان کی تصویر ہے۔ حق مغفرت کرے کیسے کیسے لوگ پاک وطن پر قربان ہو گئے۔

میجر علی عابد شہید کے ایک قریبی دوست کرنل محمد یونس (۱۶۰۶) کہتے ہیں۔

"علی عابد سے جو میرا واسطہ رہا اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے خود دار انسان تھے۔ اپنی انا اور آن کا انہیں بہت شدید اور صحیح احساس تھا۔ اسی طرح دوسروں کی انا اور وقار کا خیال رکھتے تھے"

علی عابد بی۔اے اسپیشل اجمیر ہی سے پاس کر کے آئے تھے یہاں آکر ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تھے۔ یہ کلاس ایک لحاظ سے کمیشن کے لئے آئی ایس ایس بی کی تیاری کی کلاس تھی۔ زیادہ تر لڑکوں کی توجہ آئی ایس ایس بی کی تیاری پر ہوتی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد رفیق (۱۶۷۰) لکھتے ہیں کہ علی عابد نے کالج کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ ۱۹۴۹ء کے شروع میں لاہور جا کر آئی۔ایس ایس بی کا امتحان دیا۔ اس بیچ میں بیس لڑکے تھے ایک سے ایک شاندار کسی وجہ سے یہ سارا بیچ فیل کر دیا گیا۔ چھ مہینے کے بعد دوبارہ بورڈ ہوا تو سب کے سب کامیاب قرار دیئے گئے۔ لیکن اس بار وہ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے منتخب نہ ہو سکے اور چھ مہینے کے لئے گھر چلے گئے جب فٹ ہو گئے تو وہ جے ایس پی ٹی ایس کے تیسرے کورس کے لئے فروری ۱۹۵۰ء میں کوئٹہ گئے۔

میجر علی عابد کے ایک اور دوست میجر گل بادشاہ لکھتے ہیں :۔

کے جی آر آئی اجمیر" ما" میں علی عابد کو جانتا تھا۔ پھر ملٹری کالج میں کئی سال ساتھ رہا اس تعلق کی بنا پر جو باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں۔

کافی سمجھدار تھے طبیعت میں صبر و تحمل کا مادہ تھا۔ اجمیر اسکول کے کمانڈانٹ کرنل صلیبی نے علی عابد کو ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ان کی باری سے پہلے انہیں کارپورل بنا دیا تھا۔ اس کا بعض لڑکوں نے بُرا منایا۔ لڑکوں کا ایک گروپ ان کے خلاف ہو گیا تھا اور ان کو کافی تنگ کرتے تھے لیکن علی عابد نے اس مخالفت کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ کبھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا۔ بلکہ مخالف گروپ کے ساتھ بھی نارمل رویہ رکھا بلکہ بھلائی ہی کرتے رہے۔ ان کے اس رویے سے انکے مخالف بھی ان کے دوست بن گئے۔

عابد کئی اعتبار سے ممتاز طالب علم تھے۔ کھلاڑی بہت اچھے تھے لیکن ان کی اصل شخصیت

ان کے نام میں پنہاں تھی۔ نام بھی عابد تھا۔ دل سے بھی عابد تھے۔ میں نے ملٹری کالج کے بعد بھی ان کو دیکھا۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی نماز قضا کی ہو۔ چلتی بس میں نماز ادا کرتے پہلے پہل میں نے انہی کو دیکھا۔

علی عابد بہت کم بولتے تھے۔ ایک آدھ کورس بھی میں نے ان کے ساتھ کیا ہے۔ بحث مباحثے میں بھی بڑھ بڑھ کر حصہ نہیں لیتے تھے۔ بس آخر میں، کوئی ایسا نکتہ پیش کر دیتے تھے کہ بحث الٹ کر رہ جاتی تھی۔

اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود، ان میں مزاح کی حس بھی تھی مجھے یاد ہے ۱۹۵۷ء میں ان کے ساتھ ایک کورس کر رہا تھا۔ انسٹرکٹر نے دریا پار کرنے کے جتنے ممکن ذرائع ہو سکتے تھے ان کی فہرست تمام کر دی تھی۔ بار بار پوچھنے پر کہ اور کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ وہ خاموشی سے اٹھے اور کہا۔ "سر۔ بھینس کی پیٹھ بھی یہ خدمت انجام دے سکتی ہے۔

ایک استاد کے تاثر

آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر، مسٹر ضمیر احمد صدیقی نے علی عابد حسین کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا۔

علی عابد حسین کا شمار بھی علم الدین کی طرح مذہبی لڑکوں میں ہوتا تھا۔ ان کی کم گوئی سے ایک راز بنی رہتی تھی محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن بہت کم بولتے تھے اور بہت بچے تلے لفظوں میں اپنی بات کہہ سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ صبح کی نماز پر وہ مجھے بڑی شائستگی سے سلام کیا کرتے تھے۔

ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی تھی یہ تھی کہ علی عابد میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا اس عمر میں لڑکے عموماً جذباتی اور زود حس ہوتے ہیں کبھی بہت تند و تیز اور کبھی بہت نرم اور لاپروا علی عابد میں ٹھہراؤ تھا۔ علی عابد کو میں آتش برگ کہا کرتا تھا۔ پُر وقار اور پُر اسرار۔

کمیشن کی طرف پہلا قدم

کوئٹہ کے پڑی کیڈٹ ٹریننگ اسکول میں عابد نے اپنے امتیازات باقی رکھے وہ سکول کی نمبر وَن پلاٹون میں تھے۔ اس پلاٹون کے لئے انھوں نے باکسنگ چیمپئن شپ جیتی اور اپنے پُرانے حریف اسلم جنجوعہ (۱۲۲۱) کو پوائینٹ پر مات دی اس کے علاوہ پڑھائی میں بھی اپنی نمایاں پوزیشن برقرار رکھی۔

پی ایم اے کا زمانہ

علی عابد حسین ۶پی ایم اے کورس کے لئے ۲۰ستمبر ۱۹۵۰ء کو پی ایم اے پہنچے پی ایم اے میں علی عابد کے ایک کورس فیلو تھے محمد اسلم جنجوعہ (اب ریٹائرڈ بریگیڈیر اور ستارۂ جرأت) ان کے ملٹری کالج کے پرانے ساتھی لکھتے ہیں :۔

" چھٹے پی۔ ایم۔ اے لانگ کورس میں ملٹری کالج کے ۵ لڑکے تھے اور ان میں نمبر ون علی عابد حسین تھے۔ ہر اعتبار سے پی ایم اے میں عابد کا ریکارڈ بہت شاندار رہا آخری ٹرم میں وہ خالد کمپنی کے سینئر انڈر آفیسر تھے۔ اور آخر کار وہ پورے کورس میں تیسرے یا چوتھے نمبر پر پاس آؤٹ ہوئے پی ایم اے باکسنگ کلر بھی علی عابد نے لیا تھا۔ پی ایم اے میں ان کی آخری فائیٹ کالج ہی کے ایک اولڈ بوائے ۱۲۷۸ محمد زمان کیانی سے ہوئی تھی۔ کیانی بھی بہترین باکسروں میں سے تھے۔ جنہوں نے یہ فائیٹ دیکھی ہے وہ اس کو فراموش نہیں کر سکتے۔ دو بہترین پُرعزم باکسر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔ دونوں لہولہان ہو گئے تھے۔ لیکن پیچھے کوئی نہیں ہٹا۔ آخر عابد ہی نے میدان مارا چند پوائنٹس پر۔ جب آخری گھنٹی بجی اور ہال تالیوں اور نعروں سے گونجنے لگا تو دونوں بے سدھ پڑے تھے۔ دونوں کو وہیں سے ایم آئی روم پہنچایا گیا۔

عابد ایسے افسر ہر روز پیدا نہیں ہوتے چھ فٹ سے اونچا قد تھا۔ حد درجہ وجیہہ باوقار اور پُرعزم تھے۔ اور بااصول و شریف النفس بھی "

پی ایم اے کی اس باکسنگ فائیٹ کے متعلق۔ بریگیڈیر (ریٹائرڈ) سلطان احمد ستارۂ جرأت (دوبار) لکھتے ہیں۔

" علی عابد پی ایم اے میں اپنے وقت کے نامور باکسر زمان کیانی سے ٹکرائے وہ فائیٹ

دیکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ دونوں کے دستانے پھٹ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دو دیو ایک دوسرے سے گتھ گئے ہیں۔ جب راؤنڈ ختم ہوا تو دونوں بے حال تھے۔ دونوں کو باکسنگ رنگ سے اسٹریچر ڈال کے ہسپتال پہنچایا گیا۔ علی عابد میں جرأت اور قوت مقابلہ بہت تھی۔ ان کی اٹھان ایسی تھی کہ خیال ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیشے کی انتہائی بلندیوں کو چھو سکیں گے لیکن قدرت نے ان کے لئے کچھ اور بلندیاں مقرر کر رکھی تھیں۔

کمیشن کے بعد

علی عابد حسین کو ۲۳ر اگست ۱۹۵۲ء کو کمیشن ملا اور آرٹلری میں فرائض منصبی ادا کرنے شروع کئے۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۵۶ء کو کیپٹن ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں انہیں گنری اور لینڈ ریڈار کا کورس کرنے کے لئے امریکہ بھیجا گیا۔ جو انہوں نے نہایت امتیاز سے پاس کیا۔ اگست ۱۹۶۴ء کی ۲۵ تاریخ کو انہیں میجر کے عہدے پر ترقی ملی۔ اسی سال میجر علی عابد نے اسٹاف کالج کوئٹہ کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ اس بنا پر انہیں کمانڈ و اسٹاف کورس کے لئے آسٹریلیا بھیجا گیا۔ اس کورس میں انہوں نے اپنے مقام کو برقرار رکھا۔

یکم دسمبر ۱۹۶۴ء کو میجر علی عابد کو ۳ ایس پی فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں آئے اور ۲۶ جے۔ آر۔ کے ایس۔ پی بیٹری کی کمان سنبھالی۔ اس بیٹری کی کمان کرتے ہوئے وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر ۱۰ستمبر کو شہید ہوئے۔

واقعہ شہادت

علی عابد کی ایس پی بیٹری کھیم کرن کے معرکے میں ۲۴ کیولری کو براہ راست گولہ باری کی امداد دے رہی تھی۔ ۷ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو کھیم کرن فتح ہو گیا۔ یہ ایک لحاظ سے علی عابد کی بیٹری کی کامیابی بھی تھی۔ ۹ستمبر کو ۵۔ آرمرڈ بریگیڈ نے دو طرف سے والٹوہا پر پیش قدمی کی لیکن سال اتر کے مقام پر حملہ کی پیش قدمی رک گئی۔ ۱۰ستمبر ۶۵ء کو بریگیڈ نے سال اتر کی طرف اپنی پیشقدمی پھر شروع کی۔ میجر علی عابد ۲۴ کیولری کو فائر سپورٹ دے رہے تھے کہ وہ ایک جوابی گولہ باری کی زد میں آگئے۔ ٹینک کے گولے کا ایک ٹکڑا سیدھا ان کے سر میں آ کے لگا اور وہ شہید ہو گئے۔

لیکن ان کی بہادر ۲۶ جے۔ آر کے ایس پی بیٹری نے ان کی شہادت کا بدلہ جلد ہی لے لیا۔ اس

بیٹری نے ۱۲ ستمبر ۶۵ء کو ایک کھلی لڑائی میں ہندوستان کی ۴ سکھ بٹالین کو زیر کیا اور ۱۵۶ سپاہیوں اور ان کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل اننت سنگھ سے ہتھیار ڈلوائے۔

شہادت کے ایک عینی گواہ کا بیان ہے۔

میجر علی عابد حسین کھیم کرن سیکٹر میں ۶ لانسرز کے آبزرور آرٹلری کے طور پر کام کر رہے تھے ۱۰ ستمبر کو تقریباً ساڑھے ۶ بجے وہ اپنے بنکر سے چائے کا مگ لے کر باہر آئے۔ ابھی انہوں نے دو تین گھونٹ ہی لئے ہوں گے کہ ہندوستان کی طرف سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ ۶ لانسرز کے سی او نے ان سے کہا بھی "عابد کہیں چھپ جاؤ" عابد نے جواب دیا اگر مجھے یہاں مرنا ہے تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ ابھی یہ جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ بم کا ایک ٹکڑا ان کے سر میں آ کے لگا اور تقدیر کا لکھا ہوا پورا ہوا۔

علی عابد شہید کی شہادت پر انکے والدین کا ردعمل

میجر علی عابد شہید کے بڑے بھائی راجہ عبدالرشید لکھتے ہیں:-

جب والد صوبیدار غلام حسین صاحب کو بھائی عابد کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے کہا۔

"یہ قوم کی امانت تھی جواب ہم نے واپس کر دی۔ ہمارا عابد شہید ہو گیا۔ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں سرخ رو کیا"

اس سلسلے میں عبدالرشید مزید لکھتے ہیں۔

چھوٹے بھائی عابد کی شہادت ستمبر ۶۵ء میں ہوئی تھی۔ والد اس حادثے کے بعد دس سال اور جئے (۷۵ء میں ان کا انتقال ہوا) لیکن اس عرصے میں کبھی انہوں نے مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ والدہ ماجدہ اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھ کر دعا کرتی ہیں کہتی ہیں کہ شکر ہے کہ میرے بیٹے نے دین کے واسطے جان دے دی۔ قیامت کے روز خدا کے روبرو مجھے فخر ہو گا کہ میرے بیٹے نے اپنی قوم کے لئے جان دے دی۔

بیگم عابد کے تاثرات

میجر علی عابد کی شہادت پران کی بیگم فاطمہ عابد حسین نے ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے سرتاج عابد صاحب آسٹریلیا سے اسٹاف کالج کورس مکمل کر کے آنے کے کچھ عرصے کے بعد دوسرے بہادر نوجوانوں کی طرح وہ بھی میدان جنگ میں کود پڑے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بزدل بھارتیوں کو تین مختلف مقامات پر شکست فاش دی۔ لیکن خود شہید ہو گئے" ان کے بڑے بھائی اور والدہ محترمہ کا کہنا ہے کہ اکثر گنگنایا کرتے تھے اور وہ پورا ہوا کہ۔۔۔

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

واقعی عابد صاحب کو اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت تھی۔ اپنے وطن کی سرزمین انہیں ہر ملک سے زیادہ حسین زیادہ دلکش اور دلفریب لگتی تھی۔ میں نے انہیں ہمیشہ اسلام کے گن گاتے سنا۔ وہ نماز اور روزہ کے اس حد تک پابند تھے کہ ٹلہ رینج پر جون کی چلچلاتی دھوپ میں بھی روزہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اسلام اور وطن کے نام پر ان کا چہرہ شدت جذبات سے تمتما اٹھتا تھا اور آنکھیں محبت سے لبریز ہو جایا کرتی تھیں وہ سرزمین پاک کو ماں کا درجہ دیتے تھے۔ اسی سرزمین کی حفاظت کی خاطر جب رخصت ہو رہے تھے تو قدرتی طور پر میرا دل شدت غم سے ڈوب رہا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہے تھے۔ مجھے حوصلہ اور ہمت کا درس دے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے "تم مجاہد کی بیوی ہو۔ مجاہدوں کی بیویاں اشکبار آنکھوں سے نہیں دلفریب مسکراہٹوں سے رخصت کیا کرتی ہیں۔ مسلمان کا ایمان ہے کہ جو رات قبر میں ہے وہ باہر نہیں۔ میرے لئے دل سے دعا کرنا۔ خداوند کریم مجھے شرمندگی سے بچائے"

میں دعا گو ہوں۔ میرے پاکستان کا بچہ بچہ انہیں اصولوں کو اپنا لے اور آنے والی نسلوں

کو ایک نیا انداز زندگی سکھادے کہ پاکستان کو عابد شہید جیسے ہی بے لوث اور بہادر جیالوں کی ضرورت ہے (آمین ثم آمین)

عابد شہید کا خاندان اور بہن بھائی

علی عابد کی ایک چھوٹی بہن تھی جو بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھی بڑے بھائی راجہ عبدالرشید فیصل آباد میں کاروبار کرتے ہیں چھوٹے بھائی خالد محمود پاکستان ہاکی ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں کسٹم میں ملازم ہیں کراچی میں رہائش ہے۔ خالد محمود ملٹری کالج جہلم کے اولڈ بوائے ہیں۔ جب یہاں پڑھتے تھے تو ان کا نام غلام رسول ہوا کرتا تھا۔

بیوی اور اولاد

عابد کی شادی جون ۱۹۵۸ء ان کے چچا اکبر حسین کی بیٹی فاطمہ سے ہوئی ان کا بیٹا خرم عابد حسین مئی ۱۹۵۹ء میں پیدا ہوا۔ پہلی بیٹی ثمینہ نے ستمبر ۶۰ء میں ان کے گھر میں اجالا کیا۔ دوسری بیٹی زیبا ۶۳ء میں اپنے والدین کے دلوں کی زیبائش بنی۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو صالح کرے اور سلامت رکھے اور اپنی امان میں رکھے۔ ثمینہ ماشاءاللہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے خرم عابد ایف ایس سی پری میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔ زیبا نوشین سیکنڈ ایئر میں زیر تعلیم ہے۔

علی عابد کی شخصیت و کردار کا جائزہ

ذہانت اور فراست :- علی عابد کے بڑے بھائی راجہ عبدالرشید راوی ہیں کہ ابھی عابد تیسری جماعت ہی میں تھے کہ وہ خط لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ چنانچہ کھرانی کے چھوٹے سے گاؤں میں جہاں بیشتر فوجیوں کے گھر ہیں دھوم مچ گئی تھی کہ راجہ غلام حسین کا چھوٹا لڑکا عابد خط پتر لکھنے لگ گیا ہے گاؤں کے ان پڑھ مرد اور عورتیں آتے اور خط پتر لکھواتے۔ یہ سلسلہ مدتوں رہا۔ لکھنے پڑھنے

سے یہ دلچسپی جس کا اظہار عابد نے بچپن میں کیا تھا۔ تمام زندگی قائم رہی کے۔جی۔آر اسکول اجمیر کے۔جی۔آر کالج جہلم، پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کوئٹہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول، اسٹاف اینڈ کمانڈ کالج آسٹریلیا ہر جگہ ہر مقام ہر امتحان میں علی عابد نے اپنی تعلیمی برتری برقرار رکھی۔

علی عابد کی سمجھ اور فراست کا اظہار بھی بچپن ہی میں ہونے لگا تھا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالرشید کہتے ہیں کہ وہ اس چھوٹی عمر میں بھی، بے جی، کو بھی یہی مشورہ دیا کرتے کہ آپ لوگوں کے جھگڑوں میں نہ پڑا کریں اور اپنے کام سے کام رکھا کریں۔

اپنے کام سے کام رکھنے کے اصول پر وہ خود بھی عمل پیرا تھے۔ فضول باتوں اور مشغلوں میں انہوں نے کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ اپنے جونیئرز کو بھی یہی تلقین کرتے تھے۔ میجر جنرل محمد اقبال کا بیان جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے کس طرح علی عابد نے بحیثیت سینئر کیڈٹ کے انہیں اخبار کی بیکار خبروں پر وقت ضائع کرنے سے روکا اور اخبار کا اداریہ اور مسائل کا کالم پڑھنے کی ترغیب دی۔

وجاہت اور جرأت

علی عابد کی وجاہت ڈیل ڈول، جسمانی قوت کی تعریف ان کے، کے، جی، آر اسکول اجمیر اور کے۔جی۔آر جہلم کالج کے سب ساتھیوں نے کی ہے۔ وہ اپنے دور کے وجیہہ ترین اور شکیل ترین کیڈٹ تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی وجاہت کو طاقت و توانائی کو بھی قومی مفاد میں استعمال کیا۔

کے۔جی۔آر اسکول اجمیر میں مسلمان لڑکے تھوڑے تھے پاکستان بننے کے بعد خاص طور پر وہ ہندو اور سکھ طلبا کی زیادتیوں کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ ان حالات میں علی عابد آگے آئے اور اپنی خداداد قوت توانائی۔ جرأت حوصلے سے دشمنوں کو پسپا کیا اور اپنوں کا حوصلہ بڑھایا بلکہ انہیں تحفظ دیا۔ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت کا بیان کردہ اجمیر اسکول کا چشم دید واقعہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے کہ کس طرح علی عابد نے ایک ہندو لڑکے لاکھی رام کو اس کی بدتمیزی کا مزہ چکھایا اور وہ کس طرح مسلمان لڑکوں کے رکھوالے بنے ہوئے تھے۔

باکسنگ کے اکھاڑے میں علی عابد کی جرأت اور ہمت کے قصے ہم پہلے ہی سنا چکے ہیں اس جرأت اور قوت برداشت کا مظاہرہ انہوں نے باکسنگ کے اکھاڑے ہی میں نہیں زندگی میں اور میدان جنگ میں بھی کیا۔ ۶۵ء کی جنگ میں علی عابد کے کمانڈر بریگیڈیر (ریٹائرڈ) غلام حسین تھے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں ہمیں بتایا کہ "کھیم کرن کے معرکے میں وہ دو دن دو راتیں متواتر اپنی بیٹری پر نہ رہے نہ سوئے اور نہ آرام کیا۔ ۱۰ ستمبر کی صبح میں نے دیکھا کہ علی عابد کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی ہیں اور سُرخ ہیں۔ لیکن چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے۔ باکسنگ کی اصطلاح میں وہ اگلے راؤنڈ کے لئے بالکل تیار تھے۔

ایمان کی نشانی

علی عابد حسین کا نام ان کی شخصیت کے بنیادی رجحانات کا آئینہ دار ہے علی سے شروع ہوتا ہے اور حسین پر ختم ہوتا ہے۔ بیچ میں عابد ہے۔ عبادت گزار۔ زندگی میں وہ عبادت گزار تھے لڑکپن میں روزے نماز کا کسے ہوش ہوتا ہے۔ شباب کی سرمستیوں میں خدا کو یاد رکھنے والے کتنے ہوتے ہیں لیکن لڑکپن اور شباب کے دور میں بھی علی عابد، عابد تھے، کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت شاہد ہیں کہ کے۔ جی۔ آر اسکول اجمیر میں جب عابد دسویں درجے میں تھے (اور پندرہ سولہ برس کی عمر میں تھے) تو چونکہ اجمیر اسکول میں مسجد نہیں تھی انہوں نے چند دوسرے سینئر طلباء کے ساتھ مل کر ایک خیمے میں نماز پڑھنے اور قرآن خوانی کا انتظام کیا تھا۔

ایمان کی یہ روشنی عابد کے دل کو تمام زندگی روشن کئے رہی۔ اپنی مذہبیت کا ڈھنڈورا انہوں نے کبھی نہیں پیٹا۔ کبھی قول سے اعلان نہیں کیا ان کی مذہبیت قولی نہیں فعلی تھی۔ یاد کیجئے جب وہ اپنی زندگی کی رفیق، فاطمہ عابد سے آخری بار رخصت ہونے لگے تھے تو انہوں نے کیا کہا تھا۔

"میرے لئے دل سے دعا کرنا۔ خداوند کریم مجھے شرمندگی سے بچائے۔"

کتنے پُرمعنی لفظ ہیں اور کتنے پرعزم لفظ ہیں اور ان لفظوں کے پیچھے ایمان کی روشنی ہے۔"

بیگم فاطمہ عابد کا تبصرہ

اصل ہیرو وہی ہوتا ہے جو اپنے بیوی بچوں کی نگاہ میں ہیرو ہو۔شخصیت و کردار کو تولنے کی یہ وہ منزل ہے جہاں بڑے بڑے دیوتاؤں کے پاؤں مٹی کے نظر آتے ہیں۔لیکن علی عابد اس کسوٹی پر بھی پُورے اترتے ہیں۔دیکھئے ان کی رفیقہ حیات فاطمہ عابد حسین کیا کہتی ہیں:۔

باری تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں جن کے لیۓ وہ بارگاہ ایزدی میں ہر وقت دعا گو رہتے کہ وہ انہیں لائق کرے، نیک کرے اور انہیں عمر دراز عطا فرمائے اکثر کہا کرتے تھے کہ ے خدا نے مجھے ہیرے۔موتیوں سے بچے دیئے ہیں

انہیں اپنے بچوں سے عشق کی حد تک پیار تھا۔وہ بہترین بیٹے تھے۔بہترین بھائی، بہترین باپ بہترین دوست اور بہترین شوہر، میرے شوہر دنیا کے بہترین انسان تھے۔میں نے اپنی ازدواجی زندگی کا جتنا بھی مختصر سا حصہ ان کی قربت میں گزارا ہے وہ میرے لیۓ کسی جنت کی نعمتوں سے کم نہیں۔ان کا شفقت بھرا ساتھ۔اعلیٰ کردار۔خوش گفتاری اور گزرے ہوئے لمحات میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں ہمارا ایمان ہے کہ "شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔شہید کبھی مرتے نہیں" یہ واقعی درست ہے جب بھی غم دوران نے مجھے نڈھال کرنے کی کوشش کی ہے تو ان کی روح نے میرے دشوار گزار راستے روشن کر دیئے ہیں۔ان کے بچے ان کی امانت ہیں جن کی پرورش میں دل وجان سے کر رہی ہوں۔خداوند کریم انہیں قلب ونظر کی دولت سے مالا مال کرے (آمین ثم آمین)

ایک دوست کے تاثرات

۷۰۰۔ا راجہ محمد افضل خان لکھتے ہیں:۔

کے۔جی۔آر۔اجمیر میں علی عابد ہمارے ساتھ تھے گو ہم سے سینئر تھے وہ دوسرے ہاؤس میں تھے لیکن مسلمان ہونے کے ناطے اکثر ملتے رہتے تھے۔خصوصاً مسجد میں۔اجمیر میں اس وقت کوئی پکی مسجد نہیں تھی۔ایک ٹینٹ میں صفیں وغیرہ بچھا کر اسے مسجد بنا لیا گیا۔علی عابد خود بھی نماز کے پابند تھے اور دوسروں

کو بھی تلقین کرتے تھے۔ ان کا ایک فقرہ مجھے یاد ہے کہا کرتے تھے ہم ہندوؤں کے اسکول میں ہیں۔ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ مسلمانوں کے نام پر حرف آئے۔

علی عابد ہم جونیئر مسلمان لڑکوں کو صلاح و مشورہ بھی دیا کرتے تھے ۱۹۴۷ء میں اجمیر اسکول کے ہیڈ بوائے سعید نامی ایک کیڈٹ آفیسر تھے۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد وہ ہوائی جہاز سے دہرہ دون اکیڈمی یا کہیں اور چلے گئے تو مسلمان لڑکوں کی قیادت عملاً علی عابد اور سید اکبر نامی دو سینئر لڑکوں کے ہاتھ میں تھی۔ ہم ۲ دسمبر تک وہاں رہے یہ مشکل زمانہ تھا۔ ہندو لڑکے ہم پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ مسجد کے مولوی صاحب اجمیر ہی کے تھے اور انہوں نے وہیں رہنا پسند کیا تھا۔ اسٹاف میں سے لے دے کے ایک ڈرل انسٹرکٹر دگل بادشاہ کے والد) ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے والے رہ گئے تھے تین چار ماہ کے اس عرصہ میں علی عابد نے بڑی جرأت اور فراست سے مسلمان لڑکوں کو سنبھالا ان کے حوصلوں کو بلند رکھا اور ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کی۔ اس زمانے میں مجھے اندازہ ہوا کہ علی عابد بڑے نمازی ہی نہیں ہیں۔ بڑے عملی انسان ہیں۔ پکے مسلمان اور پکے پاکستانی۔ جتنے دیکھنے میں شاندار تھے۔ اتنے شاندار کردار کے اعتبار سے بھی تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد اے ایس سی کے تاثرات اور یادیں

جنگ ستمبر و دسمبر کے شہیدوں کا یہ تذکرہ لکھتے ہوئے ایک سوال مسلسل ہمارے ذہن میں رہا ہے۔ کہ وہ جنہوں نے پاکستان کے لئے جانیں دیں وہ اپنے بچپن میں، اپنے زمانہ طالب علمی میں پاکستان کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ اور ان کے جذباتی رویے کیا تھے۔ اس سلسلہ میں ہم میجر علی عابد شہید کے کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں تھے جو ان کی زندگی کے اس پہلو پر کچھ روشنی ڈال سکے۔

اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت خوش قسمتی سے ہماری ملاقات ۱۶۸۸ لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد اے ایس سی سے ہوگئی۔ جو کے۔جی۔آر کالج اجمیر میں ۴۷-۱۹۴۶ء میں علی عابد کے ہم عصر تھے ہماری درخواست پر کرنل رشید نے یہ واقعات و تاثرات لکھ کر بھیجے۔

آدمی زندگی میں بے شمار آدمیوں سے ملتا ہے۔ اسکول اور کالج کے ساتھی بھی ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے جو صحیح معنوں میں متاثر کرے۔ جس کی یاد برسہا برس کے بعد دل میں تازہ رہے۔ اور جو خود ایک آئیڈیل بن جائے علی عابد حسین شہید ایک ایسے ہی گوہر یگانہ تھے۔

کے جی اے ار اجمیر میں، میں ۱۹۴۶ء میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت میں نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا وہ مجھ سے سینئر تھے۔ ہاؤس بھی دوسرا تھا۔ وہ چیٹ وڈ ہاؤس میں تھے اور میرا ہاؤس جیکب تھا لیکن چونکہ شخصیت کے لحاظ سے وہ وہاں کے ممتاز ترین کیڈٹس میں سے تھے۔ اس لئے ان پر نظر پڑتی رہتی تھی سب مسلمان لڑکے جمعہ کے جمعہ حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ پر جمعہ کے نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا اور یوں بھی جب کبھی سب مسلمان لڑکے کسی تہوار یا چھٹی کے دن یکجا ہوتے تو علی عابد سب سے ممتاز نظر آتے ان کی سوچ کا انداز بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ اس زمانے میں ان مسئلوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ جن کا عام لڑکوں کو شعور بھی نہیں تھا۔

اس امر کی وضاحت میں اگست ۱۹۴۷ء کے ایک واقعہ سے کروں گا۔ پاکستان بن چکا تھا یا ابھی چند دن کی دیر تھی۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن یہ خوب یاد ہے کہ علی عابد ریڈنگ روم میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ غالباً سول اینڈ ملٹری گزٹ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔ رشید، بڑا غضب ہو گیا بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ بڑا برا ہوا۔ یہ سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی چونکہ ہم مسلمان لڑکے پاکستان بننے کی خبروں سے بہت خوش تھے۔ اور ہم لوگوں میں خاصا جوش پھیلا ہوا تھا۔ اب جو انہوں نے بڑے فکرمند اور غم و غصے کے لہجے میں یہ فقرے کہے تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا پاکستان بن رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں بڑا ظلم ہوا۔ انہوں نے کہا یہ نقشہ دیکھو۔ اس میں پنجاب کی تقسیم دکھائی گئی ہے یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ضلع گورداسپور انڈیا میں شامل دکھایا گیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہوئی ہے ریڈکلف نے بے ایمانی کی ہے۔

اس زمانے میں، میں ساتویں درجے میں تھا خود انگریزی اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ ان کے سامنے کھلا پڑا تھا اور وہ نقشہ پر انگلی رکھے بار بار کہہ رہے تھے۔ یہ بڑا ظلم ہوا ہے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۴۷ء کے اواخر کا ہے۔ اجمیر سے ہمارے نکالنے کے انتظامات ہو رہے تھے۔ شہر میں کشیدگی تھی۔ ہر روز خبریں آتی تھیں کہ آج ہندو مسلمانوں پر حملہ کریں گے۔ ایک روز شام کو مسجد میں مسلمان لڑکے نماز کے لئے جمع ہوئے تو سیڈ بوائے سعید رونے لگا کہ ہماری خیر نہیں ہندو ہمیں مار ڈالیں گے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس موقعہ پر علی عابد پرسکون رہے۔ انہوں نے کہا ڈرنے سے خطرہ کم نہیں ہوگا۔ بے عزتی علیحدہ ہوگی۔ مل جل کر رہیں، حوصلہ رکھیں۔ اور چوکنے رہیں،" وہ تو خدا بھلا کرے کمانڈانٹ میجر آر سومدت کا کہ ان کی ذاتی توجہ دلچسپی اور شفقت سے ہم ہر طرح محفوظ رہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ علی عابد کے رویے اور حوصلے نے ہماری ہمت بڑھائے رکھی۔

اجمیر سے ملٹری کالج جہلم آنے کے بعد اور پھر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ان کی شہادت تک کسی نہ کسی طرح ان سے میرا تعلق قائم رہا۔ ۱۹۶۰ء میں بنوں میں ۱۴ پیرا بریگیڈ میں ایک ساتھ نوکری بھی کی۔ بڑے اچھے تعلقات رہے۔ ۱۹۶۴ء کے اواخر میں کھاریاں میں ملاقات رہی آخری بار میں نے انہیں اگست ۱۹۶۵ء میں دیکھا۔ پھر سنی تو ان کی شہادت کی خبر سنی۔

میں بہت مشکل آدمی پسند ہوں۔ جب تک کوئی واقعی کھرا نہ ہو میں اس کو نہیں مانتا۔ لیکن علی عابد کو ایک عظیم انسان سمجھتا ہوں۔ اور ان سے اتنا متاثر ہوں کہ اب بھی جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں تو علی عابد کے لئے دعا ضرور کرتا ہوں کہ یا اللہ عابد کے درجات جنت الفردوس اور بلند کرنا۔ وہ اس کردار اور اس صلاحیت کے افسر تھے کہ اگر زندہ رہتے تو انتہائی بلندیوں تک پہنچتے لیکن خدا کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

نائب صوبیدار پائندہ خان شہید

بلوچ رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ــــــــــ ۲۲ اپریل ۱۹۳۳ء

جائے پیدائش ــــــــــ کریالہ۔ سرائے عالمگیر

عہدہ ــــــــــ نائب صوبیدار

تاریخ شہادت ــــــــــ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۵ء

مقام شہادت ــــــــــ کھیم کرن

مدفن ــــــــــ کریالہ (کھاریاں)

نائب صوبیدار پائندہ خان شہید

"بیٹے اتنے رات گئے گھر نہ آیا کرو۔"

"کیوں بے جی۔ کیا ہوا؟"

"بیٹے رات کو چور چکار کا خطرہ رہتا ہے یہ راستہ ٹھیک نہیں۔"

"پچھلے دنوں چوروں نے ایک بندے کو لوٹ کر مار ڈالا۔"

"بے جی، آپ فکر نہ کریں ان بازوؤں میں آپ کی دی ہوئی قوت ہے۔ جسے ایک گھونسہ رسید کروں گا پھر وہ زمین سے اٹھے گا نہیں۔ ماں جی۔ تمہارے پائندہ خان نے دشمن سے ڈرنا سیکھا نہیں۔"

دسمبر ۱۹۵۵ء کی ایک سرد شام یہ گفتگو کریالہ گاؤں کے ایک گھر میں ہو رہی تھی کونے میں ایک طرف کو رکھی لالٹین کی زرد روشنی کچے پکے گھر کو پُراسرار بنا رہی تھی یہ بوڑھی خاتون جو اپنے نوجوان بیٹے کو سمجھا رہی تھیں پائندہ خان کی والدہ ماجدہ تھیں۔

نوجوان پائندہ کو اپنے زور بازو پر اعتماد بیجا نہ تھا وہ ۱۹۵۴ء میں باکسنگ میں آرمی کلر لے چکا تھا اور فوج کا بلکہ ملک کا مانا ہوا باکسر تھا۔ اسی زور بازو کا اظہار پائندہ نے دس برس بعد ۱۹۶۵ء میں کھیم کرن کے میدان کارزار میں کیا اور اب کے جو کلر اس نے لیا اس کی سرخی تا ابد رہیگی۔

وہ نائب صوبیدار پائندہ خان شہید جس نے اس ملک کو پائندہ و تابندہ رکھنے میں اپنی جان کی بازی لگادی اس کی زندگی اور کارنامہ کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

آباؤ اجداد

سرائے عالمگیر سے مشرق کی طرف دو میل دور جی ٹی روڈ سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ایک پرانا گاؤں ہے کربالہ۔ یہی پائندہ خان کا آبائی گاؤں ہے اٹھارویں صدی کے شروع میں سکھوں کے دور حکومت میں پائندہ خان کے پڑدادا راجہ کریم خان کے والد کشمیر سے نقل مکانی کرکے یہاں آباد ہوئے۔ انہی نے اس گاؤں کو آباد کیا۔ راجہ کریم خان نے کربالے میں مسجد بنوائی اور کنواں کھدوایا ان کی یہ دونوں یادگاریں اب بھی موجود ہیں اور ان کے نام سے موسوم ہیں۔

پائندہ خان کے دادا راجہ فضل خان کاشتکار تھے ان کے چار بیٹوں کالے خان، سید علی فتح خان اور آصف علی نے عزت سے فوجی نوکری کی اور گاؤں میں سر اٹھا کے چلے۔

کالے خان پائندہ خان کے والد تھے وہ ۱۹۲۲ء میں راجپوتانہ رائفلز میں بھرتی ہوئے تھے ابھی لانس نائیک تھے اور سات سال نوکری تھی کہ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے والدین کے کہنے پر نوکری چھوڑ دی۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دو بھائی تلے اوپر فوت ہو گئے تھے اور والدین اور زمین کی دیکھ بھال کرنے والا گھر پر کوئی اور نہیں تھا۔

کالے خان نے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۵ء تک ملٹری کالج کے کوارٹر ماسٹر اسٹور میں بحیثیت سویلین ملازمت کی۔ اس وقت جمعدار (بعد کو میجر) منگا خان کوارٹر ماسٹر تھے۔ منگا خان ان کے کام اور ایمانداری کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ کالے خان کو اللہ نے چھ بیٹے دیئے سب سے بڑے بیٹے کا نام محمد شریف ہے۔ دوسرے بیٹے دوسری جنگ عظیم میں کام آئے۔ تیسرے بیٹے دلاور خان زمینداری کرتے ہیں چوتھے نائب صوبیدار پائندہ خان شہید تھے۔ پانچویں بیٹے اورنگزیب خان ایم ای ایس کھاریاں میں ملازم ہیں اور سب سے چھوٹے اور چہیتے صاحبزادے نائب صوبیدار

ٹکا خان ہیں جو انجینیئرز میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

پائندہ خان کی پیدائش

پائندہ خان اپنے آبائی گاؤں کربالہ میں ۲۰ اپریل ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے جب بڑے ہوئے تو اپنے پڑدادا کریم خان کی بنوائی ہوئی مسجد میں قرآن شریف پڑھنے بیٹھے اس زمانے میں مولوی لطیف مسجد کے خطیب تھے پائندہ نے انہی سے قرآن شریف پڑھا۔ کربالے کے پرائمری سکول میں داخل کر دیئے گئے اسی سکول سے انہوں نے پرائمری کی پانچ جماعتیں پاس کیں۔

ملٹری کالج میں پہلا داخلہ

چونکہ پائندہ خان کے والد کالے خان ملٹری کالج ہی میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے ۱۹۴۵ء میں پائندہ کو کالج میں داخل کرایا۔ لیکن یہاں زیادہ عرصے نہیں رہے۔ انہیں دوسرے چند مسلمان لڑکوں کے ساتھ تبادلے میں اجمیر بھیج دیا گیا۔ دو برس وہاں گزارے پاکستان بننے پر دوسرے مسلمان لڑکوں کے ساتھ وہ دسمبر ۱۹۴۷ء کے اواخر میں واپس جہلم پہنچے۔

ملٹری کالج میں دوسرا داخلہ

اس طرح ملٹری کالج میں پائندہ خان دوسری بار ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو داخل ہوئے۔ اور ۴۸۳ نمبر پایا۔ اجمیر سے ان کے ساتھ آنے والوں میں ۶۶۸ میجر گل بادشاہ ۶۶۳ لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس ستارۂ جرأت ۶۶۰ میجر علی عابد حسین شہید اور ۶۲۳ لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین وغیرہ تھے۔

ملٹری کالج میں پائندہ خان کی کارکردگی

کالج میں ہمیں پائندہ خان کا ایک ہی تعلیمی نتیجہ مل سکا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں وہ جماعت ہفتم

کی ڈی سیکشن میں تھے ان کے نمبروں کی تفصیل یہ ہے۔ سائنس ۶۶۔ اُردو ۳۹۔ حساب ۵۱ تاریخ ۲۱۔ جغرافیہ ۵۰۔ شہریت ۵۰۔ دینیات ۵۶ کل نمبر سات سو میں سے ۳۴۹ تھے اور ۲۶ لڑکوں میں ان کی آٹھویں پوزیشن تھی جو کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔

لیکن پائندہ خان کا اصل میدان پڑھنے کا کمرہ نہیں کھیل کا میدان اور خاص طور پر باکسنگ کا رنگ تھا اسی میدان میں انہوں نے شہرت حاصل کی تھی اور کالج کا نام بھی روشن کیا تھا۔

پائندہ شہید کے بڑے بھائی محمد شریف لکھتے ہیں۔

پائندہ کو خدا نے غیر معمولی جسمانی طاقت دی تھی مکے بازی میں اس کا جواب نہیں تھا اس کا مکا لوہے اور پتھر کا مکا تھا جس کے پڑتا وہ یاد کرتا۔ پائندہ نے بے شمار انعامات جیتے۔ اس وقت ہمارے یہاں اس کے جیتے ہوئے تیس بتیس کپ اور ٹرافیاں پڑی ہیں۔ لیکن باکسنگ میں پہلوانی میں ضرورت سے دلچسپی سے اس کو نقصان پہنچا۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں کالج میں جی ایچ کیو سے پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کی افسری کے لئے موزونیت جانچنے کے لئے ایک ٹیم آئی۔ اس سے ذرا پہلے پنڈی میں باکسنگ کے مقابلے تھے انہوں نے اپنے افسر سے کہا مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے اس لئے میں نہیں جانا چاہتا۔ ان کے افسر نے جواب دیا۔ نہیں نہیں تم پنڈی ضرور جاؤ یہ مقابلہ بہت ضروری ہے تم جیت آؤ ٹیسٹ کا بندوبست میں کرلوں گا۔ پائندہ پنڈی سے تو مقابلہ جیت آیا لیکن افسوس کہ یہاں کے ٹیسٹ میں فیل ہو گیا اور اس طرح پائندہ کو کالج چھوڑنا پڑا اور کالج کے قانون کے مطابق وہ اپنے والد کی یونٹ ۱/۱ راجپوتانہ رائفلز میں جواب ۷ بلوچ بن چکی تھی بھرتی ہو گیا۔

پائندہ خان ۷ بلوچ میں

بلوچ رجمنٹ میں بھرتی ہو کر پائندہ خان نے اپنی باکسنگ کی کارکردگی کو اور چمکایا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء میں پائندہ خان کو آرمی کا باکسنگ کلر دیا گیا ۱۹۶۲ء میں وہ بحیثیت نائب صوبیدار کوئٹہ میں انسٹرکٹر بن گئے اس وقت تک وہ برابر آرمی کی طرف سے باکسنگ میں حصہ لیتے رہے۔

واقعہ شہادت

پائندہ خان کی شہادت کی تفصیلات کے لئے ہم ان کے بھائی نائب صوبیدار ٹکا خان سے رجوع کیا تو انہوں نے کہا:۔

بھائی پائندہ خان ۷ بلوچ کی زیر کمان کھیم کرن کے علاقے میں لڑ رہے تھے۔ ۲۱ ستمبر کو ان کو اپنی پلاٹون کے ساتھ آگے بڑھ کے ایک گاؤں ٹھٹھی جمل سنگھ پر حملہ کرنے کا حکم ملا۔ اپنی پلاٹون کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ اطلاع یہ تھی کہ یہ گاؤں دشمن خالی کر گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ دشمن گاؤں میں موجود تھا اور پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ جب ان کی پلاٹون دشمن کے فائر کی زد میں آئی تو دشمن نے فائر کھول دیا۔ جب فائر کھلا تو انہوں نے خود بچنے کے بجائے اپنی پلاٹون کو بچانے کی تگ و دو شروع کی۔ اسی کوشش میں سامنے سے سر پر برسٹ لگا اور وہیں گر کر فوراً شہید ہو گئے۔ یہی حال ان کے ساتھی پلاٹون کمانڈر نائب صوبیدار نذر محمد کا ہوا دونوں بڑی جرأت سے آگے بڑھتے ہوئے شہید ہوئے۔ دشمن نے دونوں کو اسی طرح ٹھٹھی جمل سنگھ سے باہر ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا اور ایک باڑ لگا دی۔ فائر بندی کے بعد جب قیدیوں اور لاشوں کا تبادلہ ہوا تو بھائی کے دوست اور ساتھی چکوال کے صوبیدار محمد خان جا کر ان کی لاش کریالے لائے۔ پائندہ خان شہید کو کریالے میں دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کے ساتھ ہی ان کے والدین کی قبریں بھی ہیں۔

صوبیدار ٹکا خان نے مزید کہا کہ ان کی شہادت کے چند سال بعد میں ان کی پلاٹون کے ایک سپاہی سے ملا تو اس نے مجھے بتایا کہ جب پلاٹون کو حملہ کا حکم ملا تو تنظیم گاہ پر جمع ہونے سے پہلے پائندہ خان نے اپنے آدمیوں کو چائے وغیرہ پلائی اپنے ہاتھ سے مگ دیئے اور کہتے جاتے حوصلہ رکھو۔ مزے سے چائے پیو اور پھر اطمینان سے لڑو۔ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اس سپاہی کا کہنا ہے کہ جب یکایک فائر آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ بکھر جاؤ اور پوزیشن لے لو تھوڑی دیر کے بعد پھر آگے بڑھے اتنے میں ایک برسٹ آیا اور شہید ہو گئے اگر چاہتے تو اپنی جان بچانے کے لئے چھپ سکتے تھے

یہ ان کی شان تھی کہ سب برسٹ لگا تو سر میں لگا چونکہ سیدھے آگے بڑھ رہے تھے۔

اسی طرح بھائی کی جرأت اور حوصلے کی داد ان کی پلٹن کے ایک میجر صاحب نے بھی دی۔ ۱۹۷۳ء میں جب ان سے کھاریاں کیمپ میں ملا تو یہ لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ ۶۵ء میں ۷ بلوچ میں میجر تھے میں نے پوچھا سر آپ نائب صوبیدار پائندہ خان کو جانتے ہوں گے کہنے لگے خوب جانتا ہوں آپ کون ہیں۔ میں نے کہا میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں تو بہت خوش ہوئے اور دیر تک پائندہ خان کی یونٹ میں اور میدان جنگ میں کارکردگی کی تعریف کرتے رہے کہنے لگے۔ پائندہ خان بہت اچھے باکسر تھے۔ لیکن اس سے بھی اچھے مجاہد ثابت ہوئے۔ ملک کو ایسے جیالوں پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

شہید کی شخصیت و کردار

پائندہ خان شہید کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم نے شہید کے بڑے بھائی راجہ محمد شریف کو تکلیف دی۔ شہید کے والدین کے انتقال کے بعد وہی اس گھر کے بڑے ہیں اور بڑے بھائی کی حیثیت سے پائندہ شہید کو بھی اندر باہر سے خوب جانتے ہیں۔ راجہ شریف صاحب سے یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ راجہ صاحب پہلے تو آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے ؟

جواب:۔ جیسا کہ میں نے آپ کو لکھوا کر بھیجا تھا میرا نام محمد شریف ہے پائندہ میرا چھوٹا بھائی تھا میں ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا ۱۸ سال توپ خانے میں نوکری کی ۱۹۵۵ء میں لانس حوالدار کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ اب اکیلا مسافر ہوں۔ بہت دکھی بندہ ہوں۔

سوال:۔ خیر باشد کیا ہوا ؟

جواب:۔ ایک بیٹا تھا اسے بڑے شوق سے پڑھایا جب بنک آفیسر ہوا ایک بڑے گھرانے میں شادی ہوئی اور تین سال بعد عین عالم جوانی میں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا اب اکیلا رہ گیا ہوں۔

آپ نے یاد کیا تو بھائی کی یاد لئے آ گیا۔

سوال :۔ اللہ مالک ہے راجہ صاحب یہ سب جان و مال اس ملک کی امانت ہے آپ کچھ پائندہ خان شہید کے کردار کے بارے میں بھی بتایئے؟

جواب :۔ پوچھیئے۔ آپ سوال کرتے جائیں۔

سوال :۔ مثلاً یہ فرمایئے پائندہ کا رویہ اپنے والدین کے ساتھ کیسا تھا؟

جواب :۔ والدین کا بہت خدمت گزار بندہ تھا۔ شہادت تک والدین کے ساتھ رہا گھر علیحدہ نہیں کیا کہتا تھا جب تک ان کا سایہ میرے سر پر ہے مجھے کسی اور سائے کی ضرورت نہیں۔

سوال :۔ آپ کے ساتھ کیسے تھے؟

جواب :۔ ۱۹۵۷ء میں میرا گھر بارشوں سے گر گیا تھا۔ پائندہ کو خبر ہوئی تو میرے بغیر مانگے مجھے دو سو روپے منی آرڈر بھجوا دیئے اسی طرح جب میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے لگا تو میری بیٹی کا جہیز زیادہ تر پائندہ خان ہی نے بنایا اور خوشی سے بنایا۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ بھائی تو بھائی رشتہ داروں کے بھی کام آتا تھا۔

سوال :۔ اس کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب :۔ مثلاً ۱۹۶۲ء میں ہمارے چچا زاد بھائی کے مکان کا ایک حصہ گر گیا۔ پائندہ خان نے اسے بھی دو سو روپے بھیجے اور کبھی واپس نہیں مانگے۔ دو سو اس زمانے میں خاصی رقم تھی۔

سوال :۔ پائندہ خان کی کسی دلیری جرأت کا کوئی واقعہ آپ کو یاد ہے؟

جواب :۔ سب سے بڑی بات تو اس کی باکسنگ ہے اچھا باکسر وہی ہوتا ہے جس میں جرأت ہو، وہ تو آرمی کا کلر ہولڈر تھا۔

شہید کو خدا نے بڑی طاقت دی تھی۔ لیکن اس طاقت سے اس نے غلط کام نہیں لیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ اگر وہ چاہتا تو دشمن کے فائر سے اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن اس نے پہلے دوسروں کی جان بچانا ضروری سمجھا۔ بحیثیت پلاٹون کمانڈر کے اسے کرنا بھی یہی چاہیئے

تھا۔ ایک واقعہ مجھے اور یاد آرہا ہے۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ یہ غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ وہ رات کو گھر آیا ان دنوں رات کو ڈاکو واردات کرتے رہتے تھے۔ والدہ نے کہا بیٹے رات کو گھر نہ آیا کرو خطرہ ہوتا ہے پائندہ ان دنوں بھرپور جوان تھا۔ بائسنگ میں آرمی کا کلر ہولڈر۔ ہنس کر پنجابی میں کہنے لگا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ماں تو نے جو دودھ مجھے پلایا ہے اور جو مکھن کھلایا ہے اس کا تماشا تم کسی دن دیکھنا جس کے مکا مارو گا وہ پھر زمین سے اٹھے گا نہیں۔

شہید کا اپنے اوپر اعتماد غلط نہیں تھا اس کی دلیرانہ شہادت اس کا زندہ ثبوت ہے۔

چھوٹے بھائی کی یادیں

سوال:۔ صوبیدار صاحب۔ پہلے تو اپنے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب:۔ میرا نام ٹکا خان ہے۔ انجینئرز میں نائب صوبیدار ہوں۔

سوال:۔ پائندہ خان آپ کے بڑے بھائی تھے؟

جواب:۔ میں اپنے چھ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں مجھ سے بڑے اورنگ خان ہیں ان سے بڑے بھائی پائندہ خان شہید تھے۔

سوال:۔ پائندہ خان شہید اور آپ کی عمر میں کتنا فرق ہے؟

جواب:۔ بھائی پائندہ کا سال پیدائش ۱۹۳۲ء ہے میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس طرح چار پانچ سال کا فرق بنتا ہے۔

سوال:۔ یہ فرق تو زیادہ نہیں تو پھر آپ دونوں نے کچھ وقت ساتھ گزارا ہوگا۔

جواب:۔ کچھ وقت کیا میں نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا۔ وہ ۱۹۴۵ء میں اجمیر کے جی۔ آر میں گئے تھے۔ ان کے جانے تک تو ہم دونوں ایک گھر میں رہتے تھے۔

واپس آ گئے سے دسمبر ۱۹۴۰ء میں ملٹری کالج میں واپس آئے۔ ہمارا گاؤں کریالہ چونکہ ملٹری کالج سے چند میل کے فاصلے پر ہے اس لئے ان کے کالج میں آنے کے وقت سے ۱۹۵۰ء تک تقریباً ہر روز ملنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں ان کی شہادت تک ہم دونوں کا گھر ایک ہی تھا۔ دوسرے بھائی اپنے اپنے گھروں میں الگ رہتے تھے لیکن ہم دونوں ایک رہے۔

سوال:۔ بہت خوب، تو پھر آپ اپنے شہید بھائی کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا سکیں گے۔

جواب:۔ فرمائیے۔

سوال:۔ آپ کے ذہن میں شہید بھائی کی سب سے پہلی اور سب سے دلچسپ یاد کون سی ہے؟

جواب:۔ سب سے پرانی اور سب سے زیادہ دلچسپ یاد سو تک گنتی گننے اور مٹھائی کھانے کی ہے۔

سوال:۔ ذرا وضاحت کیجئے؟

جواب:۔ تفصیل اس بات کی یہ ہے کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے والد کالے خان فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ملٹری کالج میں کوارٹر ماسٹر اسٹور میں سویلین سٹور مین کے طور پر ملازم ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں منگا خان صاحب کوارٹر ماسٹر تھے۔ والد بڑے محنتی اور فرض شناس تھے۔ صبح سویرے کالج جاتے اور عموماً مغرب کی نماز کے وقت یا اس کے بعد گھر واپس آتے تھے۔ لیکن کبھی خالی ہاتھ نہیں آتے تھے، مٹھائی، پھل، کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ضرور لاتے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق ہم تینوں بھائی یعنی میں اور اورنگ زیب اور پائندہ خان مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھا کر باری باری ایک سے سو تک گنتی گنتے یا پہاڑے دہراتے۔ میں دوسری میں تھا۔ اورنگ زیب تیسری میں اور بھائی پائندہ کریالہ کے پرائمری سکول کی چوتھی میں تھے۔ جس بھائی کی گنتی کے دوران ابا جی گھر میں قدم رکھتے تھے۔ اس کو باقی دو بھائیوں سے زیادہ حصہ ملتا تھا۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھے گنتی دہرانے میں کچھ دیر زیادہ لگتی تھی۔ شاید اس وجہ سے ابا جی اکثر میری باری کے دوران گھر میں قدم رکھتے تھے۔ اس وقت تو میں خوش ہوتا تھا کہ میری جیت بار بار ہوتی ہے لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ بھائی پائندہ خان جان لوجھ

کر اپنی گنتی تیزی سے ختم کر دیتے تھے تاکہ مجھے یا اورنگ زیب کو زیادہ حصہ ملے۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اپنے بھائیوں بلکہ تمام برادری کے ساتھ کوشش کر کے بھلائی کرنا تمام زندگی بھائی پائندہ کا طریقہ رہا۔ اس زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا جو مجھے اب بھی یاد ہے۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ جیتنے کی خواہش ان کے اندر بچپن سے تھی، کشتی، کبڈی، کسی قسم کا مقابلہ ہو ان کی انتہائی کوشش ہوتی کہ وہ جیتیں۔ اور کامیاب ہوں۔ چونکہ وہ بچپن میں بھی اپنی عمر کے حساب سے تنو مند اور مضبوط تھے اس لئے عام طور پر ان کے عمر والے لڑکے ان سے ڈر کر رہتے تھے نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ ان کے ایک ساتھی نے انہیں چیلنج کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ پانچویں درجے میں تھے۔ ان کو تاب کہاں، فوراً اس سے گتھم گتھا ہو گئے اور اس کی اچھی خاصی پٹائی کی۔ یہاں تک کہ اس لڑکے کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا وہ اپنے گھر گیا تو اپنی ماں کو ساری بات بتائی۔ اس کی ماں شکایت کرنے ہمارے گھر آئیں ہماری والدہ ہمیں کبھی نہیں مارتی تھیں اور اگر مارتی تھیں تو جھگڑے فساد اور چوری پر، وہ بھی سخت۔ چنانچہ جب ہماری والدہ کو معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئیں شام کو پائندہ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس وقت والدہ اندر کوٹھے میں تھیں۔ ہمارے صحن میں ایک طرف ہمارے بڑے بھائی دلاور کے کبوتروں کی کھمیل تھی۔ تین چار فٹ کا گڑھا تو ہو گا۔ پائندہ خان چپکے سے اس میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ رات پڑی تو ہم نے انہیں ڈھونڈنا شروع کیا۔ نہ ملنا تھا نہ ملے بڑی پریشانی ہوئی سب لوگ پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ کہاں ڈھونڈا جائے۔ دروازے کے باہر سب لوگ جمع تھے۔ اور باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ہمارے چچازاد بھائی عطاء اللہ نے کہا ذرا کھمیل میں تو دیکھیں بھائی پائندہ نے یہ بات سن لی اور چپکے سے نکل کر چارے کے گٹھوں میں چھپ گئے والدہ کو بڑی پریشانی تھی۔ وہ دروازے پر بیٹھے تھے کہ رات کو گیارہ بجے کے وقت دروازہ پر ہلکی دستک

ہوئی والد نے پوچھا کون ہے وہ آہستہ سے بولے میں پائندہ پوچھا کہاں چلا گیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہیں نہیں تھا پھر کہا ماں جی سے معافی دلوائیں وہ بہت ماریں گی۔ آئندہ کبھی نہیں لڑوں گا۔ والد دل میں تو خوش ہوئے کہ لڑکا مل گیا لیکن بظاہر تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا۔ صبح کو انہوں نے والدہ سے معافی دلوادی بعد کو ہمیں پوری کہانی معلوم ہوئی تو ہم انہیں اکثر چھیڑا کرتے تھے کہ کبوتروں کی گھمیل میں مزہ تو بہت آیا ہوگا اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری والدہ کی تربیت کیسی تھی۔ وہ ان پڑھ تھیں لیکن ہماری تربیت انہوں نے بہت اچھی کی۔ اس عمر میں آکر مجھے ان کی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔

سوال:۔ ان کے ملٹری کالج کے زمانے کا کوئی واقعہ یاد ہے۔ آپ کو؟

جواب:۔ دسمبر ۱۹۴۷ء اجمیر سے ملٹری کالج واپس آئے تھے۔

سوال:۔ کس ہاؤس میں تھے؟

جواب:۔ اس ہاؤس میں جو مین گیٹ کے ساتھ ہے۔ پہلے اس کا نام کچھ اور تھا اب وہاں شیر شاہ لکھا ہے۔

سوال:۔ اس زمانے کا کوئی واقعہ؟

جواب:۔ کوئی واقعہ تو نہیں لیکن ایک دلچسپ بات ضرور ہے۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ وہ یہ کہ میں اس زمانے میں سرائے عالمگیر کے ڈی۔ بی مڈل اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ روز صبح سویرے میں کریالہ سے آتا اور کالج کے سامنے سے گزرتا اس وقت بھائی پائندہ دیوار سے لگے کھڑے ہوتے میں وہ پڑیا جو والدہ نے دی ہوتی ان کے حوالے کرتا اور وہ اسے جلدی سے سر پہ رکھ ٹوپی میں چھپا لیتے۔

سوال:۔ ٹوپی کے اندر؟

جواب:۔ جی ہاں۔ چونکہ غالباً اس طرح باہر سے کھانے پینے کی کوئی چیز منگوانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے وہ یہ ترکیب کرتے تھے۔

سوال :۔ ہر روز؟

جواب :۔ میں تو ہر روز ہی کچھ نہ کچھ لاتا تھا خواہ گڑ کی ڈلی ہی کیوں نہ ہو لیکن کبھی کبھی وہ موجود نہیں بھی ہوتے تھے۔

سوال :۔ تو؟

جواب :۔ اس صورت میں، میں یہ کرتا کہ دیوار کے قریب ٹاہلی کا ایک بڑا درخت تھا اس کی جڑ کے قریب ایک بڑا سا سوراخ تھا میں وہ پڑیا وہاں رکھ دیتا۔ وہاں ایک آنہ پہلے سے پڑا ہوتا وہ میں اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا۔ یہ میرا جیب خرچ تھا۔

سوال :۔ جیب خرچ؟

جواب :۔ یہ ایک آنہ بھائی پائندہ رکھتے تھے یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلا۔

سوال :۔ میں صرف معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ وہ ٹوپی کیسی ہوتی تھی؟

جواب :۔ آرمی ٹائپ بیری۔ گہرے نیلے رنگ کی۔

سوال :۔ براہِ کرم بات کو جاری رکھیئے۔ پھر کیا ہوا؟

جواب :۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے کالج چھوڑا اور بلوچ رجمنٹ میں بھرتی ہو گئے پھر میرا ان کا ساتھ رسالپور میں ہوا۔

سوال :۔ اس کی تفصیل کیا ہے؟

جواب :۔ ۱۹۵۷ء میں، میں رسالپور میں انجینئرز میں بھرتی ہوا۔ اس زمانے میں بھائی پائندہ نائیک تھے اور ملٹری کالج آف انجینئرنگ رسالپور میں بارودی سرنگوں کے بارے میں تین ماہ کا کورس کر رہے تھے میں اس زمانے میں سگریٹ پینے لگا تھا۔ بھائی نے خود کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بار بار تاکید سے کہا۔ ٹکا سگریٹ چھوڑ دو یہ عادت بُری ہے وہ جس پیار سے سمجھاتے تھے اس سے مجھے غیرت آئی اور میں نے سگریٹ چھوڑ دیا۔ کم از کم چھ مہینے کے لئے۔

سوال :۔ صرف چھ مہینے تک ؟

جواب :۔ ہاں پہلے تو سن لیجئے میں نے واقعی چھ مہینے سگریٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔ بھائی بہت خوش ہوئے وہ روزانہ کنٹین پر مجھے آدھ سیر دودھ پلایا کرتے تھے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عادت کو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ سگریٹ کی عادت کو چھوڑنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے چنانچہ چھ مہینے کے بعد میں ان سے چھپا کر پھر سگریٹ پینے لگا۔

سوال :۔ معاف کیجئے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ آپ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں اور میں نے آپ کو سگریٹ پیش نہیں کیا۔ ابھی منگواتا ہوں۔

جواب :۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں۔

سوال :۔ کیوں ؟

جواب :۔ اس لئے کہ اب میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکا ہوں۔ بھائی کی شہادت کے بعد مجھے ایک دن یکایک خیال آیا کہ بھائی تو یہی سمجھتے ہوئے شہید ہوگئے کہ میں اس بری عادت سے چھٹکارا پا چکا ہوں۔ اب اگر میں سگریٹ پیتا رہوں تو یقیناً ان کی روح کو تکلیف ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سگریٹ کی ڈبیہ جیب سے نکال کر پھینک دی وہ دن اور آج کا دن اللہ کا شکر ہے کہ سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

سوال :۔ کبھی خواہش بھی نہیں ہوتی ؟

جواب :۔ خواہش ہو کیسے بس ایک بار ارادہ جو کر لیا۔ پھر بھائی کی یاد بیچ میں ہے میں ان کی روح سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔

سوال :۔ رسالپور کی کوئی اور بات ؟

جواب :۔ وہاں بہترین ریکروٹ کو ایک گھڑی انعام میں ملتی تھی۔ بھائی مجھ سے اکثر کہتے ٹکا ! اگر تم گھڑی لے لو تو میں بھی تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔" افسوس میں ان کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ ریکروٹی کے بعد جب بھی ملتے یہی کہتے فرسٹ انگلش، فرسٹ میپ ریڈنگ

وغیرہ جلدی جلدی کر لو تاکہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

سوال:۔ شہید کی باکسنگ کی بڑی شہرت سنی ہے اس سلسلے میں کوئی واقعہ؟

جواب:۔ بھائی ۱۹۵۴ء میں آرمی باکسنگ کلر لے کر پاکستان ٹیم کے ساتھ باہر جانے کے لیے منتخب ہو گئے تھے۔ باہر جانے کے لئے کپڑے تک سل گئے تھے۔ پھر کسی وجہ سے گئے نہیں۔ کراچی میں ۱۹۵۴ء میں ایک آل پاکستان باکسنگ مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے سندھ کے مشہور باکسر محمد علی مکرانی کو ہرایا تھا۔ کراچی میں اس وقت ہمارے ایک پھوپھی زاد بھائی محمد خان ہوتے تھے۔ انہوں نے یہ مقابلہ دیکھا تھا۔ پچاس روپے کا ٹکٹ تھا محمد خان نے ہمیں بتایا کہ بہت سے مکرانی ان کو دیکھنے آئے تھے کہ پائندہ خان کون ہے جو محمد علی مکرانی سے جیتا ہے ایک بوڑھا مکرانی آگے آیا اس نے انہیں میز پر کھڑا کر کے سب کو دکھایا "دیکھو یہ ہے پائندہ خان"

سوال:۔ اب یہ بتائیے کہ کبھی ملٹری کالج کے بارے میں کچھ کہا؟

جواب:۔ خاص طور پر تو نہیں کہا لیکن اپنے بیٹے کے بارے میں بار بار کہتے تھے کہ میں اسے ملٹری کالج میں پڑھاؤں گا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملٹری کالج کو پسند کرتے تھے۔ ملٹری کالج کے بعض دوستوں کا جو افسر بن چکے تھے۔ اکثر تذکرہ کرتے تھے۔

سوال:۔ شہید کے اخلاق و کردار کی کوئی اور خصوصیت؟

جواب:۔ انہیں خاندان کو آگے بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔ مجھے شروع میں پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ اکثر کہتے تھے۔ نہیں پڑھو گے تو پچھتاؤ گے۔ بھائی تو بھائی برادری کے لوگوں کو بھی اوپر اٹھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

بیگم زیب النساء پائندہ خان سے انٹرویو

انسان کو گھر والوں سے بہتر اور زیادہ کون جانتا ہے خصوصاً گھر والی سے زیادہ اس لئے ہم نے نائب صوبیدار پائندہ خان شہید کی بیگم زیب النساء پائندہ خان کو زحمت دی کہ ہمیں اپنے

شہید شوہر کی شخصیت و کردار کے بارے میں کچھ بتائیں۔ ان سے یہ باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟

جواب:۔ آپ حساب لگا لیجئے گا جب ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ شہید ہوئے تو میرا بیٹا جمشید اڑھائی سال کا تھا اور جمشید شادی کے آٹھ سال بعد ہوا تھا۔

سوال:۔ شہید سے آپ کی پہلے سے بھی کچھ رشتہ داری ہوگی؟

جواب:۔ جی ہاں ایک طرح سے چچازاد بھائی سمجھئے۔

سوال:۔ ایک طرح سے کیوں؟

جواب:۔ اصل میں تو وہ میرے والد کے چچازاد تھے میرے والد بھی اس کالج سے وابستہ رہے ہیں۔ اور شہید کے والد راجہ کالے خان نے بھی یہاں ملازمت کی ہے۔

سوال:۔ ذرا اس کی تفصیل بتائیے؟

جواب:۔ میرے والد راجہ علی اکبر اب تو بوریوالہ وہاڑی ضلع ملتان میں رہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ کبھی کالج میں بینڈ ہوتا تھا جب وہ فوج سے حوالداری سے ریٹائر ہوئے تو یہاں کالج میں کچھ عرصہ بینڈ ماسٹر کی خدمت انجام دی۔ شہید کے والد کالے خان بھی یہاں ملازم تھے۔

سوال:۔ صوبیدار شہید نے کبھی آپ سے کالج کی باتیں بھی کیں؟

جواب:۔ انہیں زیادہ نہ پڑھ سکنے کا بڑا ملال تھا اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تو نہ پڑھ سکا بچوں کو ضرور پڑھاؤں گا۔ اکثر اپنے کالج کے ساتھیوں کا ذکر کرتے تھے۔ فلاں افسر ہے۔ فلاں یہ ہے۔ چونکہ خود باکسر رہے تھے کبھی کبھی اپنی باکسنگ کی باتیں بھی کرتے تھے۔ باکسنگ میں ایک آدھ انعام بھی لیا تھا وہ بڑے فخر سے دکھایا کرتے تھے۔ کالج کے دوستوں کو بہت یاد کرتے تھے۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ ایک تو ہمارے گاؤں کربالے ہی کے راجہ محمد افضل ہیں۔ آجکل قطر میں ہیں۔ ان سے ان کی بڑی دوستی تھی۔

سوال :۔ کالج کے بارے میں ان کی کوئی اور بات ؟

جواب :۔ میں نے کہا نا کہ اکثر کالج کی باتیں کرتے رہتے تھے جب سات آٹھ سال بعد جمشید ہوا اور ذرا بڑا ہوا تو ایک نہیں کئی بار کہا میں جمشید کو اپنے کالج میں پڑھاؤں گا۔ بڑا اچھا کالج ہے میری قسمت ہی میں زیادہ پڑھنا نہیں تھا اب جو کچھ ہوں کالج ہی کی بدولت ہوں۔

سوال :۔ اچھا آپ فرمائیے کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کو کیسا پایا ؟

جواب :۔ کیا مطلب ؟

سوال :۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے بحیثیت انسان کے اور بحیثیت شوہر کے شہید پائندہ خان میں کیا کیا خوبیاں دیکھیں ؟

جواب :۔ بڑے اچھے تھے میرے لئے تو بہت ہی اچھے تھے۔

سوال :۔ براہ کرم وہ چند باتیں، واقعات اور معلات بتایئے جس سے پڑھنے والوں کو اندازہ ہو سکے کہ وہ جو میدان جنگ میں جرأت سے شہید ہوا وہ گھر میں کن خوبیوں کا حامل تھا۔ آدمی تو ایک ہی ہوتا ہے جو آدمی گھر میں گھٹیا ہو وہ میدان جنگ میں بڑھیا نہیں ہو سکتا۔ جو آدمی اپنے گھر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور احسان و ایثار کا رویہ رکھتا رکھتا ہے وہی اپنے ملک کے ساتھ اپنے فرض کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے اسی لئے ہم آپ سے آپ کی گھریلو زندگی اور معاملات کی تفصیل پوچھ رہے ہیں۔

جواب :۔ اگر یہ بات ہے تو میں وہ باتیں آپ کو بتاؤں گی جو میں آج تک زبان پر نہیں لائی تاکہ اپنے شوہر کی خوبیوں کو ظاہر کر سکوں۔

سوال :۔ ہاں بے تکلفی سے بات کیجئے ہمارا مقصد شہید کے کردار پر روشنی ڈالنا ہے ؟

جواب :۔ مثلاً اکثر ہوتا وہ گھر چھٹی آتے تو کپڑے وغیرہ لاتے سب کے لئے اور میرے لئے بھی پہلے تو دو ایک کپڑے سب کے سامنے مجھے دیتے جو عموماً معمولی ہوتے پھر ایک آدھ کپڑا یا چیز چھپا کر موقعہ سے نکال کر مجھے دیتے اور

گھنٹے کہ بابا یہ میں خاص تیرے لئے لایا ہوں ایسا ایک آدھ بار نہیں کئی بار ہوا۔

سوال :۔ ایسا کرنے کی وجہ؟

جواب :۔ ایک وجہ تو ظاہر ہے میری خاطر داری تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنے بہن بھائیوں اور ماں کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے دل میں یہ خیال آئے کہ وہ ان سے زیادہ میرا کرتے ہیں۔

میری ان سے شادی عجیب حالات میں ہوئی تھی یہ انہی کی ہمت تھی کہ انہوں نے مجھے بسایا اور ہر طرح سے دلجوئی کی۔

سوال :۔ وہ عجیب حالات کیا تھے؟

جواب :۔ جمشید کے شہید ابو کو میری امی بہت چاہتی تھیں کر یلے میں ان کا اور ہمارا گھر بالکل ساتھ ساتھ ہے میرا رشتہ میری امی اور میرے چچا نے ان کو دیا تھا۔ کالج سے ریٹائر ہو کر میرے ابا جان بوریوالہ زمینوں پر چلے گئے۔ پھر امی جان کا انتقال ہو گیا ابا میرے بہت خیال کرتے تھے۔ بوریوالہ میں ہماری زندگی گاؤں کی زندگی سے بہت مختلف تھی برادری والوں کا خیال تھا کہ گاؤں کی زندگی کا بوجھ یہ نہ اٹھا سکے گی اور اس کا وہاں بسنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے یہ رشتہ نہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے میرے چچا کا بھی انتقال ہو گیا امی اور چچا یہی دو اس رشتے کے حامی تھے وہ نہ رہے۔ بہر کیف ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی۔ میرے ابا جی نے کہا میرے بھائی اور بیوی نے یہ رشتہ دیا تھا وہ اب قبروں میں ہیں میں ان کی روح کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ بہر حال میرے ابا جی نے یہ رشتہ کر دیا لیکن جہیز زیادہ نہ دیا کہ بسے یا نہ بسے اب جمشید کے ابو کی خوبی تھی کہ انہوں نے وہ بات نہیں ہونے دی۔ جس سے کوئی مشکل پیدا ہو بلکہ ایک بڑے مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔

سوال :۔ وہ کیا؟

جواب :۔ وہ یہ کہ میری امی جب اللہ کو پیاری ہوئیں تو میری بہنیں بہت چھوٹی تھیں۔ ان کی

دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں کچھ دنوں گھر پر ہی رہوں۔ بات مشکل تھی۔ منہ کھول کے کہہ بھی نہیں سکتی تھی اللہ بھلا کرے شہید کا انہوں نے خود کہا تم اپنے گھر پر رہو میں تو نوکری پر رہتا ہوں چنانچہ ان کی فراخدلی سے میں اپنے میکے ہی رہی یہ چھٹی پر آتے تو وہیں بوریوالے چک میں آجاتے۔ چھٹی کے آخری دس دن وہ مجھے لے کر یہاں کریالے آتے تھے کئی برس کے بعد میں نے کریالہ آکر رہنا شروع کیا۔

میں شہید کی کہاں تک تعریف کروں میرے لئے تو وہ فرشتے سے کم نہیں تھے۔

سوال :۔ جب آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ رہنا شروع کیا تو آپ نے بحیثیت شوہر کے انہیں کیسا پایا؟

جواب :۔ جب بھی موقع ملتا وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے ۱۹۶۱ء میں ان کی کوئٹہ پوسٹنگ ہوئی تو مجھے ساتھ لے گئے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ڈیوٹی کے بعد کا سارا وقت گھر میں گزارتے تھے انہیں خود بھی سیر و تفریح کا شوق تھا۔ مجھے بھی گھوماتے پھراتے۔ مجھے یاد ہے کہ کوئٹہ کے قیام کے زمانے میں ہم حنا جھیل پر پکنک منانے گئے تھے۔ بڑا اچھا منظر تھا خوب سیر کی وہاں پھلوں کے درخت بہت تھے۔ انہیں دیکھا بھالا پھل لے کر کھائے بھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ساتھ سینما بھی لے جاتے تھے۔

۱۹۶۴ء میں نائب صوبیدار ہو کر ان کی پوسٹنگ لاہور ہو گئی تھی اس وقت جمشید سال سوا سال کا تھا۔ لاہور پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے خوب سیر کرائی۔ پہلے داتا دربار حاضری دی پھر خوب گھومے پھرے۔

جمشید کے ابا میرے لئے بہت اچھے تھے۔ لیکن والدین اور بھائیوں کیلئے بھی کم اچھے نہیں تھے۔

سوال :۔ اس کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب :۔ والدین کی بہت خدمت کرتے تھے اور ان کے اشارے پر چلتے تھے چھٹی سے واپس جاتے وقت مجھے کہہ کر جاتے تھے کہ دیکھو ان کو تکلیف نہ ہو۔ سب سن لینا لیکن اُف نہ کرنا۔ اپنی یونٹ میں جا کر ہر خط میں تاکید کرتے کہ میرے والدین کو شکایت کا موقعہ نہ دینا۔ اسی طرح

بھائیوں کا خیال تھا۔

سوال:۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب:۔ مثلاً وہ چھٹی آتے تو ایک آدھ بار سب بھائیوں کو اکٹھا کر کے ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور خوش ہوتے ان کے ساتھ مل کر تو چائے اکثر پیتے تھے۔ برادری کے لوگوں کے ساتھ بھی کھلا دل تھا۔

سوال:۔ کیسے؟

جواب:۔ جب منی آرڈر کرتے تو تفصیل سے لکھتے کہ فلاں فلاں کو اتنا دینا ہے۔ برادری میں اگر کسی کی حالت کمزور ہوتی تو اس کی اکثر مدد کرتے۔ مجھ سے کہا ہوا تھا کہ ہاتھ کو کھلا رکھو اللہ برکت دے گا۔ ایک بات بتانا بھول گئی کہ وہ والد سے زیادہ والدہ سے ڈرتے تھے۔

سوال:۔ کیوں؟

جواب:۔ وہ تو اللہ ہی جانے لیکن میں نے سنا ہے اور دیکھا ہے کہ والدہ کی دلداری زیادہ کرتے تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے ان کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے والد ان سے بہت محبت کرتے تھے ان کے بعد تو ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ زیادہ وقت مسجد میں گزارتے۔ قرآن مجید پڑھ کر ثواب پہنچاتے مجھے یاد ہے کہا کرتے تھے "بیٹے! تو نے مجھے قرآن پڑھ کر بخشنا تھا۔ اب میں بخش رہا ہوں۔ یہ کہہ کر خوب روتے۔

سوال:۔ آخر میں ایک سوال بچے کے بارے میں، اس کے بارے میں آپ کا ارادہ کیا ہے؟

جواب:۔ جمشید کے ابا کی یہ شدید خواہش تھی کہ یہ ملٹری کالج میں پڑھے وہ تو ممکن ہو نہ سکا ویسے ان کی یہ خواہش کہ جمشید اچھے سکولوں میں پڑھے اس کا لحاظ میں نے ضرور رکھا ہے۔ پانچویں جماعت تک میں نے اسے کانونٹ اسکول جہلم میں اسے پڑھایا۔ چھٹی سے ایف جی اسکول کھاریاں میں ہے اور ماشاء اللہ اب نویں جماعت میں ہے اور اچھا جا رہا ہے اس کی تعلیم پر میں نے بڑی جان ماری ہے۔ جب یہ کانونٹ میں پڑھتا تھا تو ہر روز میں خود اسے کریالہ سے سرائے عالمگیر تانگہ تک چھوڑنے آتی تھی۔ واپسی پر سڑک کے کنارے گھنٹوں اس کا انتظار کرتی تھی اور گود میں اٹھا کر

گاؤں لے جاتی تھی تاکہ تھک نہ جائے۔ میری خواہش ہے کہ یہ فوج میں جائے اور پاکستان کی خدمت کرے۔ آمین!

آخر میں ہم پائندہ شہید کے چند دوستوں کے تاثرات نقل کرتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین کے تاثرات

۶۲۲۳ لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین لکھتے ہیں۔

پائندہ خان اور میں کچھ عرصے برڈوڈ ہاؤس (ایم جی ہاؤس) میں ساتھ رہے۔ یہ پاکستان بننے کے کچھ عرصے بعد کے جی۔ آر اجمیر سے یہاں آئے تھے۔

پائندہ کا دائرہ امتیاز باکسنگ تھا۔ کالج کی باکسنگ ٹیم میں تھے۔ ان کی شہرت ناک آؤٹ قسم کے باکسر کی تھی۔ دوسرے کھیلوں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ غالباً باکسنگ اور کھیلوں میں ضرورت سے زیادہ انہماک کی وجہ سے پڑھائی میں پیچھے رہ گئے تھے۔

اخلاق و عادات کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ باکسنگ رنگ کے سوا بڑے نرم خو تھے۔ اگر کسی نے ان کو باکسنگ رنگ میں نہ دیکھا ہو تو کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص ناک آؤٹ باکسر ہے مختصر یہ کہ ہمارا دوست پائندہ سیدھا سادا بھلا آدمی تھا۔ دلیر تھا۔ جرأت رکھتا تھا۔ یہی صفات میدانِ جنگ میں کام آتی ہیں۔ اب جبکہ یہ سطریں شہید کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ شہید کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔

۱۵۲۰ ا راجہ محمد اعظم خان لکھتے ہیں

سوال:۔ اعظم! آپ کو پائندہ خان کی امام دین سے باکسنگ کی مشہور فائٹ یاد ہے؟

جواب:۔ بالکل۔ اب بھی وہ نقشہ میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ ۱۲۳۲ امام دین کو سانٹی فک باکسر کا سرٹیفکیٹ ملا ہوا تھا۔ غالباً یہ مقابلہ ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ ۱۶۸۷ پائندہ خان کنلک ہاؤس

میں تھے اور امام دین اسکین ہاؤس میں۔ دونوں میں زبردست مقابلہ ہوا۔ چونکہ یہ انٹر ہاؤس مقابلہ تھا۔ اس لئے اور بھی زیادہ جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ دونوں خوب لڑے۔ آخر میں جیت پائندہ خان کی ہوئی۔ پائندہ نے چند سال بعد آرمی کلر بھی لیا۔ جو بہت بڑا اعزاز تھا۔

راجہ محمد افضل خان کا انٹرویو

پائندہ خان کے گھر والوں کے بعد اگر کوئی شخص پائندہ کے ساتھ سب سے زیادہ رہا ہے اور انہیں سب سے زیادہ جانتا ہے تو وہ ۱۰۷۰ راجہ محمد افضل خان ہیں۔ انہی نے ہمیں ان کی شہادت کے بارے میں بتایا اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ پائندہ کے بارے میں ان سے تفصیلی انٹرویو کریں۔ چنانچہ افضل سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال :۔ پہلے تو آپ پائندہ خان سے اپنے روابط پر روشنی ڈالیں ؟

جواب :۔ کالج سے دو تین میل مشرق کی طرف جو گاؤں کریالہ ہے ہم دونوں کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ برادری کا رشتہ بھی ہے۔ پھر کے جی آر اجمیر میں کچھ عرصہ ساتھ رہے اس کے بعد یہاں کالج میں ہم سبق رہے۔

سوال :۔ اس تعلق کی تفصیل بھی بتائیے ؟

جواب :۔ پائندہ۔ کے۔ جی۔ آر جہلم میں ۱۹۴۵ء میں داخل ہوئے تھے۔ میں اگست ۱۹۴۶ء میں کے جی آر جہلم اجمیر میں داخل ہوا۔ پائندہ کوئی چھ مہینے بعد یہاں کے جی آر جہلم سے وہاں پہنچے اور تقریباً دو سال ۱۹۴۷ء کے اواخر تک ہم دونوں وہاں ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ پاکستان بننے کے تین چار ماہ بعد ۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہمارا ۵۶ لڑکوں کا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا اور کھوکھرا پار کے راستے حیدر آباد سندھ سے ہوتے ہوئے ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو کالج میں پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں کالج میں کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ کالج بند تھا۔ ہم سب کو پہلے اسکین ہاؤس ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والوں میں پائندہ کے علاوہ علی عابد بھی تھے۔ جو پائندہ کی طرح ۱۹۶۵ء

کی جنگ میں شہید ہوئے۔

سوال :۔ اس سے پہلے کہ ہم آپ سے پائندہ کے ملٹری کالج جہلم کے زمانہ تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھیں ان کے ملٹری کالج اجمیر کے قیام کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب :۔ کے۔جی۔آر اجمیر میں، میں چیٹ وڈ ہاؤس میں تھا اور وہ دوسرے ہاؤس میں تھے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ وہ بھی کسی انگریز جرنیل کے نام پر تھا۔ سوچ کر بتاؤں گا لیکن چونکہ مسلمان طلبا وہاں بہت اقلیت میں تھے اور پائندہ تو میرے گاؤں کے تھے اس لئے سب مسلمان طلبا ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتے جلتے رہتے تھے۔ گو ہاؤس علیحدہ تھے لیکن گروپ ایک تھا۔

سوال :۔ تو اجمیر میں پائندہ نے کوئی امتیاز حاصل کیا تھا ؟

جواب :۔ نہیں۔ پائندہ نے وہاں باکسنگ شروع ضرور کر دی تھی۔ کھیلوں اور ایتھلیٹکس میں حصہ لیا کرتے تھے لیکن کسی دائرے میں شہرت حاصل نہیں کی تھی۔ اجمیر میں پائندہ ہر اعتبار سے ایک اوسط درجے کے طالب علم تھے اور قدرے گمنام۔ پائندہ یہاں آکر چمکے اور ان کی شہرت کا نقطہ عروج ستمبر ۱۹۴۹ء کا وہ دن تھا جب وہ انٹر ہاؤس باکسنگ چیمپئن شپ کے مقابلے میں کالج کے مانے ہوئے باکسر امام دین کے خلاف لڑے اور جیتے۔

سوال :۔ اس فائٹ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ ذرا اس کی تفصیل بتایئے ؟

جواب :۔ اس زمانے میں باکسنگ میں امام دین کا طوطی بولتا تھا۔ مشہور تھا کوئی امام دین کو ہرا نہیں سکتا۔

سوال :۔ امام دین کی باکسنگ کی کیا خصوصیت تھی ؟

جواب :۔ فٹ ورک تھا۔ قوت برداشت تھی مکے کی طاقت تھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ امام دین کو ڈبل پنچ لگانے میں بہت مہارت تھی۔

سوال :۔ ڈبل پنچ سے کیا مراد ہے ؟

جواب :۔ یعنی ایک بار میں دو بار ہٹ کرتا تھا۔ چونکہ اس کا گٹھا ہوا بدن تھا اور مشق بہت تھی

اس کا مکا اینٹ پتھر کی طرح پڑتا تھا اور مخالف چکرا جاتا تھا اس شہرت کے پس منظر میں بیشتر کا یہی خیال تھا کہ امام دین جیت جائے گا۔ ہم دوست تک یہی سمجھتے تھے کہ پائندہ لاکھ اچھا سہی لیکن امام دین کو ہرانا اس کے لئے مشکل ہوگا۔ اس لئے میں نے اور ۱۶۷۰ محمد رفیق (اب لیفٹیننٹ کرنل) نے پائندہ سے ایک ایک روپے کی شرط لگائی اور آخرکار شرط ہارے اور یہ ایسی ہار تھی جس سے ہم خوش ہوئے۔

اس سال انٹر ہاؤس باکسنگ میں مقابلہ بہت سخت تھا میں۔ پائندہ وغیرہ آکنلک ہاؤس میں تھے۔ اور اسکین ہاؤس کو ہرانا چاہتے تھے۔ اسکین کے پاس دو بڑے اچھے باکسر تھے۔ ایک تو امام دین۔ دوسرے ۱۷۳۵ محمد صفدر جنہوں نے بعد میں ایشیا اور کامن ویلتھ باکسنگ اعزازات حاصل کئے۔ اور ۱۹۵۶ء میں ملبورن آسٹریلیا اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی کی اب صورت یہ تھی کہ اگر یہ دونوں جیتے تو اسکین ہاؤس جیت سکتا تھا۔ آکنلک ہاؤس کی طرف سے ساری آنکھیں پائندہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اور پائندہ کا مقابلہ امام دین سے آن پڑا تھا۔ دونوں طرف بڑا جوش تھا۔ لڑنا تو ان دونوں نے تھا لیکن اضطراب سارے ہاؤس میں تھا۔ سوائے پائندہ کے میں بار بار کہتا یار اب کیا ہوگا۔ امام دین کے مقابلے میں تیرا کیا بنے گا۔ پائندہ قدرے بے نیازی سے کہتا۔ رنگ میں تماشا دیکھنا پھر کہتا تم کیوں ڈرتے ہو؟ لڑنا تو مجھے ہے۔

بہرحال آفس کے سامنے عارضی باکسنگ رنگ تھا۔ مات کا وقت پائندہ کی فائیٹ پانچویں تھی جوں ہی اس فائٹ کا اعلان ہوا اور سیکنڈز آؤٹ آف دی رنگ کی آواز آئی تو قیامت کا سناٹا چھا گیا اور میرا دل تو اچھل کر حلق میں آگیا۔ امام دین اور پائندہ دونوں جارحانہ باکسنگ کے ماہر تھے دونوں ایک دوسرے پر بھوکے شیروں کی طرح جھپٹتے۔ تین منٹ تک وہ دہائیں دہائیں ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پتھر ٹکرا رہے ہیں۔ جب پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو وہ شور اٹھا کہ حد و انتہا نہیں امام دین نے اپنے ناک آؤٹ پنچ آزمائے تھے۔ اور پائندہ خان شیر کی طرح جما کھڑا تھا۔ غرض اسی طرح دوسرا اور تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔

کی جنگ میں شہید ہوئے۔

سوال :۔ اس سے پہلے کہ ہم آپ سے پائندہ کے ملٹری کالج جہلم کے زمانۂ تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھیں ان کے ملٹری کالج اجمیر کے قیام کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب :۔ کے۔جی۔آر اجمیر میں، میں چیٹ وڈ ہاؤس میں تھا اور وہ دوسرے ہاؤس میں تھے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ وہ بھی کسی انگریز جرنیل کے نام پر تھا۔ سوچ کر بتاؤں گا لیکن چونکہ مسلمان طلبا وہاں بہت اقلیت میں تھے اور پائندہ تو میرے گاؤں کے تھے اس لئے سب مسلمان طلبا ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتے جلتے رہتے تھے۔ گو ہاؤس علیحدہ تھے لیکن گروپ ایک تھا۔

سوال :۔ تو اجمیر میں پائندہ نے کوئی امتیاز حاصل کیا تھا ؟

جواب :۔ نہیں۔ پائندہ نے وہاں باکسنگ شروع ضرور کردی تھی۔ کھیلوں اور ایتھلیٹکس میں حصہ لیا کرتے تھے لیکن کسی دائرے میں شہرت حاصل نہیں کی تھی۔ اجمیر میں پائندہ ہر اعتبار سے ایک اوسط درجے کے طالب علم تھے اور قدرے گمنام۔ پائندہ یہاں آکر چمکے اور ان کی شہرت کا نقطہ عروج ستمبر ۱۹۴۹ء کا وہ دن تھا جب وہ انٹر ہاؤس باکسنگ چیمپئن شپ کے مقابلے میں کالج کے مانے ہوئے باکسر امام دین کے خلاف لڑے اور جیتے۔

سوال :۔ اس فائٹ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ ذرا اس کی تفصیل بتایئے ؟

جواب :۔ اس زمانے میں باکسنگ میں امام دین کا طوطی بولتا تھا۔ مشہور تھا کوئی امام دین کو ہرا نہیں سکتا۔

سوال :۔ امام دین کی باکسنگ کی کیا خصوصیت تھی ؟

جواب :۔ فٹ ورک تھا۔ قوت برداشت تھی مکے کی طاقت تھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ امام دین کو ڈبل پنچ لگانے میں بہت مہارت تھی۔

سوال :۔ ڈبل پنچ سے کیا مراد ہے ؟

جواب :۔ یعنی ایک بار میں دو بار ہٹ کرتا تھا۔ چونکہ اس کا گٹھا ہوا بدن تھا اور مشق بہت تھی

اس کا مکا اینٹ پتھر کی طرح پڑتا تھا اور مخالف چکرا جاتا تھا اس شہرت کے پس منظر میں بیشتر کا یہی خیال تھا کہ امام دین جیت جائے گا۔ ہم دوست تک یہی سمجھتے تھے کہ پائندہ لاکھ اچھا سہی لیکن امام دین کو ہرانا اس کے لئے مشکل ہوگا۔ اس لئے میں نے اور ۱۶۷۰ محمد رفیق (اب لیفٹیننٹ کرنل) نے پائندہ سے ایک ایک روپے کی شرط لگائی اور آخرکار شرط ہارے اور یہ ایسی ہار تھی جس سے ہم خوش ہوئے۔

اس سال انٹر ہاؤس باکسنگ میں مقابلہ بہت سخت تھا میں، پائندہ وغیرہ آکنلک ہاؤس میں تھے۔ اور اسکین ہاؤس کو ہرانا چاہتے تھے۔ اسکین کے پاس دو بڑے اچھے باکسر تھے۔ ایک تو امام دین۔ دوسرے ۷۳۵ محمد صفدر جنہوں نے بعد میں ایشیا اور کامن ویلتھ باکسنگ اعزازات حاصل کئے۔ اور ۱۹۵۶ء میں ملبورن آسٹریلیا اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی کی اب صورت یہ تھی کہ اگر یہ دونوں جیتے تو اسکین ہاؤس جیت سکتا تھا۔ آکنلک ہاؤس کی طرف سے ساری آنکھیں پائندہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اور پائندہ کا مقابلہ امام دین سے آن پڑا تھا۔ دونوں طرف بڑا جوش تھا۔ لڑنا تو ان دونوں نے تھا لیکن اضطراب سارے ہاؤس میں تھا۔ سوائے پائندہ کے میں بار بار کہتا یار اب کیا ہوگا۔ امام دین کے مقابلے میں تیرا کیا بنے گا۔ پائندہ قدرے بے نیازی سے کہتا۔ رنگ میں تماشا دیکھنا پھر کہنا تم کیوں ڈرتے ہو؟ لڑنا تو مجھے ہے۔

بہرحال آفس کے سامنے عارضی باکسنگ رنگ تھا سلات کا وقت پائندہ کی فائیٹ پانچویں تھی جوں ہی اس فائٹ کا اعلان ہوا اور سیکنڈز آؤٹ آف دی رنگ کی آواز آئی تو قیامت کا سناٹا چھا گیا اور میرا دل تو اچھل کر حلق میں آگیا۔ امام دین اور پائندہ دونوں جارحانہ باکسنگ کے ماہر تھے دونوں ایک دوسرے پر بھوکے شیروں کی طرح جھپٹتے۔ تین منٹ تک وہ دہائیں دہائیں ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پتھر ٹکرا رہے ہیں۔ جب پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو وہ شور اٹھا کہ حد و انتہا نہیں امام دین نے اپنے ناک آؤٹ پنچ آزمائے تھے۔ اور پائندہ خان شیر کی طرح جما کھڑا تھا۔ غرض اسی طرح دوسرا اور تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔

تالیوں اور بک اپ ویل ڈن کے نعروں سے لڑکوں نے آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا۔ پائندہ خان نے خوب جم کر مقابلہ کیا تھا اور خوب وار کئے تھے۔ ہمیں کچھ کچھ امید ہو چکی تھی مقابلہ نصف نصف نظر آتا تھا لیکن امام دین کی شہرت کے پیش نظر دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔ کمانڈانٹ کرنل زیدی خود چیف جج تھے۔ آخر انہوں نے اپنا فیصلہ دیا اور پائندہ کے پوائینٹ پر جیتنے کا اعلان کیا گیا تو نہ پوچھیئے کہ ہماری حالت کیا تھی۔ زندگی میں اس انداز کی اتنی خوشی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور اس کے بعد کبھی اس انداز سے نہیں دیکھی۔ ہم نے باکسنگ کے بعد پائندہ کو کندھوں پر اٹھا لیا اور وہ بھنگڑا ڈالا کہ حد نہیں۔

سوال:۔ پائندہ خان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا تھا؟

جواب:۔ امام دین کو اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس نے سمجھا ہوا تھا میرے آگے پائندہ چیز ہی کیا ہے۔ ادھر پائندہ کو اپنے پر ضروری اعتماد کے ساتھ اس چیلنج کا احساس تھا جو اس کے سامنے تھا۔ زندگی میں جیت ہمیشہ پہل کرنے والے کی ہوتی ہے۔ پائندہ نے اپنی پوری قوت سے کام لیا اور امام دین کی مدافعت کے حصار کو توڑ دیا اور اسے تھوڑی دیر کیلئے بوکھلا دیا چنانچہ اس جیسا باکسر ناکام ہو گیا۔

پائندہ خان میں قوت برداشت بہت تھی اس باؤٹ میں اس نے ایک لمحے کیلئے بھی اپنے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ نہیں چھوڑی۔ میں اس بات کو اس کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اس کامیابی پر پائندہ کو کالج کے سالانہ تقسیم انعامات کے موقعہ پر باکسر کا وہ مجسمہ انعام میں ملا تھا جو اب کالج میوزیم میں موجود ہے۔

سوال:۔ کراچی میں پائندہ کی جو مشہور فائٹ محمد علی مکرانی سے ہوئی وہ آپ نے دیکھی تھی؟

جواب:۔ جی ہاں۔ اس سے پہلے پائندہ اپنے وزن میں پاکستان آرمی باکسنگ چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۵۶ء کے اوائل میں کراچی میں آل پاکستان باکسنگ چیمپئن شپ کے مقابلے ہوئے تھے جو ایک طرح کے ملبورن آسٹریلیا اولمپکس کیلئے باکسنگ کے آزمائشی مقابلے تھے۔

ان مقابلوں میں کالج ہی کے صفدر نے ہیوی ویٹ میں آرمی ہی کے ایک باکسر کو ہرایا تھا اور پائندہ نے ان سے دو وزن نیچے اپنے مقابل کراچی کے مشہور باکسر محمد علی مکرانی کو شکست دی تھی۔ پائندہ کا انتخاب ملبورن اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے ہو چکا تھا ان ہی دنوں میں قطر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ پائندہ کو کسی وجہ سے اولمپکس میں نہ بھیجا گیا۔

سوال:۔ ۱۹۵۶ء کے بعد بھی پائندہ سے ملاقات ہوئی؟

جواب:۔ کیوں نہیں۔ ایک گاؤں کے ہونے کی وجہ سے کئی بار ملے۔ آخری بار مارچ ۱۹۶۵ء میں مختصر ملاقات ہوئی۔ میں اپنے والد کو حج کرانے لے جا رہا تھا۔ ان کو خبر ہوئی تو خدا حافظ کہنے لاہور ریلوے اسٹیشن آئے۔ یہ ایک مختصر ملاقات تھی۔ اس موقع پر میں نے انہیں پہلی بار وردی میں دیکھا بلوچ رجمنٹ کی وردی میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ باکسر ہونے کے باوجود پائندہ چھریرے بدن کے تھے۔

سوال:۔ آخر میں وہ سوال جو ہم سب سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں شہید کی شخصیت کا مجموعی تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ پائندہ سیدھا سادا بندہ تھا۔ کورا ورق کہنا چاہیئے اس میں کوئی چھل فریب نہیں تھا۔ دیہات کا ہونے کے باوجود دیہاتی جھگڑوں سے دور رہتا تھا۔ باکسر تھا لیکن اپنی باکسری کا رعب نہیں جماتا تھا۔ مزاج میں انکسار تھا۔ اپنوں اور غیروں کے کام آتا تھا اور دوستوں پر بوجھ نہیں بنتا تھا بڑا پیارا اور بھلا آدمی تھا۔

زندگی کا سارا کھیل اس نے سیدھے سبھاؤ کھیلا۔ داؤ پیچ اس کو نہیں آتے تھے۔ باکسنگ رنگ میں مکا مار کر یا مکا کھا کر اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ میں فرق نہیں آتا تھا۔ اسی طرح مسکراتے اس نے اللہ کی راہ میں جان بھی دی۔ خدا کرے ہماری قوم میں پائندہ خان پیدا ہوتے رہیں موت برحق ہے لیکن جب کوئی پائندہ خان اللہ کی راہ میں مرتا ہے تو پائندہ

رہتا ہے۔

کموڈور سید سجاد حیدر پائندہ خان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

پائندہ کی شخصیت ایک لحاظ سے انوکھی تھی۔ باکسنگ رنگ میں وہ جتنی خونخواری دکھلاتے تھے روزانہ کی زندگی میں اتنے ہی حلیم اور نرم خو تھے۔ جو بھی ان کی باکسنگ دیکھتا تھا یہی کہتا تھا کہ اس میدان میں یہ لڑکا بڑا نام پیدا کرے گا۔ بلاشبہ انہوں نے بحیثیت باکسر کالج میں اور باہر بہت نام پیدا کیا ان کی بہترین باؤٹ وہ تھی جس میں ۱۹۶۵ء میں وہ شہید ہوئے۔ اقبال نے کہا ہے۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
جو گلستان راہ میں آئے جوئے نغمہ خواں ہو جا

پائندہ کو یہ کمال حاصل تھا۔

سدا رہے نام اللہ کا

کیپٹن سید مظہر حسین شاہ شہید

پنجاب رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ——————— ۲۵ مئی ۱۹۳۷ء

جائے پیدائش ——————— محمدی پور مدینہ گجرات

کمیشن ——————— ۴ پی۔ ایم۔ اے

تاریخ شہادت ——————— ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شب

شہادت کے وقت عمر ——————— ۲۸ سال

مقام شہادت ——————— ڈوگرئی (لاہور)

مدفن ——————— محمدی پور مدینہ (گجرات)

کیپٹن مظہر حسین شہید پنجاب رجمنٹ

۲۴ ستمبر ۶۵ء کی شام کو جب مظہر حسین شہید کا تابوت گاڑی سے اتار کر گھر میں لاکر رکھا گیا تھا تو تابوت لانے والے صوبیدار صاحب سے شہید کی بے چین ماں نے جو پہلا سوال پوچھا وہ یہ تھا:۔

"مظہر کے گولی کہاں لگی"۔

"اماں جی۔ کپتان صاحب نے ساری گولیاں سامنے سینے پر کھائیں"۔

"مجھے اپنے بیٹے مظہر سے یہی توقع تھی"۔

کیپٹن مظہر حسین شاہ شہید کی جو قدریں تھیں جس خاندان کے وہ فرد تھے۔ جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی تھی جو خون ان کی رگوں میں رواں تھا اس کے پیش نظر ان سے یہ توقع بیجا نہ تھی۔ محمدی پور مدینے کا یہ جوان سال سیدزادہ اگر سینے پر گولی نہ کھاتا تو کہاں کھاتا؟ وہ بنا ہی اس طرح تھا۔

مظہر کے آباؤ اجداد

کیپٹن سید مظہر حسین شاہ شہید کے آباؤ اجداد جعفری سید تھے۔ چنگیزی تخت وتاراج کے بعد کے دور میں یہ لوگ خوارزم سے ہجرت کر کے گجرات میں آکر ٹھہرے۔ ہندوستان میں اس زمانے میں اکبر کی حکومت تھی۔ اکبر نے ان کی علمی اور فوجی خدمات کے صلے میں انہیں گجرات کے مضافات میں ایک جاگیر عطا کی۔ اس جاگیر پران صاحب علم اور صاحب سیف سادات نے ایک بستی بسائی جس کا نام

انہوں نے اپنے قدیم وطن کی یاد میں مدینہ رکھا۔ اس کے بعد دو اور گاؤں آباد کئے جمال پُور اور معین الدین پور یہی معین الدین پور اب اصل گاؤں مدینہ سے مل کر محمدی پور مدینہ کہلاتا ہے۔

یہ محمدی پور مدینہ ہی مظہر شہید کا آبائی گاؤں ہے۔ محمدی پور مدینے کے سادات اکبر بادشاہ کے زمانے سے کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ فوجی خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی محمدی پور مدینے کے سادات گھرانوں کے بے شمار افراد نے حصہ لیا۔

گجرات کے علاقے میں اور فوج میں محمدی پور مدینے کے جوان، سردار اور افسر اپنی وجاہت شاندار شکل وصورت، مضبوط ڈیل ڈول اور اپنے اخلاق وعادات کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

مظہر کے والدین

مظہر کے والد سید محمد شاہ اور والدہ سیدہ کبریٰ بیگم اسی محمدی پور مدینے کے چشم وچراغ تھے۔ سید محمد شاہ پہلی جنگ عظیم میں پنجاب رجمنٹ میں بھرتی ہوئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں خدمات انجام دیں۔ حوالدار کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ شاہ صاحب نے ۱۹۶۴ء میں انتقال کیا۔

سید محمد شاہ صاحب کتابی معیار سے زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن آخر سید زادے تھے۔ بڑے وجیہہ وشکیل ہونے کے ساتھ ساتھ خاندانی روایات کے حامل۔ محمدی پور مدینے کی مذہبی فضا میں رچے بسے۔ یہی حال شہید کی والدہ ماجدہ کا ہے اس کے دل ودماغ کی عکاسی تو اسی سوال سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس وقت پوچھا جب مظہر کا تابوت لاکر گھر کے آنگن میں رکھا گیا تھا کہ مظہر کے گولی کہاں لگی؟

مظہر کی پیدائش اور بچپن

مظہر اپنے آبائی گاؤں محمدی پور مدینے میں ۲۵ مئی ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے اس وقت ان کے والد اپنی رجمنٹ کے ساتھ پونہ (انڈیا) میں تعینات تھے اس لئے اپنے بچپن کے دو سال مظہر نے

پونہ چھاؤنی میں گزارے۔ دوسری جنگ عظیم چھڑنے پر ان کے والد حوالدار سید محمد شاہ کو ایران جانا پڑا تو مظہر اپنی والدہ اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ مدینہ گجرات چلے گئے۔

مظہر کے بچپن کے بارے میں ان کے ماموں اور خسر لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید نذیر احمد شاہ لکھتے ہیں:۔

"بچپن میں مظہر نہایت ہی شوخ و شریر بچہ تھا۔ گول مٹول ہنستا ہوا مکھڑا شرارت بھری آنکھیں تیز طرار، سیماب صفت ایک منٹ نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ننھیال اور ددھیال میں اس وقت وہی ایک چھوٹا بچہ تھا دونوں خاندان ایک بڑے سے مکان میں اکٹھے رہتے تھے۔"

اس کے تین چچا اور چار ماموں تھے۔ جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی چنانچہ مظہر نے اپنا بچپن ان کے کندھوں پر سواری کرتے گزارا۔ وہ اپنی پیاری پیاری باتوں اور شرارتوں سے اپنوں کے ہی نہیں سب ملنے والوں کے دل موہ لیتا تھا۔ نقلیں لگانا۔ جانوروں کی بولیاں بولنے کا شغل کافی عمر یعنی پرائمری تعلیم کی سٹیج تک رہا۔

ابتدائی تعلیم

مظہر حسین کی بسم اللہ چار برس چار مہینے کی عمر میں قاعدہ بغدادی سے ہوئی۔ پہلے قرآن شریف پڑھا پھر دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مدینے میں محرم بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ یکم محرم سے چہلم تک مجلسیں ہوتی ہیں۔ ذکر حسین کی ان مجلسوں میں مظہر حسین شاہ بچپن ہی سے شریک ہوتے تھے۔

مظہر حسین نے پرائمری تعلیم مسلم زمیندارہ ہائی سکول میں حاصل کی۔ اسی سکول میں وہ چھٹے درجے میں پڑھ رہے تھے کہ ملٹری کالج میں داخلے کے لئے منتخب ہوگئے۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء کو ملٹری کالج میں چھٹے درجے میں داخل ہوئے۔ ۲۹۳، کالج نمبر تھا۔ ہڈسن ہاؤس (حال ٹیپو شاہ ہاؤس) ان کا پہلا ہاؤس تھا۔

۱۹۴۹ء میں چھٹے درجے کے سالانہ امتحان کی رپورٹ میں انہیں ہونہار لڑکا کہا گیا۔ پڑھائی میں اوسط درجے کی کارکردگی تھی ۱۹۵۰ء میں ساتویں درجے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ ۱۹۵۱ء میں ساتواں درجہ پاس کرلیا۔ ریاضی میں خصوصی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اس سال ان کی رپورٹ میں ان کی سخت کوشی خوش اطواری کو سراہا گیا اور پر مزاح کہا گیا۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں وہ آٹھویں درجے میں تھے تو انہوں نے فرسٹ کلاس انگلش کا امتحان پاس کیا اس سال کی رپورٹ میں ان کی دلکش شخصیت احساس ذمہ داری اور حساس ہونے کا تذکرہ ملتا ہے نویں درجے میں مظہر حسین کے فارم ماسٹر ملٹری کالج کے ایک بہت ہی تجربہ کار اور صاحب نظر استاد مسٹر اقبال احمد تھے اقبال صاحب کبھی انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون میں بھی استاد رہے تھے۔ اور لڑکوں کی صلاحیتوں کو پہچاننے اور سنوارنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ اقبال صاحب نے مظہر حسین شاہ کی تربیت میں خصوصی دلچسپی لی اور ۵۳ء کی رپورٹ میں لکھا۔

یہ لڑکا ذہین ہے تخیل رکھتا ہے دلکش شخصیت کا مالک ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتا ہے۔ گو خاموشی پسند اور کم گو ہے لیکن باحوصلہ اور جرأت مند ہے۔

۱۹۵۴ء میں جب دسویں سی میں تھے اور ہاؤس اسکین (بابر ہاؤس) تھا تو ان کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر صوبیدار عریف الحسن نے ان کے بارے میں ایک عجیب جملہ لکھا:۔

"ایک سنجیدہ قسم کا لڑکا ہے جسے شاید ملال و محرومی کی زندگی گزارنا پڑے"

اپریل ۱۹۵۵ء میں مظہر حسین شاہ نے بی۔ اے اسپیشل کا امتحان دیا مئی میں ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں آئے۔ اسی سال ان کی رپورٹ مسٹر بی۔ اے چوہان نے لکھی چوہان صاحب بزرگوں کے بزرگ تھے۔ ۱۹۱۳ء میں بھی لیکچرر تھے اور اب ۱۹۵۵ء میں کالج میں اعزازی استاد تھے چوہان صاحب ایسے جوہر شناس کا یہ کہنا کہ:۔

"بہت ہونہار ہے ترقی و سرفرازی کے امکانات سے بھرپور ہے"۔ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

مظہر حسین شاہ نے ۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو کالج کو خیرباد کہا اور اگلے سال ۱۹/ اپریل ۵۶ء کو کمیشن

کے لئے پی۔ایم۔اے گئے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۵۸ء کو مظہر پی۔ایم۔اے سے پاس آؤٹ ہوئے۔

کمیشن سے شہادت تک کی مصروفیات

سیکنڈ لیفٹیننٹ مظہر نے پی۔ایم۔اے سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد ۲ مئی ۵۸ء کو ۸ پنجاب میں ڈیرہ نواب صاحب میں رپورٹ کی۔ ۱۲ جون ۵۹ء کو انفنٹری سکول کوئٹہ کورس کرنے گئے۔ ۱۸ اگست کو لیفٹیننٹ بن گئے۔

۱۸ ستمبر ۶۰ سے ۳۰ ستمبر ۶۱ء تک ایسٹ پاکستان میں پلٹن ایڈ جوٹینیٹ کی خدمات انجام دیں ۱۲ جون ۱۹۶۱ء کو کیپٹن کے عہدے پر ترقی پائی۔ یکم اکتوبر ۶۱ء کو پھر انفنٹری اسکول کوئٹہ کورس کرنے گئے۔ ۲۰ جون ۱۹۶۲ء کو شہزادہ ولیعہد جاپان اکی ہٹو کو ڈھاکہ ایئر پورٹ پر گارڈ آف آنر پیش کیا۔ ۸ فروری ۶۲ء کو انہیں کوارٹر ماسٹر مقرر کیا گیا۔ ۲۲ فروری ۶۲ء شاہ تھائی لینڈ کو ان کے مشرقی پاکستان سے روانگی کے موقع پر گارڈ آف آنر پیش کیا۔ نومبر ۶۲ء میں پلٹن کے ساتھ لاہور واپس آئے۔ ۱۹۶۳ء میں چین کے وزیر اعظم کی آمد اور رخصت پر دفاعی افواج کا مشترکہ گارڈ آف آنر کمانڈ کیا۔

۱۹۶۳ء میں ان کی کومیلا بریگیڈ میں پوسٹنگ ہوئی۔ جون ۶۵ء میں اپنے یونٹ میں آگئے اور سی کمپنی کی کمان سنبھالی۔

واقعات شہادت

چونکہ مظہر شہید کا تعلق ۸ پنجاب سے تھا۔ اس لئے ہم نے ان کے جنگی کارناموں کی تفصیل کے لئے ۸ پنجاب کے موجودہ کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب (کالج نمبر ۲۰۹) کو لکھا انکا یہ جواب آیا۔

۶ ستمبر کو جب بھارتی افواج نے پاک سرزمین پر حملہ کیا تو ۸ پنجاب اس وقت صدارتی باڈی گارڈ کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ ۸ پنجاب کی سی کمپنی کو لاہور جانے کا حکم ملا۔ اور وہاں پہنچتے ہی ۸ ستمبر کو یہ کمپنی ۱۵ ایف ایف کے ساتھ واہگہ سیکٹر میں دشمن پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے بعد یہ کمپنی

۱۸ بلوچ کے ساتھ دفاع میں لگ گئی۔

۱۱ ستمبر کو ۸ پنجاب کی سی کمپنی کو بٹالین ہیڈ کوارٹر سے کچھ جوان اور ایک افسر کیپٹن مظہر حسین بطور امداد ملے۔ اس طرح سی کمپنی میں اب دو افسر ہو گئے۔ میجر انیس جو کہ کمپنی کمانڈر تھے اور کیپٹن مظہر حسین جنہیں کمپنی افسر لگا دیا گیا۔ کیپٹن مظہر کے آنے سے کمپنی کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ اس جری اور جواں ہمت افسر نے آتے ہی کمپنی کے ایک ایک مورچے کا چکر لگایا اور ہر ایک کی حوصلہ افزائی کی۔

۱۶ ستمبر کو دشمن کا ایک حملہ آور دستہ سی کمپنی کے دفاعی علاقے میں آیا کیپٹن مظہر حسین نے فوراً اپنا مورچہ چھوڑا اور ۹ پلاٹون کے پاس پہنچے جہاں سے انہوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں دشمن کے خلاف کارروائی کی اور اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

اس معرکے کی باقی کارروائی ۸ پنجاب ہی کے ایک پرانے افسر بریگیڈیر عاشق حسین کی زبانی سنیئے۔

مظہر کی رائفل کمپنی کو ۸ پنجاب سے علیحدہ کر کے ۱۶ پنجاب کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ ان کی کمپنی کے ذمے مشن یہ تھا کہ وہ (لاہور سیکٹر میں) بی آر بی نہر کے اس پار ڈوگرائی گاؤں کا دفاع کریں۔ ہندوستانیوں نے اس گاؤں پر بار بار حملے کئے جو پسپا کر دیئے گئے۔ جنگ کے آخری دن (۲۲ ستمبر کو) دشمن نے ایک بریگیڈ کے ساتھ توپ خانے کی مدد سے ایک تازہ حملہ کیا۔ حملہ بھرپور تھا۔ دشمن نے کچھ کامیابی بھی حاصل کی لیکن بہت زیادہ نقصان اٹھانے کے بعد۔ اس ایکشن میں مظہر نے اپنی کمانڈ پوسٹ سے بہ نفس نفیس نکل کر دشمن کے ایک لڑاکا پٹرول کو جو رات کو ان کی کمپنی کی پوزیشن میں آ گھسا تھا گھیرے میں لے لیا۔ صرف چند آدمیوں کی مدد سے انہیں نے بڑی ہوشیاری اور دلیری سے اس پٹرول کے کچھ اراکین کو ختم کر دیا اور باقی کو گرفتار کر لیا۔ اسی ایکشن میں انہوں نے اپنے ایک این سی او۔ حوالدار محمد خان کے لئے بہادری کے اعزاز کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ اسے تمغۂ جرأت دیا گیا۔

ڈوگرائی کے علاقے میں دشمن نے رات کی تاریکی میں کچھ پیش قدمی کی تھی اور پیچھے سے فائر ۱۶ پنجاب پر آ رہا تھا۔ کیپٹن مظہر کو حکم ملا کہ دشمن کا قلع قمع کیا جائے کیپٹن مظہر نے اپنی کمپنی

سے ایک پلاٹون لی اور دشمن کو گھیرے میں لے لیا۔ جو گاؤں کے گھروں کی چھتوں پر تعینات تھا اور ایک ایک کر کے سب کا صفایا کر دیا اس طرح یہ کانٹا نکل گیا۔

۲۲ اور ۲۳ دسمبر کی درمیانی رات تھی جس رات فائربندی ہونا تھی۔ مظہر اپنی کمپنی کی کمانڈ پوسٹ میں تھے کہ دشمن نے پے در پے زوردار حملے شروع کر دیئے ادھر سے جوابی فائر شروع ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی مشین گن خاموش ہو گئی اس کے بعد کا قصہ ان کے سگنل مین نائیک محمد افضل نے جو ان کے ساتھ ان کی کمانڈ پوسٹ میں تھا یوں بیان کیا ہے کہ مشین گن فائر نہ کرنے سے کیپٹن مظہر کو بڑی تشویش ہوئی وہ اپنی کمانڈ پوسٹ سے نکلے اور شیلنگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ مشین گن کی پوزیشن تک گئے یہ دیکھنے کے لئے کہ بات کیا ہے فائر کیوں نہیں ہو رہا۔ انہوں نے دیکھا کہ گنر شہید ہو چکا ہے اور اس کا نائب شدید طور پر زخمی حالت میں پڑا ہے۔ وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا۔ جب آدمی کی جرأت کا امتحان ہوتا ہے۔ مظہر نے مشین گن کے پٹ میں گنر کی جگہ خود سنبھال لی اور اس سمت میں گولہ باری شروع کر دی جہاں سے دشمن کے نئے حملے کی تیاری کا شور اٹھ رہا تھا۔ اتنے میں وہ متوقع حملہ آ گیا۔ گولے برسنے لگے۔ مظہر نے مشین گن کی پوزیشن نہیں چھوڑی۔ اس پوزیشن میں تھے ایک گولہ آ کے لگا اور اس ڈائریکٹ ہٹ سے جان بر نہ ہو سکے اور شہید ہو گئے۔ لیکن آخر دم تک اپنے جوانوں کو مقابلہ کرنے کی ہدایات دیتے رہے۔ رات بھر وقفے وقفے سے گولہ باری ہوتی رہی جب صبح سویرے فائربندی کا نفاذ ہوا تو مظہر شہید اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں ڈوگرائی چوکی کے آس پاس بکھری پڑی تھیں یہ وہ جانباز تھے جنہوں نے ڈوگرائی گاؤں کا دفاع کرتے ہوئے جانیں قربان کی تھیں۔

دوسرے دن رات کو مظہر کی کمپنی کے ایک جانثار نائب صوبیدار محمد زر ایک لڑاکا پٹرل لے کر گئے تاکہ شہداء کی لاشیں لائی جا سکیں۔ یہ پٹرول جان جوکھوں میں ڈال کے مظہر شہید کی لاش تلاش کر کے واپس لایا۔ یہ خدمت حولدار کلمہ خان نے انجام دی۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سید زادے کے سینے اور شانوں پر ایک نہیں کئی گولیوں کے چھید تھے۔ جسم پر خون جم کے خشک ہو چکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں لیکن چہرہ پر نور بکھرا ہوا تھا۔ فرض کی ادائیگی

ایک نوحہ

مظہر کی شہادت پر ایک اخبار میں یہ نوحہ شائع ہوا۔

پھر بھڑک اٹھی ہے آگ
اے وطن کے نوجوان پاسبان
اے وطن کی آن بان
موت کیا ہے؟
آبرو کی نے میں زندگی کا راگ
فوج کے جوان کی موت ہو کہ زندگی۔
روشنی ہی روشنی
سب تمہارے ساتھ ہیں
پھر بھڑک اٹھی ہے آگ
دھیمے دھیمے اس کی آنچ ہو رہی ہے تیز تیز
جل رہے ہیں بام و در
سب وطن کے نوجوان پاسبان
ڈٹ گئے ہیں اپنے اپنے مورچے سنبھال کر
خوف ہے نہ کچھ خطر
سب کے سب جری نڈر
بلند ہیں ہمارے حوصلے ادھر
یہ ہے قوم کا سہاگ
پھر بھڑک اٹھی ہے آگ
سب تمہارے ساتھ ہیں۔

مظہر کی شہادت پر ماں کا سوال

جب شہید کی لاش گھر پہنچی تو عالی نسب اور عالی ظرف ماں نے تابوت بردار سے جو پہلا سوال پوچھا وہ یہ تھا۔ کہ مظہر کے گولی کہاں لگی؟ جواب ملا کہ شہید نے ساری گولیاں سینے پہ کھائیں یہ سن کر بوڑھی سیدزادی نے متانت سے کہا۔ مجھے اپنے بیٹے سے یہی توقع تھی۔ الحمد للہ پنجتن پاک کا غلام میدان جنگ میں سرخ رو ہوا۔ (ذرا والدہ مظہر کے الفاظ بھی ملاحظہ کیجئے۔ پہلے جب سوال پوچھا تو صرف یہ پوچھا کہ مظہر نے گولی کہاں کھائی؟ جب اطمینان ہو گیا کہ اس نے سینے پر گولی کھائی ہے۔ مردانہ وار جان دی ہے تو انہوں نے لفظ مظہر کے ساتھ میرے بیٹے کے الفاظ کا اضافہ کیا۔ سبحان اللہ! ایسی ماؤں ہی سے قوم بنتی ہے)

شہید کی بیگم نے کہا

اپنے شوہر کی شہادت پر بیگم زبیدہ مظہر نے کہا۔

جب ۷ ستمبر کی شام کو ذرا کی ذرا آئے تھے تو جاتے تھے کہہ گئے ایک ہفتے کے اندر اندر تم ایک خوشخبری سنو گی شاید وہ خوشخبری یہی تھی، شہادت مسلمان کی زندگی کی معراج ہے۔ وہ اپنی معراج کو پہنچے میرا اور بچوں کا اللہ مالک ہے جس نے دیئے ہیں وہی پالے گا۔

وہ کہا کرتے تھے قوموں کو زندہ رہنے کیلئے ہمیشہ اپنے بیٹوں کے خون کی ضرورت ہوتی ہے جب کبھی میرے ملک اور قوم پر آزمائش کا وقت آیا تو میں اپنا قول سچ کر دکھاؤں گا۔ سو وہ انہوں نے کر دکھایا۔

شہید کی شخصیت و کردار

مظہر شہید کے دوستوں، ساتھیوں اور افسروں کے تاثرات سے شہید کی شخصیت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ملٹری کالج کے سابق کمانڈانٹ کرنل (اب بریگیڈیر ریٹائرڈ) محمد رفیق مظہر کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "مظہر طبعاً سمجھدار اور ذمہ دار تھا ذہین اور پُر تجسس اسکو بحث مباحثے کا بہت شوق تھا۔ بال کی کھال نکالتا تھا اس کو دلیل سے مطمئن کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ سوچنے اور سمجھنے کا ذوق ہر ایک میں نہیں ہوتا اس کی قوت استدلال بہت تیز تھی۔ مذہب کی طرف رجحان تھا اردو تقریروں اور کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتا تھا۔ کالج کے میگزین تربیت کے لئے بھی لکھتا تھا، صاف ستھرا، مظہر باوقار شخصیت اور قیادت کی نمایاں صلاحیت رکھتا تھا۔

بریگیڈیر (ریٹائرڈ) محمد شفیع لکھتے ہیں:

میں ۱۹۵۰ء میں (ملٹری کالج کے) رابرٹس ہاؤس (حال شیر شاہ ہاؤس) کا ہاؤس آفیسر تھا (کیپٹن کے عہدے کے ساتھ) اس وقت کے مظہر کی تصویر میری آنکھوں میں اب بھی پھرتی ہے وہ شکل و شباہت قد و قامت کے لحاظ سے بھی دوسروں سے ممتاز تھا۔ اور عادات و اطوار کی شائستگی و نفاست میں بھی اسے بہتوں پر فوقیت حاصل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی شگفتگی اور طمانیت چھائی رہتی تھی وہ غالباً اس کی صاف ستھری ذہنی اور عملی زندگی کا اثر تھا۔ اس زمانے میں ہفتے کے خاص کھانے کے بعد) ڈراموں اور گانوں وغیرہ کے ورائٹی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ ان میں مظہر بھی حصہ لیا کرتا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ سنجیدہ اور ہنس مکھ مظہر ان پروگراموں میں کوئی مزاحیہ چیز پیش کیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسے نقلیں اتارنے میں کمال حاصل تھا۔

دوسری بار ۱۹۶۲ء مظہر سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی۔ ماشاء اللہ اب وہ کیپٹن تھا اور بڑا بانکا سجیلا جوان نکلا تھا۔ ۸ پنجاب کے جوانوں کے ساتھ مشرقی پاکستان آئے وی آئی پی لوگوں کو گارڈ آف آنر پیش کیا کرتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں ایک ہی میس میں ٹھہرے ہوئے تھے اس لئے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ۱۹۵۰ء کے مظہر میں اور ۱۹۶۲ء کے مظہر میں زمین و آسمان کا فرق تھا لیکن یہ فرق پودے اور پیڑ کا فرق تھا۔ اس کی بنیادی شرافت اور نفاست نفس کا وہی عالم تھا۔ اس کے کشادہ سینے میں کسی کے لئے حسد یا کینہ نہیں تھا۔ جوانی کی عمر جہاں آرزوؤں اور امنگوں

کی ہوتی ہے۔ وہاں گلے شکوؤں، شکایت اور تلخی کی بھی ہوتی ہے اس عمر میں دنیا جہاں پر تنقید کرنا اور چھوٹے بڑوں میں کیڑے نکالنا بھی عام ہوتا ہے لیکن محمد پور مدینے کا یہ سید زادہ چھوٹی چھوٹی خامیوں اور کم ظرفیوں سے بلند تھا۔ اس کے چہرے کی ابدی مسکراہٹ اسی طرح قائم تھی مجھے یقین ہے کہ شہادت کے وقت بھی یہ مسکراہٹ قائم رہی ہوگی۔ مومن کی نشانی بھی یہی ہے کہ جب اسے موت آتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تبسم ہوتا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید، تبسم بر لب اوست

۵۲۰ | راجہ محمد اعظم خان کے تاثرات

شاہ جی اور میں، آٹھویں اور نویں اور دسویں کلاس میں ایک ساتھ رہے۔ ۸۷/ لیفٹیننٹ کرنل انور چیمہ شاہ جی اور میں ہم تین کا یہ گروپ تھا۔

شاید لوگوں کو یقین نہ آئے ہم دوستوں کے سامنے ان کا جو رنگ تھا وہ سنجیدگی کا نہیں ظرافت کا تھا۔ شاہ جی کو ہم نے کبھی بور کرتے یا بور ہوتے نہیں دیکھا۔ دوستوں سے کون چھپ سکتا ہے جو بھی جیسا ہوتا ہے چھل چھلا کے سامنے آجاتا ہے لیکن میں مروت کے طور پر نہیں حقیقت کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ مظہر حسین شاہ کے اندر جو سید زادہ تھا وہ سادات کی بہترین روایات کا حامل تھا۔ مظہر بہت ہی شریف النفس اور پاک طینت انسان تھے ان کی شہادت کی خبر مجھ پر بجلی بن کر گری۔

مظہر شہید کے ایک اور ہم سبق و ہم نفس، نیوی کے کموڈور سید سجاد حیدر لکھتے ہیں:-

مجھے نہیں معلوم کہ اور دوستوں نے مظہر کے بارے میں کیا لکھا اور کہا ہے میرے ذہن میں اپنے عزیز دوست کی جو امیج ہے وہ ایک ہنس مکھ خوش مزاج اور قدرے شرارتی آدمی کی امیج ہے مظہر کی شکل سے ظاہر نہیں ہوتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت شوخ تھے اور لڑکوں کو نام

رکھ رکھ کر اور دوسرے عملی مذاق کر کے بہت تنگ کرتے رہتے۔ ۱۸۰۲ کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے بیچارہ اچھا بھلا سیدھا سادا نمازی لڑکا تھا اس کا نام مظہر نے مسلمان رکھ چھوڑا تھا۔ اسے خوب بناتے تھے اور تنگ کرتے رہتے تھے خود مجھے انہوں نے مجاہد کے لقب سے نوازا تھا لیکن یہ سب خوش دلی اور خلوص سے ہوتا تھا۔ مظہر کا ذاتی کردار بے داغ تھا اس وجہ سے ان کی کالج میں بڑی عزت تھی۔ مختصر یہ کہ بڑا پیارا انسان تھا۔ ہزاروں میں ایک۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بریگیڈیر (ریٹائرڈ) سلطان احمد (۱۷۳۸) ستارۂ جرأت (دوبار) نے ایک انٹرویو میں بتایا:۔
مظہر حسین شاہ میرے ساتھی تھے۔ ملٹری کالج کے رابرٹس ہاؤس (شیر شاہ ہاؤس) اور ریڈ ووڈ ہاؤس (ایم جی ہاؤس) میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے "شاہ جی" ان کا نک نیم تھا۔ شاہ جی کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے صاف ستھرے لباس، عادات اور گفتگو کے لحاظ سے اپنے ساتھیوں میں حد درجہ ممتاز تھے۔ لاکر، بستر، کتابیں ہر چیز انتہائی نفاست سے رکھتے تھے۔ مذہبیت کا رنگ غالب تھا۔ پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ ان کا عرف شاہ جی مذاقاً نہیں احتراماً تھا۔

بریگیڈیر محمد یونس (۱۹۴۹) کی بھی کیپٹن مظہر حسین شاہ شہید سے اچھی خاصی رسم وراہ تھی۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

مظہر جو دوستوں میں شاہ جی کے نام سے مشہور تھے۔ میرے کلاس فیلو بھی تھے اور گہرے دوست بھی۔ ۱۹۵۵ء کی گرمیوں میں ہم دونوں پی۔ایم۔اے کے تحریری امتحان کیلئے ایک ساتھ پنڈی میں ٹھہرے ہوتے تھے امتحان سے واپس آتے وقت مجھے یاد ہے ہم صدر کے ایک ہوٹل میں ضرور رکتے تھے۔ اور شاہ جی کا محبوب مشروب۔ لسّی مزے لے لے کے پیتے۔

شاہ جی کالج اور پی۔ایم۔اے دونوں جگہ اپنی۔ حس ظرافت (ہیومر) کے لئے معروف تھے۔ کالج میں تو خیر اتنا نہیں لیکن پی۔ایم۔اے میں خاص طور پر تربیت کا زمانہ خاص طور پر بہت کٹھن ہوتا ہے۔ کام کے دباؤ سے انسان چکرایا سا رہتا ہے۔ ایسے میں شاہ جی کے مزاحیہ فقرے ہم سب

کے موڈ کو شگفتہ رکھتے تھے اور ہنستے بولتے وقت گزر جاتا تھا۔

مظہر کے بارے میں بریگیڈیر عاشق حسین ملک (۱۱۰) لکھتے ہیں۔

ملٹری کالج میں مظہر مجھ سے بہت جونیئر تھے اور تھے بھی دوسرے ہاؤس میں۔ اس لئے ان سے متعلق کالج کے زمانے کی کوئی اہم اور قابل ذکر بات میرے ذہن میں محفوظ نہیں۔ البتہ ان کی کمیشنی زندگی کے بارے میں ضرور کچھ کہہ سکتا ہوں۔

مظہر نے اپریل ۱۹۵۸ء میں کمیشن لیا اور میری پلٹن ۸ پنجاب میں پوسٹ ہوئے جوان دنوں ڈیرہ نواب شاہ میں تھی۔ میں پلٹن کا ایڈجوٹینٹ تھا اس حیثیت میں مجھے سیکنڈ لیفٹیننٹ مظہر کی ابتدائی تربیت کا موقعہ ملا جو نئے افسروں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ چونکہ مظہر سمارٹ ہونے کے علاوہ ذہین اور ہوشیار تھے اس لئے میں نے ان پر زیادہ توجہ دی۔ اتفاق سے ان دنوں ملٹری کالج کے ایک اور اولڈ بوائے محمد اکرم (۱۱۱) بھی سپاہی کی حیثیت سے اسی پلٹن میں آ گئے تھے۔ وہ آرمی اسپیشل کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے مظہر کے ذمے یہ کام بھی لگا رکھا تھا کہ وہ انفارمیشن روم میں اکرم کی کچھ کوچنگ کیا کریں۔ مظہر ملٹری کالج سے اکرم کو جانتے تھے۔ بہرحال اس ذمہ داری کو انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے پورا کیا۔ بعد کو ان اکرم نے نہ صرف کمیشن لیا بلکہ میجر ہو کر شہید ہوئے اور نشان حیدر پایا۔

مظہر کو جو خود ۶۵ء میں شہید ہوئے اکرم نشان حیدر کی کوچنگ کا شرف حاصل تھا۔

مظہر کی صورت ہنسنے ہنسانے والی نہیں تھی۔ لیکن مزاج حد درجہ شگفتہ تھا۔ یونٹ میں وہ ہیومران یونی فارم کے عرف سے مشہور تھے۔ اپنی خوش طبعی اور خوش مزاجی کی وجہ سے وہ پلٹن کے افسروں اور جوانوں میں بہت مقبول تھے۔

مظہر گو درمیانے قد کے تھے لیکن حد درجہ اسمارٹ تھے۔ روشن چہرہ لیکن بارعب روشن تر آنکھیں موزوں خدوخال وردی ان پر بے طرح سجتی تھی اس لئے انہیں دوسرے ملکوں کے صدر اور وزیراعظم جیسی شخصیتوں کو پاکستان میں آتے جاتے وقت گارڈ آف آنر پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا رہتا

تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب وہ وزیر اعظم چین چو۔ این۔ لائی پاکستان آئے تھے تو سروسز کے مشترکہ گارڈ آف آنر کے دستے کی قیادت مظہر شہید ہی نے کی تھی۔ دم گفتگو نرم مظہر دم جستجو۔ گرم ہونا بھی جانتا تھا اس کا مظاہرہ اس نے ۶۵ء کے میدان کارزار میں کیا۔"

شہید کے آخری دن

مظہر شہید کے آخری دنوں کی کہانی بریگیڈیئر عاشق حسین (۱۴۱۰) سناتے ہیں۔

"لڑائی چھڑ جانے پر ہماری بٹالین دو دن وزیر آباد کے نزدیک کرم آباد ایک گاؤں کے قریب رہی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کرم آباد کے ایک باغیچے میں جہاں مولانا ظفر علی خان زمیندار کے مشہور ایڈیٹر کی پتھر کی قبر ہے اس کے پاس کھڑے کیپٹن مظہر نے مجھے کہا کہ آج میرا بے حد جی چاہ رہا ہے کہ میں گاؤں جا کر اپنی ماں سے مل آؤں کیونکہ ایک دو دن کے بعد ہم یہاں سے کسی اگلے مورچے پر چلے جائیں گے۔ چنانچہ دن کے دو بجے مظہر وہاں سے اپنی ماں سے ملنے چلا گیا۔ یہ راز صرف مجھ تک ہی محدود رہا شام آٹھ بجے مظہر جب واپس لوٹا تو میں اس وقت ٹینٹ کے اندر تھا جس میں مظہر اور میں اکٹھے رہ رہے تھے مظہر بے حد خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا جیسے ایک بے حد ضروری ذمہ داری پوری کرنے کے بعد ایک انسان کو سکون ملتا ہے۔ دوسرے روز مظہر سی کمپنی کے ہمراہ ہم سب سے جدا ہو کر لاہور کے محاذ پر چلا گیا۔ اس دن مظہر کی پریشانی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ۶ ستمبر کو جس دن جنگ کا اعلان ہوا تھا۔ پنڈی سے چلتے وقت اپنی بیوی اور بچوں کو نہ مل سکا تھا وہ کئی بار مجھ سے ذکر کر چکا تھا۔ اور میں اسے تسلی دیتا کہ اب تم جنگ کے بعد ایک بہادر مجاہد کی حالت میں سب گھر والوں کو جا کر مل لینا۔

مجھے ۲۶ ستمبر کی شام کبھی نہ بھولے گی۔ جب میں مظہر شہید کی وہ وردی جو شہادت کے وقت اس نے پہن رکھی تھی لے کر پنڈی ان کے سسر کے گھر پہنچا جہاں مظہر شہید کے بچے موجود تھے۔ قمیص کا اگلا چھاتی والا حصہ خون سے بھرا اور قمیص پھیلی ہوئی تھی اور خون کی دھاریں پتلون اور

لوٹ بھی بھر چکے تھے اور بوٹ کے اندر خون جم چکا تھا۔ اس کے ساتھ مظہر کی ٹوپی بیلٹ اور گھڑی بھی تھی۔ جسے دیکھ کر پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ بیگم مظہر نے جی بھر کر آنسو بہائے شہید کی بیٹی انیلا جسے پیار سے گھر میں رانی کہتے ہیں بھاگ کر آئی اور گھڑی ہاتھ میں لے کر امی سے کہنے لگی کہ امی یہ گھڑی تو ہمارے ابو کی ہے مگر ابو خود کہاں ہیں؟

گھر کب آئیں گے؟ اس پر پھر ہم سب روئے اور ننھی رانی میری گود میں آکر بیٹھ گئی۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحٰق (۲۴۴۴) لکھتے ہیں۔

کیپٹن مظہر شہید ۸ پنجاب کی سی کمپنی کے ساتھ تھے جو میجر انیس احمد کے زیر کمان تھی۔ جب اس "سی" کمپنی کو ۱۶ پنجاب کے ساتھ منسلک کیا گیا تو بٹالین سے جانے سے پہلے مظہر نے اپنے ایڈجوٹینٹ سے کہا:

مجھے معلوم ہے کہ جب تک میں نہیں جاؤں گا۔ لڑائی ختم نہیں ہوگی۔ میں وہاں پہنچ کر ہندو کو پیچھے دھکیلوں گا اور لڑائی کا فیصلہ ہوگا۔ یہ بنیا میرے بغیر کسی کی زبان نہیں سمجھتا۔

مذاقاً اور بے تکلفی سے کہے ہوئے یہ فقرے بھی کتنے سچے ثابت ہوئے کسی نے سچ کہا ہے کہ مذاق میں کہی ہوئی بات بھی نفسیاتی اعتبار سے قابل توجہ ہوئی ہے۔ بلکہ زیادہ قابل غور ہوتی ہے۔ چونکہ اس سے لاشعوری محرکات کی غمازی ہوتی ہے۔

مظہر شہید کی شادی، ان کے ماموں لیفٹیننٹ کرنل سید نذیر احمد شاہ کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ زبیدہ بیگم سے ۱۹۶۰ء میں ہوئی اس وقت مظہر لیفٹیننٹ تھے۔ ملازمت کے قواعد و ضوابط کے مطابق وہ ہنوز شادی کے مجاز نہیں تھے اس لئے شادی کی مراعات سے چند برس محروم رہے۔ بہر حال اس میں بھی خدا کی حکمت تھی ان کے دو بچے ہوئے ایک لڑکی انیلا زیب اور لڑکا شاہد مظہر انیلا زیب ۲۸ جولائی ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئی اور شاہد مظہر کی تاریخ پیدائش ۱۹ جولائی ۱۹۶۳ء ہے۔ دونوں نے ۱۹۷۹ء میں بہت اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر کے فرسٹ ایئر میں پری میڈیکل میں داخلہ لیا ہے۔ مظہر شہید کے بچے ماشاء اللہ ذہین اور شائستہ ہیں اور باپ کی ہو بہو شبیہ ہیں

خدا کرے دونوں پروان چڑھیں اور اپنی غم زدہ ماں کو سکھ پہنچائیں۔ آمین۔

کیپٹن مظہر جب ۱۹۶۵ء میں شہید ہوئے تو اپنے بھرے پرے کنبے کا واحد سہارا تھے ایک بیوہ ماں، چار بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی۔ ان سب کی کفالت ان کے ذمے تھی۔ جسے وہ بڑے انہماک اور خلوص سے ادا کیا کرتے تھے۔ خود زیادہ عمر نہیں تھی۔ لیکن بہنوں اور بھائیوں کے لئے مرحوم باپ کی جگہ لے لی تھی۔ یہ بھی ان کی شہادت کا اعجاز ہے کہ چاروں بہنیں افسروں سے بیاہی گئیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں۔ بھائی مظاہر حسین ملٹری کالج میں پڑھا ہے۔ اب لندن میں ہے اور خوش حال ہے۔ ماں مصلے پر بیٹھی دعائیں دیتی ہیں۔

کرنل نذیر احمد شاہ کے تاثرات

مظہر کے ماموں اور سسر کرنل نذیر احمد شاہ لکھتے ہیں۔

کپتان مظہر مرحوم کی شہادت میرے لئے ایک صدمہ جانکاہ سے کم نہیں تھی۔ وہ صرف میرے داماد ہی نہیں تھے۔ میرے بھانجے بھی تھے میں نے انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ اور ان کے ذاتی محاسن اور اعلیٰ کردار کے سبب ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں ستمبر ۱۹۶۵ء میں میری پوسٹنگ پنڈی میں تھی۔ زبیدہ ہمارے گھر میں آئی ہوئی تھی کہ یکایک ہمیں دو بجے خبر ملی کہ ان کی کمپنی کوچ کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ ہم باپ بیٹی دونوں فوراً ان کے بنگلے پر پہنچے تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ ان کو بلا بھیجا تو پیغام آیا کہ میں بہت مصروف ہوں۔ گھر نہیں آسکتا الوداع اور خدا حافظ۔ ہم نے بھی کمپنی لائنز میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ ہم دونوں ہراساں تھے نہ فکر مند۔ یہ شاید خاندانی روایات کے سبب سے تھا۔ چونکہ ہم کئی پشتوں سے پیشہ سپہ گری کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہمیں اطلاع موصول ہوئی کہ کپتان مظہر حسین شہید ہو گئے ہیں اور ان کی میت مدینہ پہنچ رہی ہے۔ گھر میں کہرام مچنا ایک قدرتی امر تھا۔ نوجوان بیٹی بیوہ ہوئی۔ کمسن بچے یتیم ہوئے۔ بیوہ ماں کا آخری سہارا ٹوٹا۔ نوجوان بہنیں شفقت اور سہارے

سے محروم ہوئیں۔ مگر ڈھارس اس بات سے ہوئی کہ ان کی جان کی قربانی ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لئے تھی۔ انہوں نے شہادت پائی۔ وطن عزیز کی عزت و ناموس کی خاطر مردانہ وار لڑتے ہوئے مرحوم گئے اولاد اور لواحقین کے لئے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ خاندان کے ایک سپوت نے وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا اور وطن کو ان طاغوتی طاقتوں کے پنجے سے بچالیا جو اسے نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ مظہر کی شہادت پر یہ میرے تاثرات تھے اور یہی کچھ باقی خاندان کے افراد کے تھے۔

ان کو اپنے گاؤں مدینہ میں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ زبیدہ مظہر نے ان کی قبر پر ایک چھوٹا سا مقبرہ بھی بنوا دیا ہے ان کی یاد میں گجرات کونسل نے کچہری گجرات سے موضع مدینہ جانے والی سڑک کا نام مظہر شہید روڈ رکھ دیا ہے۔

سدا رہے نام اللہ کا

جرأتوں کے نشان

پروفیسر سعید راشد

میجر محمدؐ اکرم شہید (نشان حیدر)

الف این ٹی

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ——— ۴-اپریل ۱۹۳۸ء

جائے پیدائش ——— ڈنگہ۔ گجرات

کمیشن ——— ۲۸ پی-ایم-اے

تاریخ شہادت ——— ۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ——— ۳۳ سال (غیر شادی) شدہ

اعزاز ——— نشانِ حیدر

مقام شہادت ——— ہلّی (مشرقی پاکستان)

مدفن ——— بوگرہ مشرقی (پاکستا

میجر اکرم شہید نشان حیدر

استاد: پانی کے مٹکوں میں پانی تم بھرتے ہو؟

شاگرد: جی جناب

استاد: کس وقت؟ میں تو جب اسکول آتا ہوں پانی بھرا ہوتا ہے؟

شاگرد: جناب، میں فجر کی نماز کے بعد پانی بھرنے آتا ہوں۔

استاد: اتنے سویرے آنا اور اتنی دور سے پانی لانا بچے تو کیوں تکلیف اٹھاتا ہے۔

شاگرد: جناب، یہ کوئی تکلیف نہیں۔

استاد: پھر بھی کیا فائدہ ہم نے ماچھی عورت جو رکھی ہوئی ہے اسے دو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ جس کا کام ہے اسے کرنے دے۔

شاگرد: جناب یہ ثواب کا کام ہے آپ مجھے پانی بھرتے رہنے کی اجازت دے دیں۔

یہ استاد منشی فرمان علی تھے۔ پرائمری اسکول نکا کلاں کے ہیڈ ماسٹر جو اپنے اسکول کے چوتھے درجے کے ایک طالب علم کو پیار سے تنبیہہ کر رہے تھے۔

صبح کا وقت ہے دو نوجوان نکا کلاں سے نکلے اور باہر کھیتوں میں سیر کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ کھیتوں کے آس پاس کہیں ببول کی شاخوں کی باڑھیں لگی ہوئی ہیں جن کے کانٹے جہاں تہاں پگڈنڈیوں پر پڑے ہیں جوں ہی کوئی کانٹا پڑا نظر آتا ہے ان دو

میں سے ایک سانولے رنگ اور لمبے قد کا نوجوان رُکتا ہے اور کانٹے کو اٹھا کر ایک طرف کرتا ہے۔ اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح جب دو چار بار ہو چکا تو دوسرے نوجوان سے نہ رہا گیا۔

دوسرا نوجوان بھائی جان اس طرح تو سیر ہو چکی آپ اتنی بار ان کمبخت کانٹوں کو اٹھانے رُکتے ہیں کہ سیر کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔

پہلا نوجوان اصغر۔ لڑکے بالے ننگے پیر بھی ادھر سے گزرتے ہیں۔ اگر کسی کے یہ کانٹا چبھ جائے تو۔

دوسرا نوجوان چبھے کیوں؟ چلنے والا دیکھ کر چلے۔ آخر یہ کانٹے ہم نے تو نہیں بکھیرے ہم کیوں اس بکھیڑے میں پڑیں۔

پہلا نوجوان پھر اور کون پڑے گا؟ ہم لوگ پڑھے لکھے ہیں سمجھدار ہیں اگر ہم بھی ان کانٹوں کو نہ اٹھائیں گے تو پھر ان کانٹوں کو اٹھانے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟

اصغر میرے بھائی ناراض نہ ہو۔

یہ واقعہ ۱۹۵۹ء، ۱۹۵۸ء کا ہے۔ نکا کلاں پرائمری اسکول کا وہ بچہ جو دوسروں کے لئے پانی بھرنے کی اجازت مانگ رہا تھا اور یہ نوجوان جو کانٹے اٹھانے پر اصرار کر رہا تھا اور پاکستانی فوج کا وہ مجرم ہلی کے محاذ کا وہ ہیرو۔ جس نے ۵ دسمبر ۷۱ء کو ملک کی سالمیت اور ناموس کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ وہ کوئی اور نہیں۔ محمد اکرم شہید نشان حیدر ہی تھے۔ اگر دیکھا جائے تو اکرم کی ساری زندگی پیاس بجھاتے اور کانٹے اٹھانے گزری۔ کبھی اپنی راہ کے کانٹے اٹھائے۔ کبھی اپنے والدین۔ بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے عزیزوں، دوستوں کی راہ کے کانٹے اٹھائے اور آخر میں پاکستان کی راہ کے کانٹے اٹھاتے اٹھاتے وہ لہولہان ہو گئے اور اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ان میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی زندگی اور کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

نسل اور خاندان

اب سے کوئی دوسو سال پہلے ونہار تحصیل پنڈ دادن خان سے اعوانوں کا ایک خاندان ضلع جہلم کے گاؤں نکا کلاں آکر آباد ہوا۔ خاندان کے سربراہ کا نام جوایا خان تھا۔ یہی جوایا خان میجر محمد اکرم شہید کے دادا کے دادا تھے۔

اکرم کے والد حوالدار سخی محمد نے فوج میں طویل عرصے تک ملازمت کی ہے تایا صوبیدار میجر گوڈر خان نے ایک زندگی فوج میں گزار دی۔ لیکن ان کے دادا فضل خان اور پڑدادا الٰہی بخش زراعت پیشہ تھے۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں میں راجہ خان اور جیون خان اور عبداللہ خان نے سپہ گری میں بڑا نام پیدا کیا۔

اعوان نسلی اعتبار سے قطب شاہی سید ہیں اور پنجاب میں تقریباً ایک ہزار سال سے آباد ہیں۔ مذہب اور سپہ گری ان کے خون میں ہے۔ میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر اعوانوں کی بہترین نسلی روایات کے حامل تھے۔

اکرم کے والدین

اکرم کے والد حوالدار سخی محمد ۱۹۳۵ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اس وقت سے اب تک نمازی ہی نہیں تہجد گزار بھی ہیں یہی حال اکرم کی والدہ ماجدہ عائشہ بی بی کا ہے۔ وہ بھی حد درجہ عبادت گزار اور شریف النفس خاتون ہیں۔ اکرم کے گاؤں کی مسجد بھی اسی خاندان کی کوششوں سے تعمیر ہوئی ہے گویا مذہبیت اور شریف النفسی اکرم کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ سچ ہے جیسا گل ہوتا ہے ویسی بو ہوتی ہے۔

پیدائش

اکرم کا آبائی گاؤں نکا کلاں ہے جو جہلم سے بیس میل جنوب میں جہلم پنڈ دادن خان روڈ

پر دارا پور کے قریب واقع ہے۔ لیکن اکرم پیدا اپنی ننھیال ڈنگہ (ضلع گجرات) میں ہوئے تھے۔ مہینہ سوا مہینے بعد ان کی والدہ عائشہ بی بی انہیں لے کر نکا کلاں آ گئی تھیں۔ اکرم کی پرورش، پرداخت، ابتدائی تعلیم سب نکے ہی میں ہوئی۔ اس لئے اکرم کو نکا کلاں کا لالہ صحرا سمجھنا چاہیئے۔

اکرم کی تاریخ پیدائش ۴/ اپریل ۱۹۳۸ء ہے۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

اکرم کا بچپن دیہات کے عام بچوں کی طرح گلی ڈنڈا اور کھدو کھیلتے ہوئے گزرا۔ جب چار برس کے ہوئے تو گاؤں کی مسجد میں مولوی اصغر صاحب سے قرآن پڑھنے بیٹھے۔ پانچ برس میں نکا کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اس سکول سے اکرم نے پرائمری کی چار جماعتیں پاس کیں۔ پرائمری سکول نکا کلاں کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے اکرم جب چوتھی جماعت میں تھے تو اسکول کے بچوں کے لئے پینے کا پانی اپنی خوشی سے بھرتے تھے حالانکہ پانی بھرنے کیلئے اسکول کی طرف سے ایک ماچھی عورت دو روپے مہینے پر مقرر تھی۔ جب سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے اکرم کو سمجھایا کہ بیٹے کیوں تکلیف کرتے ہو۔ پانی بھرنے کیلئے نوکرانی جو ہے۔ لیکن اکرم نہ مانے اور پانی بھرتے رہنے کی ان سے اجازت طلب کی۔

نکا کلاں کے پرائمری اسکول سے فارغ ہو کر اکرم، نے قریب کے گاؤں چکری کے مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے اکرم نے پانچویں اور چھٹی جماعتیں پاس کیں۔

چکری اسکول کا ایک یادگار واقعہ

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اس چھوٹی سی عمر میں بھی اکرم کا ضمیر بیدار تھا ایک بار ایسا ہوا کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر فرمان علی نے کلاس کی فیس جمع کی اسے رومال میں باندھا اور میز پر

رکھ دیا۔ جب گھنٹی ہوئی تو وہ کرسی سے اٹھے اور جلدی سے باہر چلے گئے۔ فیس کا رومال ان، انہیں یاد نہ رہا۔ جب اکرم نے دیکھا کہ فیس کی رقم یوں میز پر پڑی ہے تو وہ دوسرے لڑکوں کی طرح کھیلنے کودنے یا کھانے پینے باہر نہیں گئے۔ میز کے ساتھ لگ کے کھڑے ہو گئے اور رومال پر نظر رکھی۔ کچھ دیر بعد فرمان علی صاحب ہانپتے واپس آئے اور دیکھا کہ فیس کا رومال جوں کا توں میز پہ پڑا ہے۔ اکرم پاس کھڑے ہیں۔ رقم کو صحیح و سلامت پاکر ان کی جان میں جان آئی۔ بہت خوش ہوئے اور سارے اسکول کے سامنے اکرم کی تعریف کی۔

اکرم ملٹری کالج میں

چھٹا درجہ مڈل اسکول چکری سے پاس کر کے اکرم ملٹری کالج جہلم میں ۱۶ / اگست ۱۹۴۸ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے اور ۱۸۱۱ کالج نمبر ملا۔ اکرم کے بڑے بھائی عبدالرشید پہلے سے یہ ج میں پڑھ رہے تھے۔ اکرم نے شروع کے دو سال رابرٹس ہاؤس (شیر شاہ ہاؤس) میں گزارے ۱۹۵۰ء میں وہ آکنلک ہاؤس میں منتقل ہوئے۔ ملٹری کالج میں اپنی تعلیم کے باقی تین سال انہوں نے اسی ہاؤس میں گزارے۔ دوسری جنگ عظیم میں تعمیر شدہ یہ کچا ہاؤس اب گرا دیا گیا۔

اکرم چکری اسکول کے اردو میڈیم سکول سے آئے تھے۔ وہاں ان کا شمار اچھے طلبا میں سے تھا۔ یہاں ذریعہ تعلیم سراسر انگریزی تھا۔ اس وجہ سے وہ یہاں اچھی طرح چل نہ سکے۔ دو بار فیل ہوئے اور جولائی ۱۹۵۳ء میں انہیں کالج کو خیر باد کہنا پڑا۔

لیکن ملٹری کالج میں پانچ برس کی اس تعلیم نے اکرم کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ یہیں انہوں نے ہاکی کھیلنا سیکھا اور اس شوق کو پروان چڑھایا۔ کالج ہی میں اکرم کو مطالعہ خاص طور پر تاریخی مطالعہ کی عادت پڑی۔ اسی کالج کی فضاؤں میں اکرم نے اپنے آپ کو دریافت کیا۔ یہیں ان کی امنگیں بیدار ہوئیں۔ یہیں انہوں نے وہ خواب دیکھے جن کو حقیقت میں بدلنے کے لئے انہوں نے طویل جدوجہد کی۔ ملٹری کالج سے اکرم کی محبت اور قلبی تعلق کا ثبوت وہ انگریزی مضمون

ہے۔ جو انہوں نے پی ایم اے جانے سے ذرا پہلے جون ۱۹۶۱ء میں لکھا۔ اس میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ ملٹری کالج پاکستان کا بہترین ادارہ ہے اور اعتراف کیا کہ میں نے جو کچھ سیکھا اسی ادارے سے سیکھا۔ ہم نے میجر اکرم شہید نشان حیدر کی مفصل سوانح حیات اکرم نشان حیدر میں اس انگریزی مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے۔

اکرم ۴/۱ پنجاب کی بوائز کمپنی میں

جولائی ۱۹۵۳ء میں ملٹری کالج سے رخصت ہونے کے بعد اس زمانے کے دستور کے مطابق اکرم اپنے والد کی رجمنٹ ۴/۱ پنجاب میں بحیثیت رنگروٹ بھرتی ہو گئے۔ چونکہ رنگروٹی کی عمر کو ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اس لئے ۴/۱ پنجاب کی بوائز کمپنی میں بھیج دیئے گئے۔ ۴/۱ پنجاب رجمنٹ کا سنٹر ان دنوں جہلم ہی میں تھا۔ اس لئے اکرم نے پنجاب سنٹر میں تین سال گزارے دو سال بوائز کمپنی میں اور تقریباً ایک سال سنٹر میں باقاعدہ رنگروٹی کی تربیت حاصل کی۔

اکرم نے جون ۱۹۵۴ء میں بوائز کمپنی سے فرسٹ رومن اردو۔ فرسٹ میپ ریڈنگ اور تھرڈ انگلش کا امتحان پاس کیا۔ ملٹری کالج کے پس منظر کی وجہ سے بوائز کمپنی میں اکرم کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ چھ مہینے کے بعد ہی انہیں بوائز کی قاسم پلاٹون کا کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔ اور دوسرے سال اکرم کو بوائے کمپنی کمانڈر کے عہدے پر ترقی دے گئی۔

اکرم ۴/۱ پنجاب سنٹر میں بحیثیت رنگروٹ

دو سال بوائز کمپنی میں گزارنے کے بعد اکرم نے ۴/۱ پنجاب سنٹر میں نو مہینے کا رنگروٹی کا کورس کیا۔ اس تربیت کے دوران اکرم کو سیکشن کمانڈر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا اور پیرا کے نشانہ بازی کے مقابلے میں شوٹنگ میڈل ملا۔ یہ دونوں عزتیں کم نہیں تھیں۔ وہ بہترین رنگروٹ کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہوتے لیکن ان کی منزل کمیشن تھی۔ جس کے لئے وہ انچ انچ کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔

اکرم ۸ پنجاب میں

اکرم کی آبائی یونٹ ۴/۱۴ پنجاب تھی۔ اس کے سنٹر سے فارغ ہوکر وہ جولائی ۱۹۵۶ء میں اسی یونٹ میں پوسٹ ہوئے۔ اس یونٹ کا نیا نام ۸ پنجاب تھا۔ ۸ پنجاب میں اکرم نے پانچ سال گزارے اور زیادہ تر انٹیلی جنس سیکشن میں نوکری کی۔ یہیں سے ۵۹-۱۹۵۸ء میں انہوں نے آرمی اسپیشل پاس کیا اور دوبار کمیشن کے لئے کوشش کی۔ دوسری بار ۱۹۶۱ء میں وہ پی ایم اے کے لئے کامیاب ہوئے۔

۱۹۶۱ء کے اوائل میں وہ ۸ پنجاب کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے وہیں انہیں پی ایم اے جانے کا نوٹس ملا۔ ڈھاکہ سے آکر وہ ۲۸ پی ایم اے لانگ کورس کے لئے اکتوبر ۱۹۶۱ء میں کاکول پہنچے

اکرم پی۔ایم۔اے کاکول میں

پی۔ایم۔اے میں ہاکی کے کھلاڑی کی حیثیت سے انہوں نے جاتے ہی اپنی جگہ بنالی۔ وہ اکیڈمی کی ہاکی ٹیم میں شامل کر لئے گئے اور کئی بار باہر کے مقابلوں میں اکیڈمی کی نمائندگی کی اور آخر کار اکیڈمی کا ہاکی کلر حاصل کیا۔ نشانہ بازی میں بھی انہوں نے اعزاز حاصل کیا۔

اکیڈمی میں اکرم اپنی سنجیدگی کم گوئی جفاکشی اور گہرے احساس ذمہ داری کے لئے مشہور تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں انہیں ایف ایف آر میں کمیشن ملا۔

اکرم ۴ ایف ایف آر میں

کمیشن ہوتے ہی اکرم کو ۴ ایف ایف آر میں پوسٹ کیا گیا۔ ان دنوں یہ یونٹ لنڈی کوتل میں تھی۔ جب مئی ۱۹۶۵ء میں ایمرجنسی کا اعلان ہوا تو ۴ ایف ایف آر کو سیالکوٹ پہنچ کر سرحدی دفاع سنبھالنے کا حکم ہوا۔ تو اکرم نے بحیثیت لیفٹیننٹ اس کارروائی میں حصہ لیا

اور جو دو ایک مشن ان کے سپرد کئے گئے ان کو انہوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اس سے دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ اس بظاہر خاموش اور منکسر المزاج نوجوان افسر میں تو جرأت اور ہمت کی چنگاریاں نہیں آگ بھری ہوئی ہے۔

اکرم کا حصہ ۶۵ء کی جنگ میں

ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں اکرم کی یونٹ ۴ ایف ایف آر کی طرف سے ان کو ظفر وال سیکٹر میں دو بار دو اہم مشن سپرد کئے گئے۔ جن کو انہوں نے بکمال دلیری اور فراست پورا کیا ان کارروائیوں کی تفصیل ہم نے ۴ ایف ایف آر کے اس وقت کے ایڈجوٹینٹ (اب بریگیڈیر) اے قادر کے حوالے سے حیات اکرم میں پیش کی ہے۔

ایف ایف آر کی کوارٹر ماسٹری

۱۹۶۶ء میں اکرم کو کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی اور انہیں اپنی پلٹن کا کوارٹر ماسٹر بنا دیا گیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن اس کو بھی انہوں نے حد درجہ کامیابی اور دیانت داری سے انجام دیا اس منصب کے قواعد و ضوابط میں انہیں سند (اتھارٹی) سمجھا جاتا تھا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر انہیں یونٹ میں اتھارٹی سر کہا جاتا تھا۔

اکرم مشرقی پاکستان میں

اکرم مشرقی پاکستان ۱۹۶۱ء میں ۸ پنجاب کے نائیک کی حیثیت سے گئے تھے۔ اب وسط ۶۸ء میں ان کی پوسٹنگ ایسٹ پاکستان رائفلز کے چھٹے ونگ کے اسٹنٹ کمانڈر کی حیثیت سے ہوئی ان کا ہیڈ کوارٹر تو راجشاہی میں تھا لیکن انہیں ایک طویل سرحد کی نگرانی کی غرض سے اس پورے علاقے میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ اکرم نے نہ صرف اپنے فرائض منصبی کو پوری تندہی

اور جانفشانی سے انجام دیا بلکہ اس کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے بنگالی سیاسی لوگوں سے ملے بھی اور اس علاقے کے جغرافیائی حالات اور معاشرتی معاشی حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اپنے مطالعہ و مشاہدہ پر مبنی بڑے دلچسپ اور طویل خط لکھے۔ جن کے اقتباسات ہم نے حیاتِ اکرم میں نقل کئے ہیں۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکرم کے دل میں اسلام اور پاکستان کا درد کتنا زیادہ تھا ان خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔

مشرقی پاکستان سے واپسی

تقریباً دو سال ای پی آر کی خدمت کرنے کے بعد وہ وسط ۱۹۷۰ء میں واپس اپنی یونٹ میں پہنچے۔ ان کی آمد پر یونٹ میں باقاعدہ خوشی منائی گئی۔ کچھ ان کے ہاکی کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے۔ اور کچھ ان کے حسن سلوک اور حسن کارکردگی کی وجہ سے۔ یونٹ میں واپس آنے کے کچھ دنوں بعد وہ انٹیلی جنس کورس کے لئے مری گئے وہاں سے فارغ ہوکر وہ پھر یونٹ میں آملے۔

جب ۱۹۷۰ء کے آواخر میں یونٹ کوئٹہ منتقل ہوئی تو وہ یونٹ کے ساتھ کوئٹہ چلے گئے۔

وہ اب میجر ہو چکے تھے کوئٹہ میں ان کی دو ہی دلچسپیاں تھیں اسٹاف کالج کے امتحان کی تیاری کرنا اور یونٹ کی ہاکی ٹیم تیار کرنا اور یہ دونوں کام وہ حسب عادت پوری تندہی سے انجام دے رہے تھے یہ سلسلہ ابھی چند مہینے چلا تھا کہ اس وقت کے مخصوص سیاسی حالات کے پیش نظر ۴ ایف ایف آر کو مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا۔ یہ مارچ ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتے کی بات ہے۔

اکرم تیسری بار مشرقی پاکستان میں

میجر اکرم اپنی یونٹ کے ہراول دستے کے ساتھ ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو جیسور پہنچے

وہاں پہنچتے ہی مصروف کارزار ہوگئے۔ ۲۰ اپریل کو میجر اکرم کی سی کمپنی نے لال منیر ہٹ کے ہوائی اڈے کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اس کے بعد سی کمپنی نے سرحدی چوکی مغل ہٹ اور باندا گاؤں کو باغیوں سے صاف کیا۔ ۱۹ اپریل سے ۱۶ مئی ۷۱ء تک میجر اکرم اپنی سی کمپنی کے ساتھ کڑی گرام اور چل ماڑی کے علاقے میں ضروری کارروائی کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنی پلٹن سے بوگرہ میں جا ملے اور تین دن بوگرہ میں رہے۔

اکرم ہلّی کے محاذ پر

۱۹ مئی ۷۱ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی نے ۲۶ ایف ایف کی ایک کمپنی سے ہلّی کا چارج لیا۔ ۱۹ مئی ۷۱ء سے ۲۳ اکتوبر تک اکرم ہلی اسٹیشن اور اس کے آس پاس کے علاقے میں رہے۔

ہلّی بالکل سرحد پر واقع ہے ریلوے لائن ہلّی کے قصبہ کے بیچ سے گزرتی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ریلوے اسٹیشن پاکستانی علاقے میں تھا۔ لائن کے اس پار ہندو اور مکتی باہنی والے تاک لگائے بیٹھے تھے جوں ہی کوئی گاڑی گزرتی وہ اس پر فائرنگ کرتے۔ ہلّی اسٹیشن اور ریلوے کی بڑی جنگی اہمیت تھی۔ یہی ہماری سپلائی لائن بھی تھی۔ اور دشمن اسی کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔

۲۳ اکتوبر ۷۱ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی کی جگہ ۱۴ ایف ایف آر کی ڈی کمپنی تعینات کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ سی کمپنی کو سانس لینے کا موقعہ ملے۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے بگڑ رہے تھے کہ کسی آرام کی گنجائش نہ تھی۔ حقیقتاً اکتوبر کے شروع دنوں ہی سے بھارت کی باقاعدہ فوج کے حملے شروع ہو گئے تھے اور ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد ہلی پر قبضہ کیا جائے۔

۲۲ اور ۲۳ نومبر ۷۱ء کی رات کو ۱۴ ایف ایف آر کی ڈی کمپنی پر جو ہلی اسٹیشن پر متعین تھی دشمن نے زبردست حملہ کیا اور ہلی کے قریب کی ایک پوسٹ پر قبضہ کر لیا۔ جس سے ہماری سپلائی لائن کو زبردست خطرہ پیدا ہوگیا چنانچہ اس پوسٹ کو ہر قیمت پر دشمن کے قبضہ سے

چھڑانا ضروری ہوگیا اس پوسٹ پر دشمن کی پوری بٹالین قبضہ جمائے تھی۔

۳ دسمبر ۱۷ء کو میجر اکرم کی سی کمپنی کو حکم ملا کہ وہ دشمن پر داہنی طرف سے دباؤ ڈالے تاکہ دشمن مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔ اس طرف سے دباؤ ڈالا گیا تو دشمن نے جس کے پاس نفری اور اسلحہ کی کمی نہیں تھی۔ براہ راست تین چار حملے کئے چار اور پانچ کی رات دشمن نے میجر اکرم کی کمپنی کی اسی پلاٹون پر جس کی وہ خود کمان کر رہے تھے تابڑ توڑ کئی حملے کئے۔ جس سے پلاٹون کو بہت نقصان پہنچا۔

صورت حال یہ تھی کہ ہمارے پاس نہ ٹینک تھے اور نہ توپ خانے کا فائر۔ دشمن کے ٹینک ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے۔ کچھ وقت میں پوری کمپنی کے مکمل طور پر تباہ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہلی کی پوری پوزیشن زبردست خطرے سے دوچار تھی۔ ہلی کی دفاعی جنگی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ میجر اکرم نے وہ غیر معمولی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کو بروئے کار لانا عام انسانوں کا کام نہیں ہوتا اور وہ اہم فیصلہ تھا دشمن کے ٹینکوں پر ڈائریکٹ ہٹ کرنا۔

شیر کچھار سے نکلتا ہے

۵ دسمبر ۱۷ء کی صبح کو نو دس بجے وہ ایک چائنا لانچر لے کر اپنی خندق سے نکلے۔ ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور آہستہ آہستہ دشمن کے ٹینکوں کی طرف بڑھنے لگے آرٹلری کے متواتر فائر سے ہر طرف دھواں تھا۔ بہرحال وہ اسی آگ اور دھوئیں کی آڑ میں ڈیڑھ دو سو گز آگے تک پہنچ گئے اور وہاں سے پوزیشن لے کر دشمن کے ٹینکوں پر ڈائریکٹ ہٹ کیا اور تین ٹینک تباہ کر دیئے دشمن کو گمان بھی نہیں تھا کہ اتنے قریب سے فائر ہوگا۔ بہرحال جب دھواں اٹھا تو دشمن نے وہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ ایک پاکستانی میجر ان کے سر پہ آکر ان کے ٹینکوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ یکایک دشمن کی مشین گنیں حرکت میں آگئیں۔ دھڑا دھڑ گولیاں برسنے لگیں۔ میجر اکرم اور دو سپاہی براہ راست برسٹ سے شہید ہو گئے۔

صد شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

نشانِ حیدر کا فرمان

میجر محمد اکرم شہید کو اس عظیم کارنامے کے لئے نشانِ حیدر کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس فرمان کے الفاظ یہ ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں وہ ۴ ایف ایف آر کی اگلی کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے جو ہلی کی پوزیشن کا دفاع کر رہی تھی۔ اس جگہ کو ہندوستان کی جارحانہ منصوبہ بندی میں ایک کلیدی مقام حاصل تھا اس پر قبضہ کر کے دشمن مشرقی پاکستان میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ہلی کے عین سامنے بالر گھاٹ میں متعین دشمن کے بیسویں پہاڑی ڈویژن کا پورا دباؤ اس پوزیشن پر تھا اور روزانہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دشمن نے بکتر بند دستوں اور توپ خانے کی مدد سے اس پوزیشن پر پے در پے حملے کئے۔ اس کے علاوہ دشمن نے تمام دن اس کو شدید حملوں کا نشانہ بھی بنائے رکھا۔ میجر محمد اکرم کے زیرِ کمان دستوں نے نہ صرف مثالی قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا بلکہ انتہائی ناساز گار حالات میں دشمن کے شدید حملے کی زد میں ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے ہتھیاروں کو بے مثال جرأت سے کام لیتے ہوئے انتہائی موثر طریقے سے استعمال کیا آخر کار وہ دشمن کے ایک ٹینک کا راکٹ لانچر سے مقابلہ کرتے ہوئے ٹینک کی گولی سے شہید ہو گئے ان کی شہادت کے بعد نشانِ حیدر کا اعزاز عطا کیا گیا۔

شہید کی تدفین

شہید کے جسد خاکی کو دشمن کے عین سامنے سے اٹھا کے لانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ تمام دن نا ممکن رہا۔ رات کو بمشکل لاش کو بٹالین ہیڈ کوارٹر لایا جا سکا دوسرے دن شہید کو بوگرہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

بلی کے معرکے اور شہادت کے واقعہ اور تدفین کی پوری تفصیلات پوری تحقیق کے ساتھ ہم نے حیات اکرم میں لکھی ہیں صوبیدار میجر محمد اعظم علوی جنہوں نے شہید کے تابوت کو قبر میں اتارا ان کا انٹرویو بھی درج کیا ہے اور شہادت سے پہلے شہید کی وہ گفتگو بھی نقل ہے جس میں انہوں نے جان پر کھیل جانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔

شخصیت وکردار

میجر اکرم نے اتنا بڑا کارنامہ محض اتفاقاً یا کسی فوری جذبے کے تحت انجام نہیں دیا۔ شروع سے ان کی اٹھان ہی ایسی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت ماحول اور افتادِ طبع سب کا رخ اس دل و دماغ کی نشوونما کی طرف تھا جس سے انسان غازی اور شہید بنتا ہے۔

احسان اور ایثار یہ دو بنیادی اسلامی قدریں ہیں اکرم کی شخصیت کا تانا بانا انہی دو اسلامی قدروں سے بُنا گیا تھا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اکرم بریشم بھی تھے اور فولاد بھی۔

اکرم کی شخصیت و کردار کا تفصیلی جائزہ تو ہم نے حیات اکرم میں پیش کیا ہے۔ یہاں اس کتاب سے چند انٹرویو پیش کئے جاتے ہیں جن سے شہید کی شخصیت و کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ انسان بچپن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی وہ تمام عمر رہتا ہے خواہ وہ اپنے اوپر لاکھ پردے ڈالے اور بچپن لڑکپن کا حال ماں۔ بہن اور بھائی سے بڑھ کر کون جانتا ہے اس لئے ہم اکرم شہید کی والدہ بہن اور بھائی کے انٹرویو نقل کرتے ہیں۔

اکرم شہید کی والدہ عائشہ بی بی کا انٹرویو

سوال:۔ پہلے آپ کچھ اپنے اور بچوں کے بارے میں فرمائیں۔

جواب:۔ میرا میکہ ڈنگا ضلع گجرات میں ہے اولادیں، سب سے بڑی بیٹی مختار ہے جو سامنے بیٹھی ہے پھر میرے چھ بیٹوں میں سے اکرم، منجھلا بیٹا تھا بڑا رشید ہے وہ بھی آپ کے ملٹری کالج میں پڑھا ہے اور اب صوبیدار ہے۔

سوال:۔ اکرم شہید پیدا کہاں ہوئے تھے۔

جواب:۔ میرے میکے ڈنگے گجرات میں۔

سوال:۔ وہاں اکرم آپ کے ساتھ کتنی مدت رہے؟

جواب:۔ چھ مہینے یا شاید اس سے بھی کم کچھ ٹھیک یاد نہیں رہا۔

سوال:۔ اکرم بچپن میں کیسے تھے؟

جواب جب چھوٹا تھا تو پلنگڑی میں لیٹا اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے چپ چاپ لیٹا انگوٹھا چوستا رہتا۔ جب ذرا بڑا ہوا اور دوڑنے بھاگنے لگا تو بھی ضد کرنے اور رونے دھونے کی عادت نہیں تھی۔

سوال:۔ بچپن میں کھانے پینے کی کس چیز کا شوق زیادہ تھا؟

جواب:۔ دودھ بڑے شوق سے پیتا تھا بلکہ دودھ پینے کا اسے ہوکا تھا۔ گھر کا دودھ تھا میں رات کو سب بچوں کو گلاس گلاس بھر دودھ دیتی تھی۔ جب اکرم کی باری آتی تو اس کی کوشش ہوتی اس کا گلاس لبا لب بھر جائے ایک بار تو ضد کرنے لگا کہ گڈوی میں جتنا دودھ ہے وہ میرے گلاس میں انڈیل دو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا۔

سوال: پڑھنے کی بسم اللہ کب ہوئی؟

جواب:۔ کوئی چار پانچ سال کا ہوگا کہ اسے پڑھنے بٹھایا ننکے میں ایک اسکول تھا چار جماعتوں

تک کا سب سے پہلے اس میں جانا شروع کیا اس اسکول کے دو ماسٹر کرم الٰہی اور غلام نبی اکرم پر بہت مہربان تھے۔

سوال :۔ پرائمری اسکول کے زمانے کی کوئی خاص بات؟

جواب :۔ ساتھیوں کو سیاہی قلم دیتا رہتا تھا۔ بعض بچے اس کے ساتھ آکر پڑھتے بھی تھے۔ سکول کی آدھی چھٹی میں بعض ساتھیوں کو اپنے ساتھ کھلاتا پلاتا بھی تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ اپنا کام ختم کر کے کام کاج میں مدد بھی دیا کرتا تھا۔

سوال :۔ کس قسم کی مدد؟

جواب :۔ گھر کے مال مویشی کی دیکھ بھال چارہ ڈالنا کنویں پر سبزی کی کڑی نگرانی کرنا۔ گھر کے لئے پانی بھر کے لانا ایسے چھوٹے موٹے کام۔ اس معاملے میں اس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اگر بڑا بھائی کام کرنے جا رہا ہے جیسے چارہ ڈالنا پانی لانا تو وہ خود آگے بڑھ کر یا وہ کام خود کرتا یا بڑے بھائی کو کام کرنے میں مدد دیتا۔

سوال :۔ نلکے کی چار جماعتوں کے بعد کہاں پڑھے؟

جواب :۔ ساتھ گاؤں ہے چکری وہ مڈل اسکول تھا وہاں داخل کرا دیا تھا۔

سوال :۔ چکری مڈل اسکول کے زمانے کا کوئی واقعہ؟

جواب :۔ ہاں۔ ایک بہت مشہور ہے۔ چکری اسکول کے ہیڈ ماسٹر اللہ بخشے ماسٹر صاحب دین بڑے بھلے آدمی تھے لیکن نظر موٹی تھی۔ وہ اکرم پر جو اس وقت چھٹے درجے میں تھا اتنا اعتبار کرتے تھے کہ ان کے درجے کی فیس وہی وصول کرتا اور کھرے کھوٹے کو دیکھتا جاتا۔ ایک بار ماسٹر صاحب دین فیس کی رقم میز پر رکھ کر بھول گئے اور نماز پڑھنے چلے گئے۔ اتنے میں اسکول کی چھٹی ہو گئی اکرم نے دیکھا کہ میز پہ فیس کی رقم رومال میں بندھی پڑی ہے۔ تو وہیں کھڑا نگرانی کرتا رہا۔ جب ماسٹر صاحب واپس آئے تو رقم ان کے حوالے کر کے گھر آیا۔

سوال :۔ اماں جی۔ کوئی ایسا واقعہ بھی ہوا جس سے آپ کو اندازہ ہوا ہو کہ آپ کا بیٹا غیر معمولی ہے؟

جواب :۔ نہیں۔بس ایک بار ہمارے پیر صاحب نے ایک ایسی بات کی جس نے مجھے حیران بلکہ پریشان کیا۔

سوال :۔ وہ کیا ؟

جواب :۔ ہمارے گاؤں نکے میں ہزارے کے ایک بزرگ پیر گل بادشاہ رہتے تھے۔جواب فوت ہو گئے ہیں یہ دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے اکرم گھر چھٹی آیا ہوا تھا۔جب وہ جمعے کی نماز کے لئے مسجد میں پہنچا تو پیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے گوڈے کو ہاتھ لگایا جس طرح کسی بڑے کی تعظیم کی جاتی ہے۔اکرم منع ہی کرتا رہ گیا اور بہت شرمندہ ہوا نماز کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ آج یہ واقعہ ہوا ہے میں تو سنتے ہی ڈر گئی کہاں پیر فقیر اللہ والے اور کہاں ہم گنہگار۔بہر حال میں نے اس سے کہا۔جا، جا کر معافی مانگ، اور کچھ نذر گزار چنانچہ شام کو وہ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی مانگی۔پیر گل جی نے صرف اتنا کہا۔بچہ، میں نے تجھے سلام نہیں کیا۔مجھے تیری پیشانی پر جو چیز نظر آئی ہے اسے سلام کیا۔جا بچے جا۔شکر کر اللہ تجھ سے بہت راضی ہے۔

سوال : اماں جی۔آخر میں یہ فرمائیے کہ آپ کو اپنے نامور بیٹے کی شہادت کی خبر کن حالات میں ملی ؟

جواب :۔ شہادت سے کئی مہینے پہلے اکرم کا ایک خط آیا تھا کہ سی ایم ایچ کھاریاں میں ایک واقف داخل ہیں ان کا خیال رکھنا جب میرا بیٹا ان سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ میجر صاحب تو جان کی پرواہ کرتے ہی نہیں۔مورچوں میں اپنے سپاہیوں کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔کبھی کبھی تو لوہے کی ٹوپی بھی نہیں پہنتے۔ہم لوگوں کو بڑی فکر ہوئی۔چنانچہ میں نے اپنے داماد ملک محمد حنیف سے خط لکھوایا کہ ذرا احتیاط کریں اور اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں۔اس کا جواب آپ نے پڑھا ہو گا بڑے حوصلے کا خط تھا۔لیکن مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کچھ کر گزرے گا۔پھر جب دسمبر ۷۱ء کی شروع تاریخوں میں خبر آئی کہ ہلّی کا کمانڈر مارا گیا تو میرے دل نے فوراً کہا لو اپنا اکرم شہید ہو گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔اس

وقت میرا بڑا بیٹا رشید میرے پاس بیٹھا تھا وہ مجھے تسلیاں دینے لگا۔ پھر خبر آئی کہ ڈنگا کے میجر اکرم شہید ہوئے میرے اکرم کی پیدائش ڈنگا کی تھی۔ میں نے کہا ہو نہ ہو یہ اپنا اکرم ہے۔ رشید کہنے لگا اکرم بہت سے افسروں کا نام ہے۔ تم گھبراؤ نہیں میں نے کہا گھبراؤں کیوں نہیں میرے تو دل کی آواز ہے اور دعائیں کر کے بین کرنے لگی۔ رشید بولا میں جہلم سے اخبار لاتا ہوں تو تمہیں تسلی ہو گی ابھی وہ گھر سے نکلا بھی نہیں تھا کہ ریڈیو اخبار والے آ گئے اور ساری خلقت جمع ہو گئی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں دنیا کہاں ہے۔

سوال:۔ اب آپ کیا محسوس کرتی ہیں۔

جواب:۔ وہی جو ایک ماں محسوس کرتی ہے جس کا سب سے لاڈلا بچہ نہ رہے مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اسے نہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور نہ اپنے ہاتھوں سے دفن کر سکے اب ہم فاتحہ بھی پڑھیں تو کہاں پڑھیں؟ لیکن دوسرے لحاظ سے مطمئن ہوں کہ میرا چاند اس ملک و قوم کے کام آیا۔ میری اولاد، میری جان، میرا مال پاکستان پر قربان۔

ہمشیرہ مختار بیگم کی یادیں

سوال:۔ اکرم آپ سے کتنے سال چھوٹے تھے؟

جواب:۔ کوئی چھ سات سال۔ اماں کے بعد، میں ہی گھر میں بڑی تھی۔ میں ہی اکثر و بیشتر بھائی اکرم کی دیکھ بھال کرتی تھی وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ جب بڑی ہوئی تو شادی وادی ہو گئی اور بھائی کو کمیشن مل گیا تو بھائی اکرم کے کرم کا دروازہ کھل گیا کسی بھائی نے کسی بہن کا اتنا کم خیال کیا ہو گا جتنا بھائی اکرم نے میرا کیا۔

سوال:۔ اس بات کی کچھ تفصیل؟

جواب:۔ شادی کے بعد چند سالوں تک میرے حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ میرے دو تین بچے کچھ

بیمار رہتے تھے اس وجہ سے بہت دکھی تھی گھر کی آمدنی بھی کم تھی کرائے کا مکان تھا پچاس روپیہ مہینہ جاتا تھا جو اس زمانے میں بہت تھا۔ اکرم کو میری ذہنی اور مالی پریشانی کا بہت احساس تھا وہ ہر طرح سے میری دلجوئی کرتے تھے۔ کمیشن کے بعد گھر کا کرایہ دیتے رہے پھر دس مرلے زمین خرید کر یہ مکان بنوا کر دیا جب چھٹی آتے تھے تو زیادہ تر میرے گھر ہی رہتے تھے۔

سوال:۔ تو پھر آپ ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی عادات سے بھی خوب واقف ہوں گی۔ یہ بتایئے کہ ان کی پسندیدہ غذائیں کون سی تھیں؟

جواب:۔ بچپن میں دودھ اور مکھن کا بہت شوق تھا میں روٹی پر مکھن کی گولی رکھتی تو کہتے اور دو، پوری روٹی پر مکھن لگاؤ۔ جب بڑے ہو کر میرے یہاں آتے تو بھنڈی گوشت شوق سے کھاتے تھے۔ پھلوں میں مالٹا اور انگور مرغوب تھا۔

سوال آپ کا تو خیر ان کو اتنا خیال تھا دوسرے بھائیوں والدین کے لئے وہ کیا کرتے تھے؟

جواب چاروں چھوٹے بھائیوں کو بھائی اکرم ہی نے پڑھایا لکھایا ہے والدین کے تو وہ حد درجہ خدمت گزار تھے۔

سوال:۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب بے شمار ہیں ایک بات بتاتی ہوں بڑے کفایت شعار تھے ہمیں پتہ نہیں تھا لیکن کمیشن کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے تین چار بیمہ کی پالیسیاں لے لی تھیں۔ اور وارث کے خانے میں والدہ کا نام لکھوا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایسٹ پاکستان رائفلز میں جا رہے تھے تو لاہور میں خالو کے لڑکے نے پوچھا وارث کے خانے میں اپنی بیوی کا نام کیوں نہیں لکھوایا تو کہنے لگے یار ہمارے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہے ہی نہیں۔

چھوٹے بھائی محمد افضل ملک کے تاثرات

سوال افضل۔ آپ اکرم شہید سے کتنے چھوٹے ہیں؟

جواب:۔ کوئی آٹھ سال۔

سوال:۔ عمر کا یہ فرق تو بہت زیادہ نہیں آپ کو اپنے عظیم بھائی کی بہت سی باتیں یاد ہونگی؟

جواب:۔ جی ہاں۔ ہیں، ان کی شہادت کے بعد سے تو وہ نقوش اور بھی گہرے ہو گئے ہیں۔

سوال:۔ مثلاً کوئی ایسا واقعہ سنائیے جس سے اکرم کی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔

جواب:۔ میرے ذہن میں بھائی اکرم سے متعلق جو سب سے پرانی یاد ہے وہ مار پیٹ کے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔

سوال:۔ وہ کیا؟

جواب:۔ یہ واقعہ میرے بالکل بچپن کا ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ ماں جی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ بھائی جان اکرم اور میں اندر کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھے کچھ گپ شپ کر رہے تھے کہ بھائی جان کے دل میں کیا آیا کہ انہوں نے پیار سے میرے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔ غالباً مذاقاً لیکن میں چھوٹا تھا۔ میں سمجھا انہوں نے مجھے قصداً مارا ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ایک گھونسہ اپنی پوری قوت سے بھائی کے پیٹ میں دے مارا۔ وہ اس ناگہانی حملہ کے لئے تیار نہ تھے۔ پیٹ پکڑ کر رہ گئے۔ درد کی شدت سے ان کے آنسو نکل پڑے بھائی جان چاہتے تو جواباً میری کافی مرمت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے میرے اوپر پھر ہاتھ نہ اٹھایا۔ ماں جی جب ناشتہ لے کر اندر آئیں اور انہیں بے حال دیکھا تو پوچھا کیوں کیا بات ہے کیا لڑے جھگڑے ہو تو بھائی جان نے صرف اتنا کہا۔ نہیں بے جی مذاق کر رہے تھے۔ شریف النفسی بلکہ کریم النفسی معاف اور درگزر کر دینا بھائی اکرم کے کردار کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس طرح کے ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔

سوال:۔ مثلاً؟

جواب:۔ مثلاً ایک واقعہ ان کے ملٹری کالج میں زمانہ تعلیم کا ہے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر

آئے ہوئے تھے۔ اور ہم دونوں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ بھائی جان اپنے ہم عمروں میں تھے اور میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ کھیل کھیل میں میرا اپنے ساتھی سے کچھ جھگڑا ہو گیا وہ مجھ سے ذرا بڑا تھا۔ اس نے مجھے مارنا چاہا۔ میں نے چیخ کر بھائی اکرم کو آواز دی وہ بھاگ کر میری طرف آئے۔ میں نے شکایت کی کہ یہ لڑکا مجھے مارتا ہے اس کا نام صابر تھا۔ ایسے موقعوں پر عموماً بھائی اور رشتہ دار بے قابو ہو جاتے ہیں۔ لیکن بھائی اکرم نے اس سے کہا تو صرف اتنا کہا۔ صابر یہ تم سے چھوٹا ہے۔ چھوٹوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

سوال کوئی اور تاثر؟

جواب ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس سے بھائی اکرم کی شخصیت کے ایک اور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

سوال وہ کیا ہے؟

جواب وہ یہ کہ گرمیوں کا موسم تھا ہم سب لوگ اوپر چھت پر سو رہے تھے آٹھ نو بجے میں سویا تو اکیلا سویا تھا لیکن رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھائی سو رہا ہے۔ خیال آیا والدہ نے بھائی عبدالرزاق کو میرے ساتھ لٹا دیا ہو گا لیکن صبح کو جب اچھی طرح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بھائی اکرم میرے ساتھ سو رہے ہیں وہ رات کو گھر سے سات آٹھ میل دور دراز سے اکیلے چل کر گھر آئے تھے رات کے وقت راستہ جنگلی سوروں کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اکیلے دکیلے کوئی ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ بھائی جان میں ایک خاموش جرأت تھی جس کا اظہار روزمرہ کے حالات و واقعات بھی ہوتا رہتا تھا۔

سوال:۔ کوئی اور قابل ذکر صفت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

جواب:۔ ایثار شعاری اور مال و دولت سے بے نیازی بھی میں نے ان کے اندر بدرجہ اتم دیکھی

سوال:۔ اس کی کوئی مثال؟

جواب:۔ ایثار گویا ان کی زندگی کا عنوان تھا جب کبھی وہ اچانک گھر چھٹی پہ آجاتے تو گھر پر جو دال ساگ بھی پکا ہوتا بڑے شوق سے کھا لیتے۔ اپنے لئے نہ کسی کھانے کی فرمائش کرتے نہ کسی کو خصوصی اہتمام کرنے دیتے بلکہ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ وہ دیر سے گھر پہنچے اور کھانا ختم ہوگیا ہوتا تو وہ اپنے لئے ایک روٹی بھی ڈالنے نہ دیتے اور بغیر کچھ کھائے پیئے سو جاتے۔ کہا کرتے تھے مجھے بھوکا سونے سے وہ تکلیف نہ ہوگی جو گھر والوں کو نئے سرے سے پکانے کی تکلیف دینے سے ہوگی۔ والدین کی خدمت اور فرماں برداری کی عادت بھائی جان میں کمیشن سے پہلے بھی تھی کمیشن کے بعد اس میں دو چند اضافہ ہوگیا تھا۔

سوال:۔ اکرم شہید نے پانچ سال ملٹری کالج میں تعلیم پائی گھر پہ چھٹی آتے ہوں گے تو ضرور کالج کی باتیں کرتے ہوں گے۔ کالج کے بارے میں ان کی کوئی بات یاد ہے آپ کو؟

جواب:۔ کالج میں وہ بہت شوق سے داخل ہوئے تھے چھٹیوں میں وہ کالج کی دلچسپ باتیں بڑے شوق سے سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکرم کی شخصیت کو ابھارنے میں ملٹری کالج کا بڑا دخل تھا۔ کمیشن کے بعد بھی اکثر کہا کرتے تھے ملٹری کالج پاکستان کے بہترین اداروں میں سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کمیشن لینے کا جذبہ نظم وضبط کا گہرا شعور اور اسلامی تاریخ سے لگاؤ انہیں ملٹری کالج ہی میں پیدا ہوا۔

سوال یہ نتیجہ آپ نے کس واقعہ سے نکالا؟

جواب کالج پہنچنے کے دوسرے تیسرے سال سے جب کبھی وہ چھٹی پر آتے تو اپنے ساتھ ایک آدھ تاریخ کتاب ضرور لاتے تھے۔ محمد بن قاسم اور خالد بن ولید کا نام میں نے پہلی بار ان سے سنا تھا۔ خالد بن ولید ان کے ہیرو تھے۔ خالد بن ولید کے تاریخی معرکوں کے واقعات انہوں نے ہمیں بھی سنائے تھے۔

بھائی اکرم بہت سچے اور پکے مسلمان تھے ان کا ایمان عین الیقین کے درجے کا تھا۔ اسلام

اور پاکستان سے ان کی شدید محبت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے شہادت سے کچھ عرصہ پہلے ہلی کے محاذ سے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے ان کی شہادت کی تہہ میں یہی جذبہ کارفرما تھا "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن" کی وہ ایک عملی تفسیر تھے۔

آخر میں ہم میجر اکرم شہید کے ایک کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) ممتاز ملک ستارۂ جرأت کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

سوال:۔ ممتاز صاحب۔آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان تاریخ ساز لمحوں میں جب اکرم نے نشان حیدر حاصل کیا وہ آپ کے زیر کمان تھے۔آپ ہی نے ان کے نشان حیدر کے لئے بنیادی کارروائی شروع کی ہوگی اس لئے آپ سے بڑھ کون اکرم کی کارکردگی اور شخصیت پر تبصرہ کر سکتا ہے۔

جواب اصل میں اس زمانے میں ۴ ایف ایف آر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) محمد اخلاق عباسی۔ کے زیر کمان تھی اور میں ایسٹرن کمانڈ کے ساتھ جی ون تھا۔ ۲۵ نومبر ۷۱ء کو کرنل عباسی زخمی ہوکر ہسپتال جا پہنچے تھے۔ ۲۶ نومبر ۷۱ء کو جب میں کمانڈر کے ساتھ ہلی کے اہم محاذ پر پہنچا تو صورت حال کا علم ہوا چنانچہ میں نے کمانڈر صاحب سے درخواست کی کہ یہ میری پرانی یونٹ ہے۔ اپریل ۷۱ء تک میں ہی اسے کمانڈ کرتا رہا ہوں۔اس کا سی او زخمی ہو چکا ہے۔ اس لئے مجھے عارضی طور پر اس کی کمان سنبھالنے کا موقعہ دیا جائے۔ہلی کا محاذ ایک زبردست فوجی اہمیت کا محاذ تھا۔دشمن نے اپنا بڑا حملہ شروع کر دیا تھا اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ ہمارے دفاع کو توڑ کر وہ بوگرہ کی طرف بڑھ سکے۔ان حالات میں، میں نے اس بٹالین کی کمان سنبھالی جواب تک کرنل عباسی کی کمان میں ہلی کا کامیاب دفاع کر رہی تھی۔ ہلی کے اصل محاذ پر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) جولین پیٹر کی ڈی کمپنی اور میجر اکرم کی سی کمپنی دشمن کی یلغار کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہی تھی۔

سوال:۔ کیا آپ اکرم کے اس تاریخی کارنامے پر کچھ تبصرہ کرنا پسند کریں گے جس کے لئے انہیں نشان حیدر سے نوازا گیا۔

جواب ظاہر ہے کہ وہ کارنامہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ نشان حیدر کے فرمان میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ اکرم نے جس تاریخی اور مثالی شجاعت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ کوئی اتفاقی امر یا کسی فوری جوش کا نتیجہ نہ تھا اس تاریخی لمحے کے لئے وہ برسوں سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ ۴ ایف ایف آر میں شروع دن سے ان کی ایمج ایسی تھی کہ ان کی شہادت پر بٹالین کو افسوس تو شدید ہوا لیکن تعجب ذرا نہ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں یونٹ کے جانے کے وقت سے وہ جس ذوق و شوق اور جرأت سے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف تھے اور ان کی شخصیت و کردار کے جو نقوش افسروں اور رینکس کے ذہن میں تھے ان کے پیش نظر سب کا لاشعوری اتفاق اس امر پر تھا کہ بقول اقبال یہ جوان " قبیلے کی آنکھ کا تارا" بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اکرم نے ۵ دسمبر کی صبح کو دکھا دیا کہ جو توقعات ان سے وابستہ کی گئی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔ اکرم کی شجاعت کی داد اپنوں ہی نے نہیں دشمنوں نے بھی دی ہے۔

نوٹ:۔ میجر اکرم شہید نشان حیدر کے مفصل حالات و کارنامے اکرم کی سوانح عمری "اکرم نشان حیدر" میں بیان کئے گئے ہیں۔

میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرأت

بلوچ رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ———— ۵ جنوری ۱۹۳۸ء

جائے پیدائش ———— ڈھڈیال (راولپنڈی)

کمیشن ———— ۲۵ پی ایم اے

تاریخ شہادت ———— ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ———— ۳۳ سال

اعزاز ———— ستارۂ جرأت

مقام شہادت ———— دیپال پور (لاہور)

مدفن ———— ڈھڈیال (راولپنڈی)

میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرأت

یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی تیسری پر آشوب رات تھی کمانڈر بری طرح زخمی ہو چکا تھا لیکن وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا اور جوانوں کی ہمت بندھا رہا تھا۔ "آگے بڑھو اور بند پر قبضہ کرو" یکایک ایک گولہ آکر اس کو لگا وہ لڑکھڑا کر گرا۔

"صوبیدار صاحب پل تک ضرور پہنچنا ہے بند پر قبضہ کر کے چھوڑنا ہے۔ ہر قیمت پر۔ میری فکر نہ کریں کمپنی کی کمانڈ سنبھالیں۔ خدا حافظ۔"

یہ آخری حکم تھا جو مہلک زخموں سے چور کمانڈر نے اپنے سیکنڈ ان کمان صوبیدار محمد اقبال کو دیا۔ اور خدا حافظ کہہ کر جان، جان آفرین کے سپرد کر دی اس کمانڈر کا نام میجر محمد حنیف تھا جو ۴۱ بلوچ کی الفا کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے جس پل پر پہنچنے کو کہا گیا تھا وہ فیروز پور قصور روڈ پر دیپال نہر کا پرانا پُل تھا اور جس بند پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اسی بند کا مغربی کنارہ تھا جس پر دشمن مورچہ بند تھا۔ اس معرکے میں مثالی جرأت قیادت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے پر حنیف شہید کو ستارۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔

حنیف جیسے دلیر بیٹے مائیں کبھی کبھی جنتی ہیں جو اپنی بھرپور زندگی وقوم کی آن پر قربان کر دیتے ہیں۔ میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرأت کا سوانحی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

جائے پیدائش

راولپنڈی کے جنوب میں شہر سے ۲۵ میل کے فاصلے پر شاہراہ اختر پر ایک چھوٹا سا

گاؤں آباد ہے اس کا نام ڈھڈیال ہے ایک روایت کے مطابق آج سے چار صدی قبل اعوان قبیلہ کے ایک بزرگ نے اسے آباد کیا اور اب بھی یہاں بیشتر اعوان قبیلہ ہی کے لوگ آباد ہیں۔ یہ میدانی علاقہ ہے۔ زمین زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ لفظی معنوں میں بھی اور علامتی معنوں میں بھی۔ وہ یوں کہ ڈھڈیال نے پاک فوج کو بہت سے جیالے سپاہی اور کامیاب افسر دیئے ہیں۔

والدین

اس ڈھڈیال میں ایک گھر غلام حسین اعوان کا ہے۔ ملک غلام حسین نے آبائی پیشہ اختیار کیا۔ ۸/ا پنجاب میں سپاہی بھرتے ہوئے تھے۔ اپنے زور بازو سے کمیشن لیا۔ ترقی کر کے آر۔ پی۔ اے ایس سی میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ان کے بڑے بھائی محمد صدیق اعوان بھی فوج میں تھے کیپٹن کا عہدہ تھا۔ فوجی ہونے کے علاوہ اس خاندان کی ایک اور خصوصیت بھی تھی اور وہ تھی اس گھرانے کی مذہبیت۔ ملک غلام حسین، ان کی نیک طینت بی بی اور بڑے بھائی ملک محمد صدیق سب اللہ اور رسول سے محبت کرتے تھے۔ صرف نماز روزے کے پابند ہی نہیں تھے نماز روزے کی روح کو بھی اپنائے ہوئے تھے۔

پیدائش

اس دینی اور فوجی فضا میں، اعوانوں کی اس قدیم بستی ڈھڈیال میں ۵۔ جنوری ۱۹۳۸ء کو ملک غلام حسین اعوان کے گھر میں میجر محمد حنیف شہید پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد حنیف ان کے دیندار تایا ملک محمد صدیق اعوان نے رکھا۔ اس نام کی کہانی یہ ہے کہ جب اس پہلے بیٹے کا عقیقہ ہونے لگا تو گھر میں بحث ہوئی کہ بچے کا نام کیا رکھا جائے۔ کیپٹن ملک صدیق دین کا اچھا شعور رکھتے تھے انہوں نے کہا انشاء اللہ یہ بڑا ہو کر اللہ کے دین حنیف کی پاسداری اور پاسبانی

کرے گا اس کا نام محمد حنیف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ بچے کا نام محمد حنیف رکھ دیا گیا اور صحیح رکھا گیا۔ واقعی ملک غلام حسین کے اس بڑے بیٹے کے مقدر ہیں اللہ کے دین حنیف کے پاسبانی بھی تھی۔

بچپن

گھر کا ماحول ایسا تھا جس میں علم کی روشنی بھی تھی اور دین کی فضا بھی تھی۔ اس پاکیزہ ماحول میں حنیف نے آنکھ کھولی تھی اور وہ اس سے سیراب ہو رہے تھے ماں کی لوریوں اور کہانیوں کے ساتھ اسلامی اور خاندانی روایتیں ننھے حنیف کے دل و دماغ میں رچ بس رہی تھیں۔

حنیف ابھی چار برس کے تھے کہ انہیں ایک حادثہ پیش آیا۔ برسات کا موسم تھا۔ ہر جگہ پانی ہی پانی۔ گھر کے پاس ایک آٹھ فٹ گہرا اور خاصا لمبا گڑھا تھا۔ دوسرے بچوں کو اس میں تیرتے اور شرارتیں کرتے دیکھ کر حنیف نے بھی جوش میں آکر چھلانگ لگادی اور لگے غوطے کھانے ایک پڑوسن نے دیکھا تو حنیف کی والدہ کو خبر کی وہ بھاگ کر آئیں اور اس طرح جوتے سمیت کود پڑیں اور بمشکل بچے کو نکال کر لائیں پیٹ میں کافی پانی بھر چکا تھا اگر ایک آدھ منٹ دیر ہو جاتی تو بچے کا بچنا محال ہو جاتا حنیف کی جان بچنے پر سب نے بڑی خوشیاں منائیں۔ ماں نے بڑی خیر خیرات کی۔ تایا صدیق ملک نے سنا تو کہا اللہ تعالیٰ نے اس کی جان اس لئے بچائی ہے کہ وہ اس سے کوئی خاص خدمت لے گا" باپ بولے انشاء اللہ"

ابتدائی تعلیم

حنیف ساڑھے چار برس کے تھے کہ ان کی بسم اللہ ہوئی۔ قرآن شریف پڑھنے گاؤں کی مسجد میں جانے لگے۔ پانچ سوا پانچ برس کے ہوئے تو نزدیک مڈل اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اسکول میں ان کے ساتھ ان کے تایا زاد بھائی ملک محمد حفیظ بھی پڑھتے تھے۔ دونوں ہم عمر

تھے۔ حنیف کا پیار کا نام حنی اور حفیظ کا حفی تھا۔ حنی اور حفی دونوں قد کاٹھ کے اچھے اور بدن کے مضبوط تھے۔ اسکول میں شرارتیں مل جل کر کرتے اور جھگڑوں میں بھی اکھٹا محاذ بناتے۔ اسکول میں لڑکے ان دونوں کو شیروں کی جوڑی کہہ کر پکارتے تھے۔

جب ان کی عمر آٹھ برس کی ہوئی تو ان کے والد ملک غلام حسین اعوان جوان دنوں گراس فارم پشاور میں اوورسیئر تھے۔ انہیں اپنے ساتھ پشاور لے گئے جہاں وہ اپنے والد کی زیر نگرانی تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد ان کے والد ملک غلام حسین نے کمیشن حاصل کرلیا۔ پشاور سے واپسی پر حنیف کو راولپنڈی ڈینینز اسکول میں داخل کرادیا گیا اور ان کے تایا صوبیدار ملک نور حسین اعوان ان دنوں کمانڈر انچیف کے اے۔ڈی۔سی تھے اور راولپنڈی میں مقیم تھے۔ ان کے زیر سایہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تین سال تک ڈینینز اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے تایا نے انہیں کانونٹ اسکول میں داخل کرایا۔ اس اسکول میں وہ دوسرے اسٹینڈرڈ (جماعت پنجم) میں پڑھ رہے تھے کہ ملٹری کالج میں داخلے کی درخواست دی۔ اور ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء کو ملٹری کالج میں پانچویں کلاس میں داخل ہوئے اور ان کا پہلا ہاؤس رابرٹس ہاؤس (شیر شاہ ہاؤس تھا)

ملٹری کالج کا زمانہ

ملٹری کالج میں حنیف شہید کے فائل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کتابی امتحانوں کے دائرے کے سوا انہوں نے تعلیم و تربیت کے ہر دائرے میں نہ صرف امتیاز حاصل کیا بلکہ درجہ کمال تک پہنچے۔ ۱۹۴۹ء میں پانچویں درجے کے سالانہ امتحان میں ان کی پوزیشن پچیس لڑکوں میں بارھویں تھی۔ چیف انسٹرکٹر کیپٹن عبدالحمید ابراہیم نے رپورٹ میں لکھا۔

اوسط درجے کا طالب علم ہے جبکہ کمانڈانٹ کرنل زیدی نے لکھا خوش مزاج اور خوش اطوار ہے۔ ۱۹۵۰ء میں چھٹے درجے کی سالانہ رپورٹ میں ہاؤس ماسٹر ضمیر صدیقی صاحب نے لکھا فوٹو گرافی میں دلچسپی لیتا ہے جبکہ ہاؤس آفیسر نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس کا مستقبل روشن ہے

اس پر چیف انسٹرکٹر کیپٹن ابراہیم نے اضافہ کیا کہ محنتی ہے اور باضمیر ہے یہ رپورٹیں چھٹے درجے کی ہیں۔ اس وقت حنیف کی عمر بارہ برس سے بھی کم تھی۔ ہاؤس آفیسر کا یہ کہنا کہ اس سے توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اور چیف انسٹرکٹر کا تبصرہ کہ "لڑکا باضمیر" ہے کچھ معنی رکھتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس چھوٹی عمر میں بھی حنیف عام لڑکوں سے مختلف تھا۔ اور اسے قدروں کا احساس تھا۔ اگلے سال ۵۱-۱۹۵۰ء کی ساتویں درجے کی رپورٹ سے ہم حنیف کے پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر کے ریمارکس نقل کرتے ہیں۔ یہ سینئر کیڈٹس کی رائے قابل غور ہے چونکہ وہ جونیئر کیڈٹس کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی خوبیوں خامیوں کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ پلاٹون کمانڈر لکھتا ہے "حنیف میری پلاٹون کے بہترین لڑکوں میں سے ایک ہے۔ اپنی سیکشن پر بڑی محنت کرتا ہے۔ جبکہ کمپنی کمانڈر کی رائے تھی کہ حنیف ذمہ داری کا بڑا اونچا احساس رکھتا ہے۔ لیکن حنیف کا کتابی امتحان کا نتیجہ اچھا نہیں تھا۔ چھبیس لڑکوں میں سے اس کی سولھویں پوزیشن تھی۔ کئی مضمونوں میں نمبر کم تھے۔ چنانچہ فارم ماسٹر نے رائے دی۔ کہ اگلے درجے میں پرموشن کے لئے فٹ نہیں ہے۔ چیف انسٹرکٹر نے تبصرہ کیا۔ نصابی پڑھائی میں اوسط سے کمتر ہے"۔ اس رپورٹ کے باوجود حنیف کو آٹھویں درجے میں چڑھا دیا گیا۔ اس سال کی سالانہ رپورٹ میں پلاٹون کمانڈر (ایک سینئر کیڈٹ) نے رائے دی۔ حنیف بلند خیالات رکھتا ہے اپنے مہذب طور طریقوں سے اس نے لفظ کیڈٹ کی آبرو رکھ لی ہے"۔ ہاؤس ماسٹر ضمیر صدیقی صاحب نے اس کی خوش مزاجی کی تعریف کی۔ کالج کے کمانڈانٹ کرنل زیدی نے اس کے خوش اطوار اور شائستہ ہونے کو سراہا لیکن امتحان کا نتیجہ پھر اتنا خراب تھا کہ حنیف کو اگلی کلاس میں ترقی نہیں دی گئی۔ یہ تعلیمی رپورٹ اتنی خراب تھی کہ حنیف نے ڈر کے مارے باثر مندگی سے یہ رپورٹ اپنے والد میجر غلام حسین کو بھی نہیں دکھائی۔ اگلے سال حنیف آٹھویں درجے ہی میں رہے صرف سیکشن بدل دیا گیا۔ یعنی ہشتم سی سے ہشتم ب میں چلے گئے۔ مئی ۱۹۵۲ء میں حنیف نے فرسٹ کلاس ایجوکیشن کا امتحان دیا۔ حساب وغیرہ وہ کئی مضامین میں اب

بھی کمزور تھے۔ بہرحال انہیں اس سال نویں درجے میں ترقی دے دی گئی اس سال نہم الف میں حنیف کے فارم ماسٹر مسٹر مظہر علی خان تھے جو اپنی شفقت کے لئے تمام کالج میں مشہور تھے اور حنیف کے ہاؤس ماسٹر (بعد کو میجر) قاضی حامد علی جیسے صاحب نظر ماہر تعلیم تھے ان دونوں بزرگوں نے مارچ ۱۹۵۴ء میں حنیف کے بارے میں جن تاثرات کا ذکر کیا وہ اس قابل ہیں کہ انہیں ان ہی کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ مظہر صاحب نے کہا "سچا ایماندار اور قابل اعتماد ہے" قاضی حامد علی نے لکھا۔

"مہم جو لڑکا ہے اس کے اندر ایک لیڈر کی تڑپ موجود ہے" قاضی صاحب کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے مستقبل کے امکانات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ حنیف کے بارے میں جو کچھ ان استادوں نے کہا وہ مستقبل کے واقعات کے مطابق بالکل صحیح ثابت ہو گیا!

اسی سال حنیف نے باکسنگ میں نام پیدا کیا۔ فوٹو گرافی کے علاوہ تقریروں اور ڈراموں میں بھی دلچسپی لینی شروع کی پاکستان آرمی فرسٹ کلاس انگلش کا امتحان بھی پاس کیا اور نویں درجے کے امتحان میں ستائیس لڑکوں میں نویں پوزیشن حاصل کی۔ دسویں درجے میں حنیف برڈووڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) میں چلے گئے۔ باکسنگ اور ہاکی میں دلچسپی برقرار رہی لیکن ساتھ ہی ڈراموں میں حصہ لینے لگے۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں پاکستان آرمی اسپیشل (میٹرک کے مساوی) امتحان دیا۔ اور ۳۲۵ نمبر لے کر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ اس امتحان میں ان کے نمبر پھر کم تھے لیکن سالانہ رپورٹ پھر نہایت شاندار تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل ایڈورڈز کے دستخطوں سے فائل میں یہ عبارت درج ہے۔

"خوش خصائل باکردار، انتہائی شائستہ عادات واطوار کا حامل قیادت کی اعلیٰ صفات کا اظہار کرتا ہے" یہ تبصرہ بھی قابل غور ہے مبصر بدلتے رہتے لیکن تاثر سب کا ایک ہی تھا کہ یہ کیڈٹ خصلت و کردار میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے یہ تمام صفات حنیف نے ایک افسر کی حیثیت سے اور پھر آخر میں ایک جانباز مجاہد کی حیثیت سے ظاہر کیں۔ وجیہہ شکیل ہونے کے

ساتھ ساتھ اس کے اندر جو چیز سب سے زیادہ تھی وہ یہی شریف النفسی اور قیادت کی بھرپور صلاحیت تھی۔ فرسٹ ایئر میں حنیف نے پری انجینئرنگ کے وہی سائنسی مضامین لئے جن میں وہ پہلے سے کمزور تھے نتیجہ ظاہر تھا لیکن حنیف کی شخصیت کے ارتقاء کے لئے یہ سال بہت اچھا تھا۔ ۵۶-۱۹۵۵ء کے سیشن میں حنیف نے کالج میں تقریباً وہ تمام اعزازات حاصل لئے جن کی کوئی کیڈٹ تمنا کر سکتا ہے اسے کالج کی اے ہاکی ٹیم میں لے لیا گیا۔ تقریروں اور ڈراموں میں امتیازی کارکردگی کی وجہ سے اسے کالج کی ڈیبٹنگ یونین کا نائب صدر منتخب کیا گیا اور قیادت وکردار کی بنا پر برڈ وڈ ہاؤس کا ہاؤس پریفکیٹ بنایا گیا اور تمام ذمہ داریوں کو حنیف نے انتہائی کامیابی سے ادا کیا چنانچہ اپریل ۶۲ء میں ہاؤس ماسٹر نے اس کی رپورٹ میں لکھا:

"بحیثیت ہاؤس پریفکیٹ کے اس کی کارکردگی بہترین رہی ہے ذمہ داری کا غیر معمولی شعور رکھتا ہے۔ خوش اطوار اور باکردار ہے۔ وفاداری اور ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔ دلیر ہے"

فرسٹ ایئر کے امتحان میں سائنسی مضامین میں حنیف بری طرح ناکام ہوئے۔ چیف انسٹرکٹر میجر ولی اللہ نے رائے ظاہر کی "سائنسی مضامین میں تو اس کا چلنا مشکل ہے اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مضامین بدلے یا پھر پی ایم اے کے انیسویں کورس کے لئے کوشش کرے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حنیف نے پی ایم اے کیلئے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے اگست ۵۶ء کی اٹھارہ تاریخ کو کالج کو خیرباد کہا۔ اسی طرح حنیف نے کالج میں آٹھ برس گزارے یہ حنیف کی انتہائی خوش قسمتی تھی کہ اس نے کالج میں اپنی تعلیم کا آخری سال کالج کے نئے کمانڈانٹ کرنل رفیق کی راہنمائی میں گزارا۔ کرنل رفیق پارس پتھر کی خاصیت رکھتے تھے۔ پتھر کو ہیرا بنا دیتے۔ جوہر قابل کا تو کیا کہنا۔ وہ کالج میں دوبار کمانڈانٹ رہے۔ ایک بار جولائی ۵۲ء سے مارچ ۵۳ء تک پھر نومبر ۱۹۵۵ء سے اپریل ۵۹ء تک اس زمانے کی قدر وقیمت ان طلبہ سے پوچھئے جو ان کے زیر تربیت رہے ان کو محمد حنیف نے دارالسلام سیٹلائٹ ٹاؤن پنڈی سے ۸ اکتوبر ۵۶ء کو یہ خط لکھا۔

سر مجھے اب آپ کی تربیت کی قدر و قیمت، اور اس ادارے کے ڈسپلن کی قدر و قیمت معلوم ہوئی ہے۔جس سے میں اب ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا ہوں میری زندگی کا وہ حصہ جو کالج میں گزرا ہے۔ واقعی بہت قابل قدر اور ناقابل فراموش ہے میں اپنے شفیق اور ہمدرد اساتذہ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔آپ کی قیمتی باتوں اور مشوروں سے زندگی میں بہترین رہنمائی ملے گی۔ یہ اس ادارے کے طلبہ کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں آپ جیسا فراخ دل ہمدرد اور قابل محبت پرنسپل میسر ہے۔

حنیف کے فائل میں یہ خط پڑھ کر ہم نے کرنل (اب بریگیڈیر ریٹائرڈ) محمد رفیق سے رجوع کیا کہ وہ بھی حنیف کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ بہ کمال کرم جواباً انہوں نے لکھا:۔

"کالج میں میری کمانڈ کے دوسرے دور میں، جو آواخر ۵۵ء سے شروع ہوا۔ بڑے بڑے اچھے لڑکے تھے۔لیکن ذہانت، وجاہت، متانت، قیادت کی صلاحیت اور خوش مزاجی کا ایک عجیب خوشگوار امتزاج اس لڑکے میں تھا۔جس صفت نے اسے ممتاز اور منفرد بنا دیا تھا کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ہاکی اور باکسنگ میں کالج کے ٹاپ لڑکوں میں سے تھا۔

حنیف میں قیادت کی خصوصی صلاحیت تھی۔ قائد میں ذمہ داری قبول کرنے کا جو حوصلہ ہونا چاہیئے وہ اس میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے دوسرے دور میں وہ پہلا لڑکا تھا۔ جسے میں نے سزا دی۔ ہوا یوں کہ حنیف برڈووڈ (حال ایم-جی) ہاؤس کا ہاؤس پریفکیٹ تھا میں راؤنڈ پہ نکلا تو دیکھا کہ وقت پر لائٹس آف کرنے پر عمل نہیں ہوا۔ظاہر ہے کہ جنہوں نے لائٹس آؤٹ نہیں کی تھی وہ دوسرے جونیئر لڑکے تھے لیکن حنیف نے کوئی عذر پیش نہیں کیا اور بڑے حوصلے سے وقت پر لائٹس آؤٹ نہ ہونے کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس کی سزا بھی کھا لی لیکن چہرے مہرے سے کسی ناگواری یا تلخی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ایک استاد کا تبصرہ :

حنیف نے کچھ عرصہ کالج کے ایک پرانے ہاؤس آکنلک ہاؤس میں بھی گزارا تھا اس زمانے کے آکنلک ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مسٹر ضمیر احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں۔

حنیف کا شمار آکنلک ہاؤس کے اسمارٹ ترین لڑکوں میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی بیرے اسی طرح اوڑھتا تھا کہ اس کا ایک کنارہ اس کی دائیں آبرو کو چھوتا تھا۔ اس کج کلاہی میں حنیف کی شخصیت کی ساری آن بان اور انفرادیت پوشیدہ تھی ایک لیڈر ہوتے ہوئے بھی حنیف کو اپنے کلاس فیلوز اور اسٹاف کی نگاہوں میں ایک مقام حاصل تھا۔

باکسنگ رنگ میں حنیف کی چلت پھرت اور مکے مارنے کا انداز دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی حنیف ہے جو باکسنگ رنگ سے باہر شائستگی اور نرم روی کی تصویر ہوتا ہے۔

کالج سے جانے کے بعد حنیف نے مجھے ایک بار کراچی سے ایک خط بھی لکھا تھا۔ پتہ یہ تھا نمبر ۱۷/ ۶۵۵۸۱۔ ۲۶۔ پی۔ این۔ جی گارڈن روڈ کراچی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ نیوی میں بھی کچھ عرصے کے لئے بھرتی ہوا تھا یا نہیں پتے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیوی میں بھرتی ہوا تھا۔

ایک ہمعصر کا تاثر

ساتھی تو گھر کا بھیدی ہوتا ہے ہاؤس کے ساتھی جتنا ایک دوسرے کو جانتے ہیں خامیوں کو بھی اور خوبیوں کو بھی اتنا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس لئے ہم نے حنیف کے ایک ہمعصر اور ہاؤس میٹ بریگیڈیر رب نواز (۲۰۹۲) سے کہا کہ وہ حنیف کے بارے میں اپنی یادوں کو تازہ کریں تو انہوں نے جواب دیا۔

"حنیف صرف سینئر ہی نہیں سپر سینئر بھی تھے میں نے پہلے انہیں کھیل کے میدان میں دیکھا کالج کی ہاکی ٹیم میں تھے۔ رائٹ ان کھیلتے تھے اور بہت خوب کھیلتے تھے۔ بڑی زوردار ہٹ لگاتے تھے لیکن ان کے اصل جوہر باکسنگ رنگ کے اندر کھلتے تھے۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم تھا۔ ہم اس

وقت سوچتے تھے کہ ان کے بازو کے اعصاب میں دو چار تاریں فولاد کی ضرور ہوں گی مکا بڑا زبردست تھا۔ ایک خاص بات میں نے یہ نوٹ کی تھی کہ مکا لگا کر یا مکا کھا کر ان کی شکل نہیں بگڑتی تھی۔ بڑے نارمل ہو کر مکا بازی کرتے تھے۔

ان کی شہادت کے بعد مجھے ان کے ساتھی افسروں نے بتایا کہ ان کی باکسنگ کی خصوصیات ان کی زندگی کی خصوصیات بھی تھیں۔ میدان کارزار میں بھی انہوں نے اسی حوصلے، جرأت اور برداشت کا ثبوت دیا جو باکسنگ رنگ میں ان کا خاصہ تھا۔

گورنمنٹ انٹر کالج راولپنڈی کے دو سال

چونکہ ملٹری کالج میں حنیف ایف ایس سی میں نہیں چل سکے تھے اس لئے ایف اے کرنے کے لئے ان کے تایا صدیق ملک صاحب نے انہیں گورنمنٹ انٹر کالج راولپنڈی میں داخل کرایا۔ آرٹس کے مضامین میں چل نکلے۔ کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا کالج یونین کے صدر بھی بنے۔ انٹر کالج میں انہوں نے خاص مقام بنا لیا تھا۔

حنیف ملٹری اکیڈمی کاکول میں

ایف اے کرنے کے بعد کمیشن کے لئے محمد حنیف پی۔ ایم۔ اے میں داخل ہوئے ان کی پی ایم۔ اے کی کارکردگی پر تبصرہ کرنے کیلئے ہم نے کرنل اسلم اور کرنل صغیر سے کہا۔ ان کے جوابات نقل کئے جاتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل صغیر حسین جو کالج کے اولڈ بوائے بھی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"محمد حنیف ۲۶ نومبر ۱۹۵۹ء کو اکیڈیمی میں داخل ہوئے ان کی کمپنی خالد کمپنی تھی۔ کھیلوں کا شوق تھا۔ نٹ بال اور ہاکی کی ٹیم میں تھے۔ اپنے وزن میں باکسنگ کا چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔"

۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء کو پاس آؤٹ ہوئے اپنے کورس کے میرٹ میں ۸۰ ویں نمبر پر تھے۔

آرڈیننس کور کے لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم چودھری کالج کے تو نہیں ہیں لیکن پی۔ایم۔اے میں میجر محمد حنیف کے خاص ساتھی تھے وہ لکھتے ہیں :۔

"میرا اکیسویں پی۔ایم۔اے لانگ کورس ہے۔ میجر محمد حنیف میرے کورس کے ہیں خالد کمپنی میں اڑھائی سال ساتھ رہا۔ اتفاق سے پلاٹون اور سیکشن بھی ایک ہی تھی۔ ایک ساتھ پاس آؤٹ ہوئے کمیشن کے بعد بھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ اسی رشتے سے بات کروں گا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ حنیف ہاکی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ باکسر بھی غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ باکسنگ رنگ میں تھے وہی وہ زندگی میں بھی تھے۔ پوری دنیا ان کے لئے باکسنگ رنگ تھی۔ اسی جذبے اسی حوصلے اور ولولے سے وہ ہر چیلنج کو قبول کرتے تھے۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبین

یہ ان کا فلسفہ بھی تھا۔

حنیف حد درجہ دیانت دار تھے۔ اسی کے پیش نظر انہیں آنر کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ وہ بھی فرسٹ ٹرم میں۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

حنیف بہت اچھے دوست تھے۔ قابل اعتماد اور قابل قدر اور اپنی تمام شائستگی کے باوجود اندر سے وہ بڑے سخت تھے۔ زیادتی نہ کرتے تھے نہ کرنے دیتے تھے۔ پی ایم اے میں اگر کوئی چیز ان کی کمزوری تھی تو وہ سونا اور سگریٹ نوشی تھی۔ جوں ہی موقعہ ملتا سو جاتے یا سگریٹ سے شغل کرتے۔

اپنے فرائض منصبی کو کس ذمہ داری سے سرانجام دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ کمیشن۔ ملنے کے کئی سال بعد جب وہ ملتان آئے میرے پاس دو روز ٹھہرے میں اچھا خاصا قریبی دوست تھا لیکن مجھے بھی نہیں بتایا کہ ملتان آنے کی غرض وغایت کیا ہے۔ جب چلے گئے تو دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ انٹلی جنس کے ایک مشن پر آئے تھے۔

حنیف ان لوگوں میں سے تھے کہ گو جن میں کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن جن سے بے ساختہ محبت

کی جاتی ہے اور جن کی دل سے عزت کی جاتی ہے مجھے یہ شخص بہت یاد آتا ہے اور بہت ٹوٹ کے یاد آتا ہے۔ اللہ اکبر اس ملک کی تعمیر و استقلال میں کیسے کیسے لوگوں کا خون کام آیا۔"

کمیشن کے بعد

میجر محمد حنیف شہید نے اپریل ۱۹۶۱ء میں پی ایم اے سے ناموری کے ساتھ کمیشن لیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۱۷ بلوچ سے وابستہ ہوئے۔ جون ۱۹۶۳ء میں لیفٹیننٹ ہو گئے۔ فوج کی افسری کو وہ صرف افسری نہیں بلکہ ایک مشن، ایک اہم ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ان کا نام حنیف تھا۔ اور وہ افسری کے واسطے سے دین حنیف کے استحکام و استقلال کا اہم فرض انجام دینا چاہتے تھے۔ اس طرز احساس اور طریق کار کا نتیجہ تھا کہ وہ منصبی فرائض انتہائی مستعدی خوش اسلوبی اور دیانت داری سے سرانجام دیتے تھے اس کے نتیجے میں وہ اپنی پلٹن میں جونیئر آفیسر ہونے کے باوجود انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس خوش کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ جب جون ۱۹۶۴ء میں انہیں کیپٹن پر ترقی ملی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ پلٹن کے ایڈجوٹینٹ بھی مقرر کر دیئے گئے۔ اسی حیثیت میں فرائض منصبی انجام دے رہے تھے کہ ۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت ان کی پلٹن لاہور میں تھی۔ چنانچہ وہ لاہور کے محاذ پر ہی مصروف کارزار تھے کہ ان کی پلٹن کو کشمیر کے محاذ پر جانا پڑا۔ کشمیر کے محاذ پر ان کی یونٹ ۱۷ بلوچ کی کارکردگی بہت نمایاں رہی۔

ایک کورس اور تبادلے

ستمبر ۱۹۶۶ء میں کیپٹن محمد حنیف کو مری میں انٹیلی جنس کورس کے لئے منتخب کیا گیا۔ کورس میں ان کا معیار کار اتنا اچھا تھا کہ کورس کے بعد انہیں انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ میں پوسٹ کر دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے اکتوبر ۷۰ء میں انہیں

ڈھاکہ پوسٹ کر دیا گیا۔

میدان جنگ

ڈھاکہ سے واپسی پر میجر حنیف ملک کو پھر اپنی پہلی یونٹ ۱۷ بلوچ میں متعین کیا گیا جو لاہور چھاؤنی میں مقیم تھی اب وہ میجر ہو چکے تھے انہیں ۱۷ بلوچ میں ٹو آئی سی کے منصب پر فائز کیا گیا۔ چند روز بعد پلٹن کو آزاد کشمیر میں تبدیل کر دیا گیا۔

پچھری کوٹ

جب ان کی پلٹن آزاد کشمیر میں مقیم تھی تو ان کی کمپنی کو چھری کوٹ پہاڑی پر متعین کیا گیا۔ جس کی بلندی ۱۶ ہزار فٹ کی ہے۔ اس چوٹی پر گرمی میں بھی برف جمی رہتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس مقام پر اپنے فرائض منصبی کو بڑے استقلال اور اولوالعزمی سے ادا کیا۔ جب ایک دفعہ وہاں سے کسی سرکاری ڈیوٹی پر گھر پر آئے تو سنو بائٹ کی وجہ سے ان کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ جب ان کے اقربا نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "قسم اٹھائی ہوئی ہے کہ آگ ہو پانی ہو۔ جنگل ہو، پہاڑ ہو زمین ہو آسمان ہو جہاں حکم ملے گا جاؤں گا۔ اس سے میرا رنگ سیاہ ہو گیا ہے" اپریل ۷۱ء میں جب کئی اور پلٹنیں تیار کی گئیں تو بلوچ رجمنٹ کی ۴۱ بلوچ کو بنانے کا کام میجر محمد حنیف کے سپرد کیا گیا۔

۴۱ بلوچ رجمنٹ

چنانچہ حنیف ملک کا تبادلہ ۴۱ بلوچ میں کر دیا گیا۔ میجر حنیف ملک نے بڑی جانفشانی سے ۴۱ بلوچ کی مختصر پلٹن کو تیار کیا چند دنوں کے بعد ہی اس نئی بٹالین کو لاہور جانا پڑا۔ جہاں سے قصور فیروز پور روڈ اور قیصر سند کے آہنی مورچے کے سامنے دفاع کرنے کو متعین کیا گیا۔ میجر حنیف ۴۱ بلوچ کے سیکنڈ ان کمانڈ بھی تھے اور الف کمپنی کے کمانڈر بھی۔ وہ ان دونوں فرائض کو

نہایت جانفشانی سے ادا کر رہے تھے۔

قیصر ہند کے سامنے

اپریل ۱۹۷۱ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۱ء تک کی درمیانی مدت میں میجر محمد حنیف کو دشمن کے آہنی مورچہ "قیصر ہند" کے سامنے اس کے گرد و نواح کی ریکی کا کام دیا گیا یہ علاقہ خار دار جھاڑیوں ناہموار زمین، سرکنڈوں جنگلوں دشمن کی بچھائی ہوئی سرنگوں اور کانٹے دار تار سے بھر پور تھا۔ علاقہ پُرخطر۔ سفر کٹھن اور اتنا کٹھن تھا کہ دن میں اس سے گزرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ چہ جائے کہ رات کی تاریکی میں ایسے پرخطر علاقے سے انسان گزر سکے۔ لیکن یہ میجر حنیف کی جرأت اور فراست تھی کہ انہوں نے دشمن کے اس زبردست مورچے کے سامنے ریکی کی۔ خار دار جھاڑیوں کو کاٹا۔ اپنے عبوری مقام سے لے کر دشمن کی سرحدی برجی تک کرال ٹریک ۷۰۰ گز لمبا ۳ فٹ گہرا بنوایا جس کے ذریعے دشمن کی دفاعی لائن تک ہر ایک جوان بغیر خطرے اور مشکلات کے آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ پلٹن کے ہر ایک جوان سے لے کر افسر تک سے اس علاقہ کی ریکی کرائی تاکہ ہر سپاہی دن میں رات میں روشنی میں تاریکی میں۔ گرمی میں سردی میں آرام میں تکلیف میں دشمن کی تمام رکاوٹوں کو آسانی اور خوشی سے عبور کر سکے اور دشمن کی بارودی سرنگوں سے بھرے علاقے کو عبور کرنے کیلئے جو ۵۰×۵۰ فٹ تھا۔ بڑی بڑی سیڑھیاں بنوائیں۔ انہوں نے اپنی اس کم عمر بٹالین کے ہر جوان کو ٹریننگ کے دوران ایسے جذبے سے سرشار کر دیا تھا کہ ہر سپاہی ملک و وطن قوم کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کو ہر گھڑی ہر لمحہ تیار رہتا تھا۔ جب وہ اپنے جوانوں کو فوجی تربیت کا سبق دیتے تو سب سے پہلے یہ دہراتے۔

"عزیزو۔ اشرف الموت قتل الشہداء"

شہادت کی موت سب موتوں سے بہتر اور برتر ہے اس کے بعد وہ سبق دینا شروع کرتے غرض انہوں نے اپنی پلٹن کے ہر سپاہی کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کر دیا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کی الفا کمپنی

۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جمعہ کا دن تھا جب وہ داتا دربار کی مسجد میں نماز سے فارغ ہوئے تو اطلاع موصول ہوئی کہ دشمن نے سرحد پر حملہ کر دیا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی گنڈا سنگھ حسینی والا قصور فیروز پور روڈ کے علاقہ میں متعین فوج حرکت میں آگئی۔ ۴۱ بلوچ رجمنٹ کی الفا کمپنی کو جو میجر حنیف کے زیر کمان تھی حکم ملا کہ وہ حسینی والا سیکٹر میں دشمن کی پہلی دفاعی لائن پر قبضہ کرنے کیلئے آگے بڑھے۔

میجر حنیف نے یہ حکم ملتے ہی اپنی کمپنی کے جوانوں اور سردار صاحبان کو جمع کیا صورتحال سے آگاہ کر کے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔

الفا کمپنی سے خطاب

"میرے شیر دل جوانو! وہ ساعت آ پہنچی جس کا ہمیں مدتوں سے انتظار تھا۔ ہماری ماؤں بہنوں کی عزت، ہمارے پاک وطن کی آزادی، ہمارے دین کی حرمت، سب کو چیلنج کیا گیا ہے اور یہ فرض، اب ہمارا ہے کہ ہم اپنی ماؤں بہنوں کے دوپٹے ان کے سروں سے نہ اترنے دیں۔ یہ شرف اب ہمارے حصے میں آیا ہے کہ اپنے پاک وطن کی آزادی کا تحفظ کریں۔ یہ عزت ہمیں دی گئی ہے کہ ہم پاکستان کو جو اصل میں اسلامستان ہے، دشمن کے ناپاک قدموں سے محفوظ رکھیں۔

میرے بہادرو، آگے بڑھو، دشمن کو بتا دو کہ تم کس کا کلمہ پڑھتے ہو، تم کس کے نام لیوا ہو، تم دشمن کو بتا دو کہ تم کن بہادروں کی اولاد ہو۔ کن ماؤں نے تمہیں پالا ہے۔

موت؟ موت کا خوف؟ موت تو مسلمان مجاہد کے لئے بنی ہی نہیں۔ شہید تو مرتا ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے میدان جنگ سے باہر تو موت ہے۔ رستے گلی کوہ و بیابان میں زمین و آسمان میں ہر جگہ موت ہی ہے لیکن میدان جنگ میں مسلمان سپاہی کے لئے کوئی موت نہیں۔

شہادت سنز ورہے۔ شہادت ابدی زندگی ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دو قطروں سے زیادہ کوئی قطرہ پسند نہیں ایک آنسو کا وہ قطرہ جو اللہ کے خوف سے نکلے دوسرا خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں گرے"۔

تو میرے بہادرو، میرے مجاہدو، اللہ کی راہ میں وہ قطرہ گرانے کا وقت آن پہنچا۔ اور سب سے آگے میں خود ہوں گا۔ یاد رکھو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اگر کسی کا گرم خون گرے گا تو سب سے پہلے وہ تمہارے کمپنی کمانڈر ہو گا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر"۔

دیپال پور نہر پر حملہ

میجر محمد حنیف کی الفا کمپنی کے سپرد جو ٹاسک تھا وہ یہ تھا کہ بے حد دشوار گزار راستے سے گزر کر نہر کے بند پر دشمن کی نہایت مضبوط مورچوں کو تباہ کر کے نہر کے پل پر قبضہ کیا جائے یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ دفاع کے مقابلے میں آگے بڑھ کے حملہ کرنا یوں بھی ہزار درجہ زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے توپ خانہ اور بکتر بند دستے سب کچھ بڑی تعداد اور مقدار میں چاہیئے۔ لیکن یہاں تو وسائل بہت کم تھے اور ان ہی کم وسائل سے جوانوں کی ہمت اور اللہ کی نصرت کے سہارے میدان مارنا تھا چنانچہ میجر حنیف کی الفا کمپنی نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ دشمن کی بے پناہ گولہ باری بھی ان کے قدم نہ روک سکی۔ سارے حملے کے دوران میجر حنیف سب سے آگے تھے اور ان کا دستہ خاک و خون کے طوفان میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

پہلا زخم

وہ اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھے کہ ان سے چند گز کے فاصلے پر دشمن کا ایک گولہ آکر پھٹا جس کا ایک ٹکڑا میجر حنیف کی گردن میں آکے لگا اور خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ لیکن وہ وقت ایسا نازک تھا کہ انہوں نے اپنے زخم کی پروا نہیں کی پیش قدمی جاری رکھی اور جوانوں

کو بڑھاتے رہے۔ اللہ اکبر کی گونج میں جوان دشمن کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ان کے ٹاسک کی پہلی منزل تھی۔ دشمن نے بوکھلا کر اپنی گولہ باری شدید تر کر دی۔

دوسرا زخم

اس اثنا میں دشمن کا ایک اور گولہ اور قریب آ کے پھٹا جس کا ایک ٹکڑا ان کی ران میں پیوست ہو گیا۔ پہلے زخم سے بھی ابھی خون بند نہیں ہوا تھا کہ اس دوسرے زخم سے خون تیزی سے بہنے لگا۔ حنیف زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے لیکن آگے بڑھو، آگے بڑھو کے بڑھاوے برابر دے رہے تھے یہاں تک کہ خون زیادہ بہہ جانے سے ان پر نقاہت طاری ہونے لگی اور مزید قدم اٹھانے کے قابل نہ رہے تو اپنے نائب کماندار سے حملہ جاری رکھنے کو کہا۔ یہ آخری حکم دینے کے بعد ان کی آواز دھیمی ہونے لگی۔ وقت آخر آن پہنچا اور انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا۔ لاالہ الا اللہ کہتے کہتے ہونٹوں کی جنبش بند ہو گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

میجر حنیف، دین حنیف کی پاسبانی کرتا ہوا اللہ کو پیارا ہو گیا۔
وہ پیدا ہوا تو کنکر تھا جب شہید ہوا تو گوہر شب چراغ بن گیا۔

عارضی قبر

خاک و خون کے اس سیلاب میں باقاعدہ تدفین ممکن نہیں تھی۔ الفا کمپنی کے کچھ جانباز اپنے کمانڈر کے جسد خاکی کو اٹھا کر پیچھے پاکستان کی حدود کے ایک گاؤں کے قبرستان میں لے آئے۔ ایک عارضی سی قبر کھود کے جسم چٹائی میں لپیٹ کر اس میں دبا دیا اور اوپر سے مٹی ڈال کر لکڑی کے تختے پر لکھ دیا میجر محمد حنیف شہید۔ جوانوں نے اپنے کماندار کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ آخر سلیوٹ کیا اور اپنے مورچوں پر حاضر ہو گئے۔

ڈھڈیال میں تدفین

۴ دسمبر کی صبح کو میجر محمد حنیف کی شہادت کی خبر ان کے ماموں زاد بھائی مسعود ملک کو ملی۔ انہوں نے شہید کے والد میجر غلام حسین کو بتایا۔ باپ نے شہادت کی خبر سن کر صرف اتنا کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور سنبھل گئے اب مسئلہ یہ تھا کہ جسد خاکی کو ڈھڈیال لے جا کر باقاعدہ تدفین کا انتظام کیسے کیا جائے۔ جہاں ان کا عارضی مدفن تھا وہ تمام علاقہ میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ وہاں جانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ بہرحال باپ، بھائی نے اس مشکل کو آسان کیا اور جسد خاکی ڈھڈیال لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

۵۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بڑے احترام اور اعزاز کے ساتھ شہید کے جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

ستارۂ جرأت کا فرمان

میجر محمد حنیف کی شہادت کے بعد ان کو ستارۂ جرأت کا فرمان جاری ہوا اس کا ترجمہ یہ ہے۔

میجر محمد حنیف کا تعلق ۱۴ بلوچ سے تھا اور وہ الفا کمپنی کے کمانڈر تھے۔ ۳۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات تقریباً ساڑھے چھ بجے انہیں حکم ملا کہ وہ دشمن پر حملہ کر کے خشک دیپال پور نہر کے مغربی کنارے پر قبضہ کریں۔ ۱۴ بلوچ کا یہ حملہ بریگیڈ حملے کا پہلا مرحلہ تھا۔ تاکہ فیروزپور سیکٹر میں دشمن کی حسینی والا چوکی پر قبضہ کیا جا سکے۔ میجر محمد حنیف کی کمپنی کی ذمہ داری یہ تھی کہ قصور فیروزپور شاہراہ پر واقع بیکار دیپال پور نہر کے پل تک پہنچیں یہ جگہ حسینی والا ہیڈ ورکس سے تقریباً ۵۰۰ گز کے فاصلے پر تھی دشمن کے جس ٹکڑے پر قبضہ کرنا تھا یعنی بیکار دیپال پور نہر کا مغربی کنارہ اور پل اس کی کل لمبائی ۸۰۰ گز بنتی تھی۔ اس علاقے کی زمینی ساخت کچھ ایسی ہے کہ فارمنگ اپ کے لئے جس جگہ کا انتخاب کرنا پڑا تھا وہ دشمن کی چوکی سے صرف پندرہ بیس گز کے فاصلے پر تھی

نہایت ہی پر خطر اقدام تھا لیکن محمد حنیف اپنی کمپنی کے ساتھ جرأت سے آگے بڑھتے جوں ہی فارمنگ اپ کی جگہ پہنچے وہ دشمن کی سخت گولہ باری کی زد میں آ گئے بم کا ایک ٹکڑا میجر محمد حنیف کی گردن میں آ کے لگا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ لیکن میجر حنیف رکے نہیں وہ برابر اپنی کمپنی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی کمپنی کی رہنمائی کرتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک اور گولہ ان کے لگا لیکن بے مثال جرأت دلیری بے نظیر فرض شناسی اور قیادت کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی حالت میں بھی اپنی کمپنی کو پکار پکار کے یہی کہتے رہے۔ بہادرو آگے بڑھو، آگے بڑھو، منزل قریب ہے۔ فتح قریب ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ چند منٹ بعد شہید ہو گئے۔ آخر وقت تک وہ پورے طور پر ہوش میں تھے۔ شہادت سے ذرا پہلے انہوں نے اپنے سیکنڈ ان کمانڈ صوبیدار محمد اقبال سے پر جوش انداز میں کہا:

”صوبیدار صاحب پل تک ضرور پہنچنا ہے بند پر قبضہ کر کے چھوڑنا ہے“ خدا حافظ کہا۔ اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی اس مجاہدانہ، بے نظیر جذبہ سرفروشی، احساس فرض اور بے مثال قیادت کے لئے میجر محمد حنیف کو ستارہ جرأت دیا گیا۔

۱۴ بلوچ میں حنیف شہید کے آخری لمحات

لیفٹیننٹ کرنل محمد اشرف (کالج نمبر ۲۰۲۳) ملٹری کالج میں بھی حنیف شہید کے کلاس فیلو تھے، پی۔ ایم۔ اے میں دو سال ان کے ساتھ رہے پھر ایک ساتھ بلوچ میں بھی ان کے آخری لمحات تک ان کے ساتھ رہے حنیف شہید کے آخری لمحات کی تفصیلات کے لئے کرنل اشرف سے ہماری یہ گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ اشرف! آپ حنیف شہید کے ہمدم و ہمساز رہے ہیں حنیف شہید اور اس کے آخری ایام کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب:۔ جب میں ۱۴ بلوچ میں پوسٹ ہوا تو میجر حنیف شہید اس کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے۔

اور یہ بٹالین قصور۔ فیروز پور محاذ پر حسینی والا کے مقام پر سرحدی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئی تھی۔ اس وقت ۱۴ بلوچ نئی نئی کوئی چھ مہینے پہلے قائم ہوئی تھی۔ اور اس کو قائم کرنے میں میجر حنیف پیش پیش رہتے تھے یوں کہنا چاہیئے کہ حنیف ۱۴ بلوچ کے اولین معماروں میں سے تھے جب میں وہاں پہنچا تو فضا میں جنگ کی بو پھیلی ہوئی تھی اور افسروں و جوانوں کی گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا کہ دشمن کی طاقت و تیاری کیسی ہے اور کس قسم کی ہے۔ انٹیلی جنس رپورٹوں کی روشنی میں، اس موضوع پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ دشمن نے سارے علاقے میں دفاعی انتظامات کئے ہوئے ہیں خصوصاً قیصر ہند اور حسینی والا ہیڈ ورکس کے علاقے کو بظاہر ناقابل تسخیر قلعہ بندیوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے اس قسم کی اطلاعیں بھی ملی تھیں کہ آر سی سی مورچے بنائے گئے ہیں خاردار تاروں کی باڑھیں ہیں۔ خندقیں ہیں اور چپے چپے پر بارودی سرنگیں بچھی ہیں مقصد یہ تھا کہ جنگ کی صورت میں ستلج کے اس طرف کے علاقے پر ہم قبضہ نہ کر سکیں یہ افواہ بھی سنی گئی تھی کہ دشمن نے اپنی مورچہ بندیوں کے آس پاس بجلی کے تاروں کا جال بھی لگا رکھا ہے۔ اس قسم کی معلومات پر بحث کرنے کا جہاں ایک مفید پہلو تھا کہ دشمن کی طاقت اور تیاری کا اندازہ ہو سکتا تھا وہاں ایک مضر پہلو بھی تھا کہ دشمن کی تیاریوں کے مبالغہ آمیز بیانات سے لاشعوری طور پر یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ جیسے دشمن کے دفاعی انتظامات ناقابل تسخیر ہیں یا کم از کم ان کو توڑنا ناممکن نہیں تو از حد مشکل ضرور ہے۔ اس طرح کی ایک بحث کے دوران میجر حنیف نے جو رویہ اختیار کیا اور بحث کو جس طرح ختم کیا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حنیف کے تیور تو کچھ اور ہیں۔

سوال :۔ مثلاً انہوں نے کیا کہا تھا؟

جواب :۔ یہ کہ موت سے خوفزدہ ہونا ایک فطری بات ہے لیکن واقعہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

موت کا ایک وقت مقرر ہے، اسے اپنے وقت پر آنا ہے اور جب وہ وقت آجائے تو پھر کوئی کہیں جائے کہیں چھپے۔ موت سے وہ بچ نہیں سکتا اور رہی بات دشمن کی ناقابل تسخیر قلعہ بندیوں کی تو اس کا جواب ہے کہ جب ہر حربہ ناکام ہو جائے گا تو پھر ہم سر اٹھا کر دشمن کے مورچوں کی طرف چل پڑیں گے اور پھر خواہ کچھ ہو جائے رکیں گے نہیں ناقابل تسخیر قلعہ بندی نہیں ناقابل تسخیر انسان کا عزم ہوتا ہے۔

۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو جب دشمن کی ان ہی نام نہاد ناقابل تسخیر مورچہ بندیوں پر حملہ شروع ہوا تو میجر حنیف نے بعینہٖ وہی کیا جس کا اظہار وہ بار بار کر چکے تھے دشمن کے مورچوں کی طرف بڑھے تو پھر وہ رُکے نہیں۔ پہلی بار زخمی ہونے کے باوجود وہ پھر پورے عزم و حوصلے سے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ دوسری بار مہلک طور پر زخمی ہوئے اور گر پڑے گو اس حالت میں بھی وہ اپنے جوانوں کو بڑھاوا دیتے رہے یہاں تک کہ جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

سوال:۔ شہادت کے کچھ دن پہلے یا کچھ وقت پہلے انہوں نے کوئی ایسا فقرہ یا جملہ کہا یا کوئی ایسی بات کی جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہو کہ وہ شہادت کے لیے تیار تھے۔

جواب:۔ یقیناً بہت واضح طور پر۔

سوال:۔ کیسے؟

جواب:۔ ۴ر دسمبر ۷۱ء کو میں ان کے ساتھ تھا جب جوابی حملہ کرنے کے احکامات ملے اور "او" گروپ کی کارروائی ہو چکی تو میں نے دیکھا کہ میجر حنیف نے بہت سکون سے اپنی گھڑی پرس قلم جیسی ذاتی چیزیں اپنے بیٹ مین کے حوالے کیں اور کہا ان کو گھر پہنچا دینا۔ اس کے بعد جب میں نے فارمنگ اپ پوزیشن پر میجر حنیف کو آخری بار دیکھا تو اس وقت بھی وہ پرسکون نظر آئے، ان کے چہرے پہ خوف کا ہلکا سا یہ یا اضطراب کی ایک لکیر بھی نہیں تھی۔ اس وقت بھی میرے کانوں میں حنیف شہید کے وہ آخری الفاظ کہ مورچے ناقابل تسخیر نہیں ہوتے تسخیر کا عزم ناقابل تسخیر ہوتا ہے۔ گونج رہے ہیں اور فارمنگ اپ پوزیشن کا وہ منظر

بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے جب میں نے آخری بار حنیف کو دیکھا تھا۔ سد ماحول ایک خاموش ہیجان کی گرفت میں تھا ایک پُر ہول سناٹا تھا لیکن حنیف پُر سکون تھے۔ لیکن پُر عزم۔

شہید کا سراپا

شہید کا قد میانہ رنگ گندمی، بال گھنگریالے، پیشانی غیر معمولی طور پر کشادہ ابرو گھنے اور آنکھیں، سیاہ چمکدار، اور پر عزم تھیں۔ سینہ کشادہ، جسم سڈول اور چال میں متانت قدم چھوٹے رکھتے تھے۔ چہرے مہرے خدوخال کا مجموعی تاثر وجاہت کے ساتھ ساتھ شرافت وحیا کا تھا

لباس

خوش لباس تھے صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شوق حد سے زیادہ تھا کپڑوں میں پسندیدہ رنگ سفید تھا۔ جوتے ہمیشہ سیاہ پہنتے تھے۔ گرد وغبار سے اس حد تک بچتے تھے کہ گاؤں آنے پر صرف گرد وغبار کی شکایت کرتے۔

غذا

اچھے کھانے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا بلکہ کھانا کم کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد میٹھا رغبت سے کھاتے پھلوں میں مالٹا اور آم بہت مرغوب تھے۔ دودھ پسندیدہ مشروب تھا۔

محبوب مشغلہ

فوٹو گرافی ان کا محبوب مشغلہ تھا جب ملٹری کالج میں تھے تو اس وقت بھی کیمرہ فرصت کے اوقات کا ساتھی تھا بچپن سے لے کر شہادت تک ہر سال ہر موقعہ کے فوٹو ان کے البموں

ہیں موجود ہیں۔ دوستوں، بھائیوں، عزیزوں اسکول و کالج کی تصویریں ان کی۔
کتاب سے نکلی ہیں۔

پسندیدہ کھیل

کھیل کے شوقین تھے۔ خاص کر ہاکی اور باکسنگ، ہاکی رائٹ ان کے عمدہ کھلاڑی تھے لیکن باکسنگ کے عمدہ کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ ٹریننگ کے دوران کاکول میں ایک نائجیرین کیڈٹ بھی باکسنگ کا بڑا ہوشیار اور اعلیٰ کھلاڑی تھا۔ وہ ہمیشہ کھیل میں اپنے مدمقابل کو تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دیتا تھا۔ لیکن اس کا مقابلہ حنیف ملک سے ہوا تو حنیف ملک نے سے دوسرے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دیا۔ ٹریننگ کے دوران کورس میں تین اور بھی ان کے ہم نام تھے لیکن جب حنیف ملک کو بلانا مطلوب ہوتا تو حنیف باکسر کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ پی۔ ایم۔ اے کاکول میں باکسنگ کلر بھی حاصل کیا۔

عادات اور اطوار

میجر محمد حنیف نے جس دیندار گھرانے میں پرورش پائی تھی اس کا اثر ان کی تمام عادات اور اطوار پر تھا۔ زیادہ باتیں کرنے یا اونچی آواز سے بولنے کی عادت نہیں تھی۔ اپنی بات پر اڑتے نہیں تھے اپنی رائے دے کر خاموش ہو جاتے تھے۔ والدین کے سامنے زبان نہیں کھولتے تھے۔ گاؤں میں جاتے تو ہر بزرگ سے جھک کر ملتے۔ اپنی افسری کو کبھی اپنی مجلسی زندگی میں ظاہر نہیں کیا۔ ماں نے غریبوں اور مسکینوں پر ترس کھانے کا جو درس دیا زندگی بھر انہیں یاد رہا۔ کوئی بہت پریشان حال اور خستہ حال نظر آجاتا تو اللہ، اللہ اُف، اف میرے اللہ رحم کر کہنے لگتے اور اپنی استطاعت پر اس کی مدد کرتے۔

دل کے صاف اور کھرے تھے غصہ ہوتے تو اس کا برملا اظہار کرتے۔ اپنی غلطی ہوتی تو

معافی مانگ لیتے ۔ دوسرے کی غلطی کو معاف کر دیتے تھے ۔ ماتحتوں کے ساتھ فراخ دلی اور ہمدردی کا رویہ تھا۔

دیپال پور نہر کے حملے میں جب وہ زخمی ہو گئے تو ان کے جوانوں نے ان سے بہت کہا سر آپ پیچھے چلے جائیں وہ نہ مانے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے جان نثار جوان از خود گولیوں اور گولوں کی بوچھاڑ میں ان کے جسد خاکی اٹھا کر پاکستان کی سرحد تک لائے اور اپنے ہاتھوں سے ایک عارضی قبر میں دفن کیا۔

شہید کی شخصیت و کردار کا جائزہ

جس طرح ایک پیڑ کے پتے ہزار ہوتے ہیں جڑ ایک ہوتی ہے اور اسی جڑ سے اس کے اندر کے بیج سے فیصلہ ہوتا ہے کہ پیڑ کیا ہے اور کیسا ہے ۔ اسی طرح ایک انسان ہزار کام کرتا ہے ان کی سب جڑیں اس کے کردار کے تانے بانے میں ہوتی ہیں۔ اس کی شخصیت کے سانچے میں ہوتی ہیں میجر محمد حنیف شہید ستارۂ جرأت کی بنیادی قدریں کیا تھیں اس امر کی وضاحت کیلئے ہم صرف چند واقعات ، اقوال و حادثات کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کریں گے ان سے خود بخود شہید کے کردار کی تصویر ابھر کر سامنے آجائے گی۔

شیروں کا جوڑا

ڈھڈیال کے مڈل سکول میں، حنیف اور ان کے بھائی حفیظ پرائمری میں پڑھتے تھے دوسرے لڑکوں سے لڑائی جھگڑا ہوتا تو حنیف شیر بن کر آگے آگے ہوتے اپنی دلیری کی وجہ سے لڑکے کہتے یہ شیروں کا جوڑا ہے۔

خون کے دھبے

حنیف کے والد میجر غلام حسین صاحب راوی ہیں کہ جب حنیف ملٹری کالج سرائے عالمگیر

پڑھتا تھا۔ تو کالج کی طرف سے باکسنگ میں مقابلہ سخت تھا جیت تو گیا لیکن لہولہان ہو گیا سفید بنیان پر خون کے دھبے ہی دھبے تھے۔ شام کو جب گھر آیا تو منہ سوجا ہوا تھا ماں کو بنیان دی کہ اس کو دھلوا دینا ماں جب بنیان کو دھونے لگیں تو بنیان پر اتنا بہت سا خون دیکھ کر گھبرا گئیں۔ پوچھنے لگیں۔ حنی بنیان پہ اتنا خون کیسا لگا ہے؟ حنی (حنیف) نے اطمینان سے جواب دیا "امی جی یہ میرا خون ہے خون دے کر ہی انسان بلند درجات حاصل کرتا ہے۔"

صاعقہ کے بارے میں وصیّت

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں میجر حنیف کا تقرر ڈھاکہ ہوا تھا اسی دوران کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام انہوں نے خود صاعقہ تجویز کیا۔ صاعقہ اس لئے کہ یہ بجلی بن کر چمکے جب ۷۱ء کی جنگ شروع ہونے والی تھی تو اپنے والد غلام حسین صاحب سے کہا۔

" اگر میں شہید ہو جاؤں کو صاعقہ کو بہتر سے بہتر تعلیم دلوایئے گا۔ اس کی تربیت کا خاص خیال رکھئے گا تاکہ یہ خاندانی اور اسلامی روایتوں کی امین ہو۔ اس کا نام میں نے صاعقہ رکھا ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعی صاعقہ ہو۔

حوصلہ اور فراخ دلی

حنیف اواخر نومبر ۱۹۵۵ء میں ملٹری کالج میں رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس پریفیکٹ تھے ایک روز مقررہ وقت پر ہاؤس کی روشنیاں نہیں بجھائی گئیں۔ کمانڈانٹ کرنل رفیق نے انہیں قیادت کی اس کوتاہی پر سزا دی انہوں نے کوتاہی کی ساری ذمہ داری خود قبول کی۔ کسی جونیئر کو عتاب کا نشانہ نہیں بنوایا اور خوش دلی سے صحیح اسپرٹ سے سزا اٹھائی۔ نہ صرف یہ بلکہ کالج سے جانے کے بعد کمانڈانٹ کو شکریئے کا خط لکھا اور کالج سے جو کچھ سیکھا تھا اس کا شکریہ ادا کیا۔

احسان وکرم

آخر میں ان کے اندازاً احسان اور کرم کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں ان کی شہادت سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے کہ ان کی کمپنی میں ایک جوان ایسٹ پاکستان کی بلوچ رجمنٹ سے تبادیل ہوکر آیا۔ اس جوان کا حقیقی بھائی ایسٹ پاکستان میں شہید ہو چکا تھا۔ وہ دو سال سے رخصت لے کر گھر نہیں گیا تھا ادھر تمام فوج میں رخصت بند تھی ایسٹ پاکستان میں جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ وہ جوان ان کے سامنے رخصت کی درخواست لے کر پیش ہوا۔ میجر حنیف ملک نے درخواست پڑھ کر ایک لمحہ کا تامل و توقف نہیں کیا اور اس جوان کے پریشان کن حالات کے پیش نظر اسے رخصت پر بھیج دیا وہ اپنے ماتحت جوانوں سے ہمیشہ انصاف کرتے اپنی شہادت سے تقریباً پندرہ دن پہلے جب رمضان المبارک میں رخصت گھر آئے تھے تو ان کی رخصت عید کے بعد تک تھی۔ عید سے دو تین دن پہلے انہوں نے اپنے تمام قبیلہ سے ملاقات شروع کر دی۔ اور کہنے لگے میں عید سے پہلے پلٹن میں جا رہا ہوں اور وہاں عید مناؤں گا۔ سب نے اصرار کیا کہ عید قبیلہ میں اکٹھے منائیں گے سال کے بعد آئی ہے اس کے انہوں نے جواب دیا۔ میرے جوان جنکی میری طرح مائیں بھائی، بہنیں ہیں وہ تو عید کی خوشی پلٹن میں منائیں گے اور میں ان کا کمانڈر ہوکر عید قبیلہ میں مناؤں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عید سے ایک دن پہلے پلٹن میں پہنچ کر جوانوں کے ساتھ عید منائی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ کار پر کسی ضروری کام کے لئے بازار میں گئے ان کی کار کے قریب ایک شکاری آگیا۔ جس نے تار کے پنجرے میں چھوٹی چھوٹی سبز نیلی رنگ کی خوبصورت چڑیاں بند کی ہوئی تھیں وہ چڑیاں چہک رہی تھیں انہوں نے شکاری کے پاس کار روک لی اور شکاری کو بلا کر پوچھا کہ یہ چڑیاں شوقیہ رکھی ہوئی ہیں یا فروخت کرتے ہو؟ شکاری بولا۔ فروخت کرتا ہوں۔ کہنے لگے اچھا کیا قیمت لوگے۔ شکاری بولا۔ ایک روپیہ فی چڑیا۔ انہوں نے وہ پورا پنجرہ جس

میں درجن دو درجن تک چڑیاں تھیں خرید لیا اور شکاری کے سامنے ہی پنجرہ کا منہ کھول دیا اور ایک ایک چڑیا پکڑ کر آزاد کر دی۔ جب سب چڑیاں آزاد ہو کر پاس کے درختوں پر جا بیٹھیں تو خالی پنجرہ پھر شکاری کو دے کر بولے خدا حافظ اور کار میں بیٹھ کر اپنے کام کو چل دیئے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

شہید کا خاندان

شہید اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے ان کے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ بھائی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

شہید کی شادی پھوپھی زاد بہن سے والدین کی مرضی کے عین مطابق ۱۹۶۴ء میں ہوئی تھی اس وقت وہ کیپٹن تھے۔ ان کی ایک بیٹی صاعقہ جو ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئی ایک بیٹا ہے جو شہادت کے ایک ماہ بعد باپ کی جگہ لینے دنیا میں آیا اس کا نام محمد ادریس خود ہی تجویز کر گئے تھے۔

Book Corner
PUBLISHERS. BOOKSELLERS
MAIN BAZAR JHELUM PAKISTAN

لیفٹیننٹ افتخار جعفر شہید

آرمرڈ کور

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ———— ۲۵ دسمبر ۱۹۴۱ء

جائے پیدائش ———— لاہور

کمیشن ———— ۲۷ پی-ایم-اے

تاریخ شہادت ———— ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

مقام شہادت ———— ڈوگرئی لاہور

شہادت کے وقت عمر ———— ۲۳ سال

مدفن ———— ڈھڈیال (جہلم)

افتخار جعفر شہید

" دیکھو آج فیصلے کا دن ہے۔ جس نے جانا ہے ابھی چلا جائے پھر نہ کہنا کہ شاہ جی نے مروا دیا۔ آج سودا ہے۔ اپنی جانیں بچالو۔ یا داتا کی نگری کی پندرہ لاکھ ماؤں اور بہنوں کی عزتیں بچالو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں فیصلہ کر چکا ہوں جیتے جی اس پاک سرزمین کو دشمن کے قدموں سے ناپاک نہیں ہونے دوں گا۔

یہ بے باک اور پرعزم آواز ایک نوجوان لیفٹیننٹ کی تھی اور مخاطب تھے اس کے ٹینک اسکواڈرن کے ۳۲ جوان۔ مقام تھا واہگہ سیکٹر۔ ستمبر ۶۵ء کی ۶ تاریخ اور طلوع آفتاب کا وقت نوجوان لیفٹیننٹ نے جو کہا تھا۔ سچ کر دکھایا۔ ۷ دن اس محاذ پر وہ شیر کی طرح دھاڑتا رہا۔ دشمن کے ناپاک قدم داتا کی نگری کی طرف اس نے نہ بڑھنے دینے تھے نہ بڑھنے دیئے آخر کار اسی تگ وتاز میں اس نے اپنی جان دے دی۔

یہ وجیہہ و شکیل لیفٹیننٹ جس کی تگ وتاز کی داستان دفاع لاہور کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔ ضلع جہلم کے ایک گاؤں ڈھڈیال کا سیدزادہ تھا۔ ۲۳ برس کی عمر کا بھرپور نوجوان افتخار جعفر۔

لیفٹیننٹ سید افتخار جعفر کی داستان حیات کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حسب ونسب وآباؤ اجداد

اقبال نے جاوید نامہ میں امیر کبیر شاہ ہمدانی کی تعریف وتکریم یوں کہا ہے۔

سیدالسادات، سالارِ عجم دست او معمارِ تقدیر امم

یہ سادات کے سردار، سالارِ عجم، تقدیر امت کے معمار، سید علی ہمدانی، افتخار جعفر کے مورث اعلیٰ تھے۔

سید علی ہمدان کے حاکم سید شہاب الدین کے ہاں ۱۲ اکتوبر ۱۳۱۴ عیسوی کے پیدا ہوئے ان کی والدہ ماجدہ کا نام سیدہ فاطمہ تھا۔ ان کا سلسلہ نسب سترہ پشتوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ سید علی ہمدانی علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ بار بار حج کیا۔ دنیا کی سیاحت کے سلسلے میں کشمیر میں پہلی بار ۱۳۷۰ میں وارد ہوئے اس وقت یہاں کا حاکم سلطان شمس الدین تھا۔ جس نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ کشمیر میں دوسری بار سید ہمدانی ۱۳۷۴ میں تشریف لائے اس وقت سلطان شہاب الدین حاکم تھا۔ سید ہمدانی کے ساتھ سات سو ایرانی ہنرمند افراد تھے۔ جنھوں نے کشمیر میں ایرانی قالین بانی اور کئی صنعتوں کو فروغ دیا۔ سید ہمدانی کی تبلیغی سرگرمیوں سے ۳۷ ہزار غیر مسلم اسلام لائے اور کشمیر میں ہندو تہذیب کی جگہ اسلامی ایرانی تہذیب، سنسکرت کی جگہ فارسی عربی زبانیں رواج پانے لگیں۔ سری نگر کی علی مسجد جس کے سو ستون ہیں ان ہی کی یادگار ہے سید علی صرف مصلح مرشد، مبلغ ہی نہیں ادیب و شاعر بھی تھے۔ سیاست تمدن، علم الکلام، تصوف، شریعت پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں سے ذخیرۃ الملوک اور مودۃ القربا، خاص طور پر مشہور ہیں۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی کی کاوشوں سے کشمیر اور آس پاس کے علاقوں میں اسلام کا چراغ روشن ہوا اس عظیم خدمت کے لئے اقبال نے انہیں تقدیر امم کا معمار کہا۔ سید ہمدانی نے ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ کو انتقال کیا۔

سید ہمدانی کے بیٹوں نے کشمیر، ہزارہ، ایبٹ آباد سے لے کر مشرقی پنجاب تک اسلام کی روشنی پھیلائی۔ ان کے ایک بیٹے کا مستقر پٹیالہ پنجاب تھا ایک اور بیٹے اٹک کے علاقے میں مقیم ہوئے تھے۔ اٹک کے ضلع میں دندہ سندھ کا دربار اب بھی مشہور ہے یہیں شاہ بلاول کا مزار مرجع خاص و عام ہے شاہ بلاول کے بیٹے شاہ اسحاق نے ضلع جہلم کے گاؤں ڈھڈیال کو اپنا

مسکن بنایا۔ یہیں ان کا مزار ہے۔

یہی شاہ اسحٰق، افتخار جعفر کے پردادا تھے۔ نسبت سے افتخار ایک سید السادات گھرانے کا گوہر شب چراغ تھا۔ الحمد للہ کہ اس نے اپنی عالی نسبی کی لاج بھی رکھی۔

دادا اور والد

افتخار جعفر کے دادا کا نام سید علی عباس شاہ تھا۔ عباس شاہ نے ۱۸۹۸ء کی بوئر وار میں خدمات انجام دی تھیں۔ پھر ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں بھی برسرپیکار رہے اور نام پایا۔ سید عباس شاہ کے ایک بیٹے سید غلام جعفر شاہ تھے۔ جو خاندانی روایات کے مطابق فوج میں بھرتی ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں ۲/۲۵ پنجاب کے ساتھ لڑے اور خوب لڑے۔ لیکن تلوار کے ساتھ ساتھ کچھ تعلق قلم سے بھی تھا۔ اس لئے لڑائی کے بعد آرمی اسکول آف ایجوکیشن میں ایک کورس کرنے گئے۔ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے اس وقت وہ حوالدار تھے۔ لیکن جعفر حسین شاہ کو تلوار قلم کے علاوہ ایک اور فن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ فن تھا ہاکی کھیلنے کا فن۔ ہاکی وہ اتنی اچھی کھیلتے تھے کہ اسکول کے کمانڈانٹ نے انہیں بیلگام روک لیا۔ کہا "یہیں پڑھایا کرو اور ہاکی کھیلا کرو"۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر انہیں وی، سی، او جمعدار بنا دیا گیا جو اس زمانے میں بہت معتبر عہدہ تھا۔

۱۹۲۹ء میں جمعدار سید غلام جعفر حسین شاہ ملٹری کالج جہلم میں اردو کے انسٹرکٹر کی حیثیت سے وارد ہوئے اس وقت کالج کو شروع ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے۔ مڈل تک ہی پڑھائی ہوتی تھی ۱۹۲۹ء میں کالج کے کمانڈانٹ کیپٹن ڈبلیو، ایل کلارک ایم بی ای تھے۔ اس کے بعد جعفر شاہ نے کیپٹن ایچ ایچ کلارک اور کیپٹن (بعد کو میجر) ڈبلیو، بی سیلبی کا زمانہ بھی دیکھا جعفر شاہ نے ۱۹۳۶ء تک کالج میں پڑھایا بلکہ بقول میجر غلام احمد جو (ان واقعات کے راوی ہیں) سید غلام جعفر شاہ رابرٹس ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر بھی رہے اور اس انگریزی دور میں جبکہ لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا اسکول میں کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ جعفر شاہ صاحب کی مذہبی

اور اخلاقی تربیت لڑکوں کو صحیح راہ پر رکھتی تھی یہی وجہ تھی بحیثیت استاد وہ کالج میں بے حد مقبول تھے اور شاہ جی کے لقب سے مشہور تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فوج سے ریٹائر ہوکر شاہ جی لاہور میں ریلوے واچ اینڈ وارڈ میں انسپکٹر ہو گئے تھے اور لاہور ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

شاہ جی کے بارے میں ایک اور امر بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے شادی بھی ایک نہایت اعلیٰ اور معزز خاندان میں کی تھی۔ ان کی زوجہ خان بہادر ارسطو جاہ سید رجب علی شاہ کی پڑپوتی تھیں۔ جو کبھی برٹش ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ رہے تھے۔

سید جعفر شاہ کے بارے میں صوبیدار میجر سید شہزادہ عالم لکھتے ہیں:۔

شاہ جی میرے سگے ماموں تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے وہ جامع الصفات انسان تھے مثلاً یہ کہ ہاکی کے بہت نامور کھلاڑی رہے تھے۔ بڑے معرکے کے شہسوار تھے۔ لیکن استاد بھی بہت اچھے تھے۔ مذہبیات سے بھی بہت دلچسپی تھی ساتھ ہی زندہ دل بھی تھے۔ زندگی کا ولولہ بھی ان میں غیر معمولی تھا۔ ہاں ۱۹۶۵ء میں افتخار کی شہادت کے بعد قدرے بجھ گئے تھے۔ افتخار شاہ جی اور اپنے آباؤ اجداد کی بہترین صفات کا مظہر تھا۔

شاہ جی صرف پیشہ کے طور پر استاد نہیں تھے۔ بلکہ عملاً بھی تعلیم و تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ جی ۱۹۳۶ء میں فوج سے ریٹائر ہوکر ۱۹۷۸ء میں اپنی وفات تک تقریباً چالیس سال لاہور میں رہے اور ایک عرصے تک ریلوے کے محکمے واچ اینڈ وارڈ میں انسپکٹر رہے لیکن اتنے طویل عرصے تک وہ کرائے کے مکان میں رہتے رہے اپنا مکان نہیں بنایا۔ اپنی ساری توجہ اور سارا پیسہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں صرف کر دیا۔ کوئی مکان کی بات کرتا تو کہتے میں مکان بنانے والوں کو بنا رہا ہوں۔ اگر بچے پڑھ لکھ کر کچھ بن گئے تو یہ اپنے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ مکان خود بنا لیں گے اور ہوا بھی یہی اللہ نے شاہ جی کو ان کی کاوشوں کا بھرپور صلہ دیا۔ ان کے چار بیٹے فوج میں افسر ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں ایک صاحبزادے جو سول میں گئے انہوں نے

فزکس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر باپ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ سبحان اللہ ہمہ خانہ آفتاب است۔ یہ سب شاہ صاحب اور ان کے بزرگوں کا فیضان ہے۔

اس تمام گفتگو سے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ افتخار جو کچھ بھی تھا وہ اتفاقاً یا حادثاتی طور نہیں تھا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر و تربیت میں صدیوں کی روایتیں کارفرما تھیں۔

افتخار جعفر کی پیدائش

سید غلام جعفر شاہ کے یہاں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ چار بیٹے اور بھی تھے یہ پانچواں تولد ہوا تو ان کے دل نے کہا "جعفر شاہ اس بیٹے پر تمہیں تمہارے خاندان تمہاری قوم کو فخر ہوگا۔ اس کا نام افتخار رکھو جعفر شاہ نے دل کی بات مان لی اور بیٹے کا نام سید افتخار جعفر شاہ رکھا گیا۔

بسم اللہ اور ابتدائی تعلیم

افتخار کی رسم بسم اللہ چار برس چار مہینے چار دن کی عمر میں ہوئی۔ پہلے قاعدہ بغدادی پڑھا پھر ناظرہ قرآن پڑھنا شروع کیا۔ رسمی تعلیم کے لئے افتخار جعفر کو مغل پورے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔

افتخار جعفر اسلامیہ ہائی سکول مغلپورہ لاہور میں ساتویں درجے میں تھا کہ غلام جعفر شاہ صاحب نے اسے ملٹری کالج میں داخلے کا امتحان دلایا داخلے کے فارم میں ایک خانہ تاریخ پیدائش کا بھی تھا اس کی تصدیق کرتے ہوئے اسلامیہ ہائی اسکول مغلپورہ کے ہیڈ ماسٹر محمد مشتاق نے لکھا یہ لڑکا اپنی کلاس (ہفتم) کے بہترین لڑکوں میں سے ایک ہے۔ یہ تحریر ۱۳ جنوری ۱۹۵۳ء کی ہے۔ اس وقت افتخار کی عمر ۱۲ سال اور ۲۰ دن کی تھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس چھوٹی عمر میں بھی اسے بہترین ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ زندگی کے دوسرے مرحلوں اور دوسری منزلوں میں بھی اس نے یہ

امتیاز برقرار رکھا اور جب ۲۴ برس سے بھی کم عمر میں عین عالم شباب میں اس زندگی کو خیرباد کہا تو وہ موت بھی بہترین تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے یہ شاہکار صرف اس لئے بنایا تھا کہ اسے ایک اور شاہکار پر قربان کردیا جائے۔ سچ ہے کہ بڑی چیزوں پہ بڑی قربانی ہی بجتی ہے۔

افتخار جعفر کے بڑے بھائی

لیفٹیننٹ کرنل حسن جعفر شاہ لکھتے ہیں:

"جس دن افتخار نے ملٹری کالج میں داخلے کا انٹرویو دینا تھا اسے ملیریا تھا اور ۱۰۴ درجے کے بخار سے جل رہا تھا۔ سب نے کہا نہ جاؤ۔ انٹرویو نہ دے سکو گے اس نے ضد کی تو بڑے شاہ جی افتخار کو انٹرویو کیلئے لے گئے۔ انٹرویو دے کر واپس آیا تو سیدھا چارپائی پر جا گرا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "فتی انٹرویو کیسا ہوا"، کہنے لگا "بھائی جان دعا کریں میں کامیاب ہو جاؤں" اللہ نے اس کے دل سے نکلی دعا سن لی اور جب کالج سے بلاوے کا خط آیا تو پھولا نہ سماتا تھا اصل میں یہ خوشی فوجی بننے کی تھی۔ گھر والے چاہتے تھے چھوٹا ہے علم و فن کی طرف جائے لیکن اسے تو ایک ہی دھن تھی کہ فوج میں جاؤں گا کسے خبر تھی کہ بارہ برس بعد یہ فوجی افسر بن کر عین عالم شباب میں اسی لاہور کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان قربان کرے گا"

افتخار جعفر ملٹری کالج میں

افتخار جعفر ملٹری کالج میں یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو داخل ہوا ۲۱۸۰ کالج نمبر تھا گو وہ اسلامیہ ہائی سکول مغلپورہ لاہور سے ساتواں درجہ پاس کر چکا تھا لیکن اسے یہاں چھٹے درجے میں داخل کیا گیا۔ سلین ہاؤس (حال بابر ہاؤس)، اس کا پہلا ہاؤس تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت اسکین ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر علی خان اور ہاؤس آفیسر کیپٹن (حال ریٹائرڈ بریگیڈیر محمد شفیع سابق

ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن) تھے۔ مظہر علی خان صاحب بچوں کے لئے شفقت میں ماں سے بڑھ کر تھے۔ تقریروں ڈرامے وغیرہ غیر نصابی سرگرمیوں کی نگرانی مسٹر سعید راشد کے ذمے تھی اور سونے پر سہاگہ شفیع صاحب کی ماہرانہ تربیت و رہنمائی بچوں کے لئے پھلنے پھولنے کا بہترین ماحول میسر تھا افتخار جعفر جوہر قابل تھا چمک اٹھا۔ اسے کالج میں آئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ کالج کے ایڈمنسٹریٹو اکاؤنٹس افسر لیفٹیننٹ عبدالوہاب کا الوداعی ڈنر ہوا اس ڈنر میں جو کیمسٹری لیبارٹری کے سامنے ہوا تھا کالج کے سب سے چھوٹے اور سب سے جونیئر لڑکے کی حیثیت سے افتخار جعفر نے تمام کالج کی طرف سے راؤ صاحب کو الوداع کہا اس تقریر میں مزاح کا رنگ بھرا ہوا تھا۔ راؤ صاحب بہت بلند آواز تھے جب اپنے دفتر سے (جو اسکین ہاؤس اب بابر ہاؤس کے پیچھے کی طرف واقع تھا) ٹیلی فون پر ذرا جوش میں آکر بات کرتے تو ان کی آواز ایک فرلانگ دور تک سنی جا سکتی تھی۔ افتخار نے بڑے بھولپن سے کہا۔ "ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ راؤ صاحب ٹیلی فون کرتے ہیں تو بجلی کے تاروں کا احسان کیوں اٹھاتے ہیں" اس بات پر بڑا قہقہہ پڑا تھا چھٹے درجے ہی میں افتخار نے کالج کے اردو تقریری مقابلے میں حصہ لیا۔ اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ افتخار اتنا ذہین، اتنا سمارٹ، اتنا شائستہ اور چاق چوبند تھا کہ جلد ہی اس نے ہاؤس میں اپنی جگہ بنالی۔ جس طرح وہ سال بھر پہلے اسلامیہ ہائی اسکول مغلپورہ کے بہترین لڑکوں میں سے تھا۔ اسی طرح اب وہ ملٹری کالج جہلم کے بہترین کیڈٹس میں سے تھا اور آئندہ پانچ سالوں میں اس نے اس امتیاز کو برقرار رکھا۔

۵۴-۱۹۵۳ء میں اسکین ہاؤس کے ہاؤس آفیسر کیپٹن (حال ریٹائرڈ بریگیڈیئر) محمد شفیع تھے جو اپنی نکتہ سنجی اور تربیتی بصیرت کے لئے شہرت رکھتے ہیں ان کی نظر ہر لڑکے کی انفرادی خصوصیات پر رہتی تھی۔ ان شفیع صاحب نے افتخار جعفر کی پہلی سالانہ رپورٹ میں (۲۲ اپریل ۱۹۵۴ء) کو یہ لکھا۔

"نصابی تعلیم میں اوسط سے بلند ہے۔ گو ذہانت اوسط درجے کی ہے۔ لیکن کارکردگی اوسط سے بہت بہتر ہے اپنی خداداد صلاحیتوں کو احسن طریقے سے استعمال کر رہا ہے۔ بہت ہی مہذب

(کلچرڈ) اور باشعور ہے۔

ذمہ داری کو خوشی سے آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے اور تسلی بخش طریقے سے سرانجام دیتا ہے۔

قیادت کی فطری صلاحیت رکھتا ہے لڑکوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بغیر تیسخے چلائے یا ڈرائے دھمکائے ان سے کام لے سکتا ہے۔

سچا، کھرا اور نرم دم گفتگو۔

تقریر اور ڈرامے کیلئے غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے کالج کے تقریری مقابلے میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

گو جسمانی طور پر دبلا پتلا ہے لیکن حد درجہ چاق چوبند ہے اس لئے کھیلوں میں امتیازی طور پر اچھا ہے۔

شفیع صاحب کی عادت تھی کہ مثبت اور منفی کر کے رپورٹ لکھا کرتے تھے۔ اتنی بہت سی خوبیاں مثبت صفات کے تحت لکھ کر منفی کے تحت انہوں نے یہ دلچسپ ریمارک لکھا، ''اپنے ذوق و مزاج کے لحاظ سے آرمی کے لئے ضرورت سے زیادہ شائستہ ہے'' دیکھا جائے تو خامی کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے اس فقرے سے تعریف کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے۔ اصل میں اس کی صلاحیتیں اتنی غیر معمولی تھیں اور اس کی اٹھان اتنی انفرادیت رکھتی تھی کہ بے اختیار سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا تھا ایسے غیر معمولی لڑکے کالج میں کبھی کبھی آتے ہیں۔

چھٹے درجے کے سالانہ امتحان اپریل ۱۹۵۴ء میں انتخار نے ۲۵ لڑکوں میں دوسری پوزیشن لی اس کے فارم ماسٹر مسٹر محمد ایوب خان نے اپنی رپورٹ میں لکھا:۔

کالج کے بہترین لڑکوں میں سے ہے، انتہائی مہذب، اور شائستہ، سچا اور دیانت دار ہے کالج کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔ ساتویں درجے میں افتخار رابرٹس ہاؤس (حال شبیر شاہ ہاؤس) میں منتقل ہو گیا۔ ساتویں درجے میں اس کے فارم ماسٹر، کالج کی ایک باغ و بہار شخصیت

اور شفیق استاد مسٹر ریحان احمد بلگرامی تھے۔ بلگرامی صاحب صرف پڑھاتے نہیں تھے۔ بلکہ لڑکوں کو جگا دیتے تھے۔ شفقت ان پر ختم تھی۔ بلگرامی صاحب نے افتخار کی ساتویں درجے کی سالانہ رپورٹ ۱۹۵۵ء میں لکھا۔

"اچھا طالب علم ہونے کے علاوہ اس میں ایثار کا جذبہ بھی ہے۔ کلاس کے مفاد میں وہ زائد کام کی ذمہ داری بھی اٹھا لیتا ہے۔"

اگلے سال ۱۹۵۶ء میں جب وہ آٹھویں درجے میں تھا تو اسے کالج ہاکی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ اب اس کی عمر ۱۴-۱۵ برس کی تھی اور وہ آٹھویں درجے میں تھا۔

خواہ کوئی کتنا ہی ہونہار باصلاحیت ہو، بہرحال غلطی اور خطا سے عاری نہیں ہوتا چنانچہ افتخار کو ایک غلطی کی پاداش میں بید سے سزا دی گئی یہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کی بات ہے اس کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ بڑے کارنامے انجام دینے والے عام انسانی کمزوریوں سے بلند ہوتے ہیں اور یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ ایک غلطی یا سلب انسان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ افتخار کو بھی سزا کے بعد معاف کر دیا گیا۔ بلکہ درگزر کر دیا گیا۔ چنانچہ چند مہینے کے بعد اس کے فارم ماسٹر "مسٹر ریحان احمد بلگرامی" نے اس کی سالانہ رپورٹ میں لکھا۔

"غیر معمولی طور پر ذہین، سخت کوش، عزت کرنے والا، اچھا باکردار، لیڈر شپ میں اوسط سے بلند۔" اور رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر کیپٹن (بعد کو کرنل) مرتضیٰ حسین نے یہ رائے ظاہر کی۔

"سمارٹ ذہن، سعادت مند، ایمان دار، قابل اعتماد، محنتی، ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہے۔"

لیکن نویں درجے میں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصابی کاموں میں افتخار کی دلچسپی کم ہو گئی اور اپریل ۱۹۵۷ء میں اس کا سالانہ نتیجہ اچھا نہیں رہا۔ لیکن غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کی کامیابیوں کا دائرہ وسیع ہوتا رہا۔ اپریل ۱۹۵۷ء کی رپورٹ میں ہاؤس ماسٹر رابرٹس ہاؤس نے لکھا۔

"بلند عزم رکھتا ہے اور سامنے آنے کی کوشش کرتا ہے۔ انگریزی ڈراموں میں حصہ لیتا ہے۔ انگریزی کا اچھا مقرر ہے عام طور پر چلن اچھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی بچگانہ حرکتیں کرتا ہے۔

کتابی تعلیم کی طرف سے لاپروا ہوتا جا رہا ہے۔

۵۸-۱۹۵۹ء میں افتخار جعفر دسویں درجے میں تھا۔ پہلی سہ ماہی کا نتیجہ اتنا خراب تھا کہ اسے وارننگ دی گئی اور والدین کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ رپورٹ میں خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کا پاس ہونا بہت مشکل ہے لیکن مئی ۵۸ء میں افتخار نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ اسی سال اس نے ہاکی میں کالج کلر لیا۔ فرسٹ ایئر میں اس کے پری انجنیئرنگ کے مضامین تھے جن سے غالباً اسے کم دلچسپی تھی۔ فرسٹ ایئر کے سالانہ امتحان میں حساب اور کیمسٹری میں فیل ہونے پر اسے وارننگ ملی اس سال کی اس کی رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ لیکن کھیلوں، تقریروں، ڈراموں میں اس کی فتوحات میں کمی نہیں آئی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء کی انٹر ہاؤس انگریزی مقابلے میں اس نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال کالج کے انگریزی ڈرامے میں اس نے دوسری پوزیشن لی۔ اس ڈرامے کو مسٹر فضل حق حیدری نے ڈائریکٹ کیا تھا اور یہ ایک نہایت کامیاب پیشکش تھی۔ ۶۰-۱۹۵۹ء کے سیشن میں افتخار ایف۔ ایس۔ سی کے دوسرے سال میں تھا۔ تعلیمی حالت اچھی نہیں تھی لیکن اسے اس کی قوت تقریر کی وجہ سے رابرٹس ہاؤس کا سوشل سیکرٹری بنا دیا گیا۔

۶۰-۱۹۵۹ء افتخار کے لئے نصاب کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں کامیابیوں کا سال تھا اتھلیٹکس، ہائکنگ میں بھی اس نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ پی۔ اے۔ ایف اکیڈمی میں کالج کی طرف سے انگریزی مباحثہ میں شرکت کی جس کا عنوان تھا۔

ہم اپنے اجداد سے زیادہ خوش ہیں۔ اور کالج کے لئے ٹرافی جیتی۔ ۶۰-۱۹۵۹ء سیشن کیلئے افتخار جعفر کالج کی ڈبیٹنگ یونین کا وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ نومبر ۱۹۵۸ء میں جب رابرٹس ہاؤس ایم۔ جی ہاؤس میں منتقل ہوا تو افتخار کو ایم۔ جی ہاؤس کا پریفکیٹ مقرر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس زمانے میں محمود غزنوی ہاؤس کے ہاؤس آفیسر میجر قسیم صدیقی تھے۔ صدیقی صاحب نے ایک انٹرویو میں ہمیں بتایا کہ افتخار جعفر نے پی۔ ایم۔ اے میں سینئر انڈر آفیسر مقرر ہونے پر پی ایم۔ اے سے ایک خط لکھا۔ "اگر میں ایم۔ جی ہاؤس کا ہاؤس پریفکیٹ نہ مقرر کیا گیا ہوتا تو آج

اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکتا۔ اس کے لئے میں آپ کا اور کالج کا شکر گزار ہوں واقعہ یہ ہے کہ میں جو کچھ آج ہوں وہ کالج کی تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میجر قسیم صدیقی صاحب نہ صرف بہت اچھے استاد ہیں بلکہ طلباء کی تربیت کے فن میں بھی ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں جوہر قابل کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ان کو پروان چڑھاتے ہیں۔ افتخار جعفر کی شروع کی تربیت میں جو کردار مسٹر مظہر علی خان نے ادا کیا تھا وہ آخری سال میجر قسیم صدیقی نے بھی ادا کیا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ صدیقی صاحب نے ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء کو افتخار جعفر کی کالج میں آخری سالانہ رپورٹ میں جو کچھ لکھا وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں تفصیل سے نقل کیا جائے۔

"غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے محنتی ہے۔ ذہنی طور پر پختہ اور بیدار ہے سوشل ہے غیر معمولی قائدانہ صلاحیت کا مالک ہے۔ ایک اچھے لیڈر کی تقریباً تمام خوبیاں اور خصائل اس میں موجود ہیں بہت کامیاب ہاؤس پریفکیٹ اور کالج یونین کا وائس پریزیڈنٹ رہا ہے کالج ہیڈ بوائے کے طور پر بھی کچھ دنوں کام کیا ہے بہت اچھا انداز بیان ہے کالج کے بہترین مقرروں میں سے ہے۔ کالج کو اس کی ذات میں ایک بہترین آل راونڈر ملا ہے۔ ایک بہت ہی شاندار مستقبل اس کا انتظار کر رہا ہے۔"

قسیم صدیقی صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ نہ صرف ایک شاندار مستقبل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بلکہ ایک عظیم مستقبل بھی۔ قدرت نے اسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اس نے ان صلاحیتوں سے بہترین کام لیا۔ یعنی بہادری، جرأت سے شہید ہونا پسند کیا۔

مئی ۱۹۶۰ء میں ایف ایس سی امتحان ہوا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں نتیجہ نکلا۔ افتخار کی نصابی سرگرمیوں سے کم دلچسپی رنگ لائی۔ ۳۰۴ نمبر لے کر پاس تو ہو گیا لیکن ڈویژن تھرڈ تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں آئی۔ ایس۔ ایس بی کے سامنے گیا۔ منتخب ہونے کے بعد نومبر ۱۹۶۰ء میں پی۔ ایم۔ اے میں کمیشن کے لئے تربیت حاصل کرنا شروع کی۔

افتخار جعفر پی۔ایم۔اے میں

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں افتخار جعفر کے یار غار نادر پرویز تھے۔ہم نے میجر (ریٹائرڈ) نادر پرویز ستارۂ جرأت سے افتخار جعفر کے بارے میں پوچھا تو پہلے تو اداس ہوئے جیسے کوئی بہت گہرا غم تازہ ہو جائے سرد آہ بھر کے کہنے لگے "ایک یار جانی تھا نہ رہا۔اس کے جانے سے زندگی کا مزہ ہی ختم ہو گیا" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوں گویا ہوئے۔پی۔ایم۔اے کی تفصیل یہ ہے کہ افتخار جعفر ۲۷ ویں پی۔ایم۔اے لانگ کورس میں میرے کورس میٹ تھے۔خوش قسمتی سے ہماری کمپنی بھی ایک ہی تھی۔یعنی صلاح الدین کمپنی۔ہر وقت کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔گویا ایک جان دو قالب تھے ہم دونوں کی دلچسپیاں بھی ایک سی تھیں، سپورٹس، باکسنگ اور آؤٹ ڈور سرگرمیاں مجھے افتخار کی نڈری و تیزی پسند تھی وہ بے لاگ کھرا، دوستوں کا دوست تھا۔" افتخار جعفر کی پی ایم۔اے کی کارکردگی کے سلسلے میں ہم نے لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر لیفٹیننٹ کرنل عبدالغفار لیفٹیننٹ کرنل سرفراز سے بات کی یہ تینوں اولڈ بوائز بھی ہیں۔ان تینوں نے بھی یہی کہا کہ افتخار جعفر نے اکیڈمی میں بڑا نام پیدا کیا تھا خصوصاً سپورٹس اور تقریروں میں۔انگریزی۔تقریری مقابلے میں افتخار جعفر نے کئی انعام حاصل کئے تھے اور کمپنی کے تقریری مجلسوں کی صدارت بھی کرتے تھے۔آخری ٹرم میں کمپنی کے سینئر انڈر آفیسر تھے۔پی۔ایم۔اے کی ہاکی کلر ہولڈر تھے۔

کمیشن کے بعد

افتخار جعفر اپریل ۱۹۶۳ء میں کاکول میں پی ایم اے سے کمیشن لے کر نکلے اور ان کی پہلی پوسٹنگ ۲۳ کیولری کوئٹہ میں ہوئی۔اس بٹالین کے ایک افسر نے ہمیں بتایا۔

" فوجی زندگی تو گویا جعفر کی گھٹی میں پڑی تھی پہلے دن ہی سے جعفر نے اپنی رجمنٹ کی بہتری و برتری کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔خاص طور پر رجمنٹ میں اسپورٹس کا معیار بلند کرنے کی طرف

توجہ دی۔ جب ڈویژن کے سپورٹس مقابلے ہوئے لیفٹیننٹ جعفر کی کوششوں کا اثر سامنے آگیا۔ چونکہ وہ خود بہت اچھا کھلاڑی تھا اس لئے سپورٹس میں جان پڑ گئی ۔"

پیشہ وارانہ مہارت حاصل کرنے میں جعفر کی دلچسپی تھی۔ اسکواڈران افسر اور رجمنٹ کے سگنل افسر کی حیثیت سے اس نے اپنی ذمہ داری کو قابل تعریف طریقے سے ادا کیا۔

کوئٹے کی تقرری کے زمانے میں افتخار جعفر نے اپنی پلٹن کے ساتھ رن کچھ کے معرکے میں حصہ لیا اور کامران و بامراد لوٹے۔ اس کے بعد ۲۳ کیولری کے ساتھ لاہور آگئے۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے افتخار کو اپنے گھر کی پوسٹنگ سے بڑی خوشی ہوئی ایک عرصے بعد انہیں والدین اور بہن بھائیوں کے قریب رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ اکثر گھر آتے رہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے شاہ جی (والد) ضعیف ہو چکے ہیں۔ بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے (بڑے بھائی حسن جعفر کراچی میں پوسٹ تھے یہ صورت حال دیکھ کر انہوں نے کمانڈنگ افسر سے درخواست کی کہ انہیں گھر رہنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت ملنے کے بعد افتخار جعفر گھر رہنے لگے۔ کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ والدین کی خدمت کریں۔ افتخار کی زندہ دلی اور خوش مزاجی سے سارا گھر خوش تھا۔ ایک عرصے کے بعد اس گھر کا چہیتا اور لاڈلا گویا ہر شب چراغ گھر آیا تھا۔ عجب عید کا سماں گھر میں رہتا تھا اس طرح ابھی چند ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ فصل گل آخر ہوئی اور سارا چمن ٹوٹ گیا۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء

جنگ چھڑتے ہی لیفٹیننٹ افتخار جعفر نے اپنے اسکواڈرن کے ۳۳ جوانوں کو جمع کیا اور صرف چند باتیں کیں۔ "دیکھو آج فیصلے کا دن ہے جس نے جانا ہے ابھی چلا جائے پھر نہ کہنا کہ شاہ شاہ جی نے مروا دیا۔ آج سودا چکانے کا دن ہے اپنی جانیں بچالو یا داتا کی نگری کی پندرہ لاکھ ماؤں اور بہنوں کی عزت بچالو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں جیتے جی اپنے پاک وطن کی سرزمین کو دشمن کے قدموں سے ناپاک نہیں ہونے دوں گا۔ عزت سے جان دینے

کے موقعے روز روز نہیں آیا کرتے۔" یہ کہہ کر جنگی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے انہیں ریکی ٹروپ کے ساتھ مبینی ھالا کے علاقے میں کارروائی کرنے کا حکم ملا بڑے عزم حوصلے کے ساتھ جعفر نے اپنے دستے کی قیادت کی اور دشمن کے کئی حملوں کو پسپا کر دیا۔ اس معرکے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے دستے کے ساتھ تقریباً پورے طور پر دشمن کے نرغے میں آگئے تھے۔ لیکن وہ اپنی فراست اور جرأت سے کام لے کر دشمن کے گھیرے سے صاف نکل آئے۔ اس دن کی جنگ میں جعفر نے تن تنہا دو دشمنوں کو قیدی بنایا اور کچھ چھوٹے ہتھیاروں پر قبضہ کیا مبینی ھالا سے آنے کے بعد جعفر نے باٹا پور کے علاقے میں بی۔آر۔بی کنال کے ساتھ ساتھ پوزیشن سنبھال لی۔ یہاں بھی افتخار اور ان کے ریکی دستے نے دو روز خوب اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے ان دنوں ان کی ایک ٹانگ پر پنڈلی میں زخم بھی آیا لیکن وہ برابر برسرِ پیکار رہے۔ ۶ستمبر ۱۹۶۵ء ۱۰۴ بریگیڈ کے حکم پر اپنی یونٹ میں واپس آگئے۔

۶ستمبر کی صبح جعفر مصروف کارزار تھے لیکن والدہ اور گھر والوں سے بے خبر بھی نہ تھے بار بار گھر پیغام بھجواتے کہ مولا علی کے صدقے میں بخیریت ہوں آپ لوگ فکر نہ کریں۔ والدہ کے نام بار بار پیغام آیا کہ گاؤں چلی جائیں ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ بیٹے کو میدان جنگ میں چھوڑ کر ان کا جی گوشہ عافیت میں جانے کو کیسے چاہتا وہ لاہور ہی میں رہیں۔

گھر والوں سے آخری ملاقات

ستمبر کی ۹ تاریخ کو افتخار چند افسروں کے ساتھ چند منٹ کے لئے گھر آئے۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے خاک آلودہ، آنکھیں سرخ اور خمار آلود۔ ماں کا دل دیکھ کر دھک سے رہ گیا لیکن جعفر ہمیشہ کی طرح ماں کو دیکھ کر مسکرایا۔ "آپ ابھی تک گئے نہیں میں تو سمجھا تھا آپ سب چلے گئے ہوں گے۔ مجھے شک تھا اس لئے میں چلا آیا ہوں مجھے پریشانی رہے گی۔ آپ گاؤں چلے جائیں۔ میں چلا دعا کیجئے اللہ عزت رکھ لے۔" ماں کا دل ان جانے خوف سے ڈوب رہا تھا۔ وہ

بے اختیار افتخار کے سر، چہرے کو شانوں کو چوم رہی تھیں اس طرح ٹوٹ کر پیار کرنے سے افتخار نے ان کے دل کو پڑھ لیا۔ آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں میں چار دن سے گولیوں اور گولوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں دیکھئے مجھے کچھ ہوا ہے۔" پھر ہنس کر کہا "میرے لیے ابھی انڈیا میں گولہ نہیں بنا اس لئے آپ بالکل فکر نہ کریں اور جلدی سے مجھ پر آیت الکرسی دم کر دیں"

رخصت ہوا تو والدہ نے کہا کہ "بیٹا مجھے پیٹھ مت دکھاؤ چہرہ دکھاؤ اور اسی طرح واپس آنا۔" افتخار نے ایسا ہی کیا الٹے قدموں چہرہ ماں کی طرف کئے وہ گیٹ تک گیا اور پھر ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ والدہ سے کہہ گیا تھا۔ میرے کپڑے بیشک ساتھ لے جائیں میں آٹھ دن کے اندر اندر واپس آؤں گا۔" اور پھر وہی ہوا۔ اس نے وعدہ پورا کر دیا۔ آٹھ دن کے اندر اندر وہ شہید ہو کر ماں کے پاس پہنچ گیا۔ والدہ روئیں اور کہا کہ "بیٹا میں نے یوں تو واپس آنے کو نہیں کہا تھا۔"

محاذ جنگ سے افتخار نے ایک مختصر خط بھی والدہ کے نام لکھا۔ جس میں اپنی خیریت کی خبر دی تھی۔ یہ خط ۱۸ ستمبر کی دوپہر کو ملا۔ والدہ کو سب نے مبارکباد دی کہ بیٹے کا محاذ سے خیریت کا خط آیا لیکن والدہ پڑھ رہی تھیں اور ساتھ زار و قطار آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہا "نہیں پتہ کیوں میرا دل بے چین ہے اور خط پڑھ کے بھی تسلی نہیں ہو رہی ہے۔ کیسے ہوتی یہ وقت تھا جبکہ جعفر شہید ہو چکا تھا۔

شہادت سے پہلے کے معرکے

لاہور کے دفاع میں پنجاب رجمنٹ کے میجر امیر افضل خان نے بھی حصہ لیا تھا۔ ان ہی کی کمپنی سے تعاون کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جعفر نے میدان کارزار میں اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ اس معرکے کا آنکھوں دیکھا حال، میجر امیر افضل کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۲ ستمبر ۶۵ء کو دشمن پر یلغار کرتے ہوئے میرے معاون بکتر بند دستے کے کماندار میجر سرور

شہید ہو گئے۔ ان کا ٹینک بھی دشمن کے فائر سے تباہ ہو گیا۔ جب کچھ آگ بجھی اور شعلے ٹھنڈے ہوئے تو میں دیکھا کہ ایک نوجوان افسر اس ٹینک کا معائنہ کر رہا ہے۔ دشمن کا فائر جاری تھا لیکن نوجوان افسر اس سے بے نیاز، میجر سرور کی شہادت کے سارے کوائف کو نوٹ کر رہا تھا۔ اس کا ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا دشمن تاک میں ہے لیٹ کر یا بیٹھ کر نوٹ کرو جو کچھ نوٹ کرنا ہے میں نے اپنی بات پوری طرح ختم بھی نہیں کی تھی۔ کہ نوجوان افسر بول اٹھا۔ "اچھا آپ ہیں میجر افضل جنہوں نے اس حملہ کی قیادت کی تھی سر، میرا نام جعفر ہے۔ جب کبھی ضرورت ہو تو یاد کیجئے۔ آپ ہمیں میجر سرور شہید ہی سمجھیں لڑنا اور جان دینا ہمیں آتا ہے۔"

میں اس کے بے تکلف لیکن پر اعتماد لہجے سے متاثر ہوا۔ لیکن جب میں نے اسے میدان جنگ میں چلتے پھر دیکھا تو اور بھی متاثر ہوا۔ میدان جنگ کی گھن گرج میں اس کی چال ڈھال کا بانکپن ایسا تھا جیسا کہ شیر کچھار میں گھوم رہا ہو۔ پریڈ گراؤنڈ کی آن بان کو میدان جنگ میں بھی قائم رکھنا ہر کسی کا کام نہیں ہوتا۔ لیکن افتخار نے اس شان کو قائم رکھا تھا۔ بلکہ اس میں اضافہ کر دیا تھا۔ میدان جنگ میں جہاں موت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ بہت قریب سے سنی جا سکتی ہے خوف کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے۔ جو بڑے بہادروں میں بھی ایک کھینچاؤ پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ کچھ جیالے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس فضا میں غیر معمولی تب و تاب کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں اس پر ہول ماحول میں بھی ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ سرمست اور سرخوش نظر آتے ہیں جیسے اسی دن کے وہ جنم جنم سے منتظر تھے۔ یہ شہیدوں اور غازیوں کا امتیازی وصف ہے۔

جب جنگ شروع ہوئی تو جعفر دیکھ بھال کے ایک ٹروپ کے ساتھ اپنی رجمنٹ سے دور منہالہ کے علاقے میں تھے۔ وہاں انہوں نے بہت سے جنگی معرکوں میں حصہ لیا تھا اور دو بھارتیوں کو قیدی بنایا تھا۔ بعد میں وہ اپنی رجمنٹ میں آ گئے۔ جب لاہور کی فوج نے دشمن کے

خلاف جوابی حملہ کیا وہ اپنے ایک سکاڈرن کے ٹروپ لیڈر تھے۔

۱۵ ستمبر ہمارے لئے بہت نازک دن تھا یہں اسی روزان سے ملا۔ ۱۴ اور ۱۵ ستمبر کی درمیانی چاندنی رات کو بھارتی اپنے کچھ ٹینک جھگیاں گاؤں میں لانے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے ایک بڑی اچھی پوزیشن میں قدم جما لئے۔ وہ کیپٹن صغیر شہید کی کمپنی کے سامنے ایک پوزیشن میں تھے جہاں سے وہ نظر نہیں آتے تھے اور میری کمپنی کی آر آر ریکائیل رائفل، کی مار سے باہر تھے۔ اگر ہم اپنی آر آر کو دن کے وقت آگے لے جاتے تو یہ بہت خطرے کی بات تھی۔ ہم ان کا مقابلہ اپنے ٹینکوں کے ساتھ ہی کر سکتے تھے۔ ہمارے لئے اشد ضروری تھا کہ ہم دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کر دیں ورنہ اندیشہ تھا کہ دشمن ہماری پوزیشن پر چڑھ آئے گا۔ ٹینک ہمارا جینا محال کر رہے تھے۔ ہم اپنا سر بھی اٹھا نہیں سکتے تھے۔ ہماری حالت یہ تھی کہ مورچہ سے سر نکالنا مشکل ہو گیا تھا حوالدار تازہ گل نے اشارہ دینے کیلئے مورچے سے ہاتھ اوپر کیا اس کا ہاتھ ہی دشمن کے فائر سے اڑ گیا بڑی مشکل میں جان تھی ناقابل برداشت صورت حال تھی اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ آخر کار بڑی تگ و دو کے بعد میں نے ایک ایسی جگہ کا کھوج لگایا۔ جہاں اگر ہمارا کوئی ٹینک پہنچ جاتا تو دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کر سکتا تھا۔ اس نتیجے پر پہنچ کر میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں کپتان ناصر نواز جنجوعہ سے رابطہ قائم کیا اور اپنی تجویز بیان کی۔ اتفاق سے اس وقت لیفٹیننٹ جعفر بھی ہمارے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا اس نے کچھ میری آواز پہچانی تو ناصر نواز سے ٹیلی فون لے لیا اور کہنے لگا۔

سر،

میں خدمت کے لئے حاضر ہوں میں ٹینک آپ کی بتائی ہوئی جگہ پر لے آؤں گا۔ لیکن مجھے ایک گائیڈ کی ضرورت ہو گی آپ ہیڈ کوارٹر میں کسی گائیڈ کو بھیج دیجئے۔ میں نے کہا، گائیڈ کا کام تو میں خود کروں گا۔" اس پر افتخار بولا "یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔" میں نے اسے ایک جگہ کا پتہ و نشان بتایا کہ اس جگہ ٹینک لے آؤ۔ یہ کہہ کر میں اپنے مورچے سے نکلا اور بہت احتیاط سے کچھ پیٹ کے بل رینگ کر اور کچھ بیٹھ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس پوائنٹ کے قریب لیٹ

ٹینک کا انتظار کرنے لگا پھر میں نے وہ ناقابل فراموش نظارہ دیکھا جس کو میں اپنی یادوں کے خزانے سے تاریخ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ٹینک آرہا ہے اور اس کے آگے آگے افتخار جعفر چل رہا ہے اس حالت میں کہ پاؤں میں ربڑ کے سلیپر تھے۔ گویا بوٹ پہننے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ افتخار جس شان سے جس بانکپن سے ٹینک کے آگے جھوم جھوم کے چل رہا تھا اس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس سے پہلے میں نے بہت دنیا دیکھی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا اور زخمی بھی ہوا تھا۔ دوسری جنگ میں تمام اتحادی قوموں۔ امریکی۔ انگریز، کینیڈین۔ آسٹریلین، افریقین اور انڈین آرمی کی ہر قوم۔ جاٹ، راجپوت، گورکھا، ڈوگرہ وغیرہ سب لوگوں کو میدان جنگ میں دیکھا۔ پھر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگوں میں جس طرح میں نے افتخار جعفر اور اپنے نائیک زیب دین کو سینہ تان کے اور سر اٹھا کے چلتے دیکھا اس کی کوئی مثال کم از کم اپنی تمام فوجی زندگی میں نہیں دیکھی۔ وہ شیروں کی طرح چلتے تھے۔ جیسے ان کو لگنے والی گولی ابھی بنی نہیں۔

بہرحال میں آگے بڑھا اور جعفر کو اپنے پاس زمین پر بٹھا کر اسے دشمن کے ٹینکوں کی پوزیشن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہیں ٹھکانے لگانا کتنا ضروری ہے۔ جعفر کہنے لگا سر آپ فکر نہ کریں اور تماشا دیکھیں۔ پھر ٹینک سے باہر کھڑے ہو کر ٹینک کے توپچی کو ہدایات دیں اور آخر میں اس سے کہا جب تیار ہو جاؤ تو ہاتھ کھڑا کرنا۔ میرا فائر آرڈر یا علی کا نعرہ ہے۔ جوں ہی میں یا علی پکاروں تو تم گولہ داغ دینا۔ کچھ دیر کے بعد توپچی نے ہاتھ کا اشارہ دیا تو ادھر سے جعفر نے جلدی میں اپنے توپچی کو اشارہ کر دیا کہ اس پر بھی فائر کرو۔ توپچی نے فائر کیا لیکن نشانہ خطا گیا تو جعفر نے کہا۔ اوہو بڑی غلطی ہو گئی مولا علی کا نام لئے بغیر فائر کرا دیا اس لئے کام خراب ہو گیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کے کہا سر، آپ بھی علی کے غلام ہیں دشمن کا ایک ٹینک ادھر باقی ہے مجھے اس کو واصل جہنم کرنے دیں۔ اس دفعہ آپ بھی میرے ساتھ یا علی کا نعرہ لگائیں۔ چنانچہ جب جعفر نے دوسری بار علی کا نعرہ مارا تو اس کی آواز کے ساتھ میری آواز بھی شامل تھی۔ پھر جو نظر اٹھی تو دیکھا کہ دشمن کا دوسرا ٹینک

بھی شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔

میں اٹھا اور جعفر کو گلے لگایا۔ خدا کی قسم جو لطف بہادر کو گلے لگانے سے آتا ہے اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک بہت مشکل کام تھا جو جعفر نے ہنس ہنس کر انجام دیا۔ میدان جنگ میں جعفر کی چال ڈھال پھرت اور بات چیت کا انداز یہی تھا جو ایک اچھے کھلاڑی کا کھیل کے میدان میں ہوتا ہے۔ پرشوق، پراعتماد اور پُرمسرت میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لیا ہے اور بڑے بڑے سورماؤں کو قریب سے دیکھا ہے لیکن جن دو ایک بہادروں کو میں نے میدان کارزار میں سرخوش ہوتے دیکھا ہے ان میں ایک جعفر تھا۔

جس مشن پر میں نے جعفر کو بلایا تھا وہ مکمل ہو چکا تھا میں نے کہا جعفر اب آپ جا سکتے ہیں وہ کانٹا نکل گیا ہے جو ہمیں اتنی تکلیف دے رہا تھا اب جب تک سکت باقی رہے گی دشمن کا مقابلہ کرتے رہیں گے جعفر کہنے لگا میجر صاحب یہی نہیں بلکہ آپ نے ہماری کہانی بھی لکھنی ہے جسے لوگ افسانہ سمجھیں گے اور واقعی ایک لحاظ سے جعفر ایک افسانوی کردار تھا۔ اتنا حسین، بانکا نوجوان۔ خوش رو ہی نہیں خوش خو بھی پرعزم بھی اور پراعتماد اور سب پر مستزاد۔ شوق شہادت سے وارفتہ جس شخص نے شہادت سے پہلے شہید کا چہرہ نہیں دیکھا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ شہید کے چہرہ پر کیسی چمک ہوتی ہے اس کی آنکھیں کیسی دمکتی ہیں۔

شہادت کا واقعہ

۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ۲۳ کیولری کے بی اسکواڈرن کو جھگیاں گاؤں پر قبضہ کرنے کا حکم ملا۔ یہ گاؤں ڈوگری سے مشرق کی طرف ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جھگیاں کے معرکے میں اسکواڈرن کے کمانڈر میجر محمد سرور شہید ہو گئے تو اسکواڈرن کا کوئی کمانڈر نہ رہا اس مرحلے پر افتخار جعفر نے اسکواڈرن کی کمان رضاکارانہ طور پر کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور آئندہ پانچ دنوں تک افتخار جعفر نے غیر معمولی جرأت فرض شناسی سے کام لے کر دو فٹ ٹینکوں کی مدد سے سخت مقابلہ کر

کے ڈوگری پر دشمن کی یلغار کو روکے رکھا۔ افتخار جعفر کی جنگی مہارت اور دلیری کی تعریف ۶ ار پنجاب نے بھی کی جو اس علاقے میں نبرد آزما تھے۔

۱۶ اور ۱۷ ستمبر کی درمیانی رات لیفٹیننٹ افتخار اپنی کمانڈ سیٹ سے اپنے گنر کو حکم دے رہے تھے کہ حملہ آور دشمن پر فائر کرے کہ ایک گولہ قریب آکے گرا جس سے انفنٹری کے دو سپاہی جاں بحق ہو گئے اور ایک شدید زخمی ہو گیا۔ لیفٹیننٹ افتخار جعفر اپنے ٹینک سے اتر کر نیچے آئے تاکہ زخمی سپاہی کو اٹھا سکیں۔ ٹھیک اس وقت ایک اور گولہ آکے پھٹا جس سے افتخار جعفر زخمی ہو گئے یہ دیکھ کر لیفٹیننٹ جعفر کے کریو ٹینک سے باہر آگئے تاکہ اپنے کمانڈر کو فرسٹ ایڈ دیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ زخم بہت گہرے اور خطرناک ہیں تو وہ انہیں ان کی جیپ کی طرف لے چلے تاکہ پیچھے لے جا سکیں ابھی یہ لوگ جیپ تک پہنچے نہ تھے کہ ایک اور گولہ سیدھا ان لوگوں کے آکے لگا جس سے یہ سب وہیں شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت گاہ ڈوگری سے مشرق میں ایک میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قطعہ ہے جو مٹی کی کچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے شہادت کے وقت جعفر کی عمر ۲۳ سال آٹھ مہینے ۲۳ دن تھی۔

شہادت پر بوڑھے باپ نے کہا

غلام جعفر شاہ صاحب کو اپنی اولاد میں افتخار سب سے پیارا تھا۔ اس کا نام افتخار بھی انہوں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا۔ جب سے افتخار لیفٹیننٹ ہوا تھا وہ اس کے سہرے کے پھول دیکھنے کی چاہت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوچتے تھے کہ بڑھاپا سعادت مند بیٹے کی سعادت مندی کی چھاؤں میں سکون سے گزار سکیں گے۔ کہ یکایک اس کی شہادت کی خبر آئی گھر میں جو لوگ تھے وہ آہ و بکا کرنے لگے۔ بوڑھے شیر نے شکر الحمدللہ کہا، اور آنسو پی لئے کہ یہی سادات کے شایان شان تھا۔ تعریف کرنے والوں سے جعفر شاہ بار بار یہی کہتے۔

"میں شکر ادا کرتا ہوں ذات باری کا کہ اس نے میرے بیٹے کو اس شہادت اور سعادت

کے لئے چنا۔ خدا کرے کہ آپ سب کے عزیز و اقارب غازی بن کر لوٹیں۔"

"شکر الحمد اللہ، شاہ صاحب کی زبان پر تھا جو آتا یہی کہتے۔ اور پھر سب حاضرین دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے۔"

ماں کا دل

ماں کا دل آخر ماں کا دل ہوتا ہے۔ ۹ ستمبر کی شام ہی کو جب افتخار جعفر گھر کی خیریت دریافت کر کے دروازے کی طرف پلٹے تو اسی وقت ان کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس لئے انہوں نے کہا تھا۔

"بیٹا پیٹھ دکھا کے نہیں منہ دکھا کے جاؤ۔" تو افتخار بولا "اماں جی لو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔" وہ پھر پلٹا اور ماں کی طرف منہ کر کے الٹے پاؤں واپس گیا۔ جاتے جاتے کہا "اماں جی نہ گھبرائیں آٹھ دن کے اندر واپس آؤں گا۔"

ماں آنسو پونچھ کر بار بار کہتی تھیں "میرے چاند اس طرح واپس آنے کو تو نہیں کہا تھا۔" تعزیت کرنے والی عورتوں سے کہتیں۔ بی بی زینب کے غم کو یاد کرو۔ آل رسول کو یاد کرو۔ اور میرے لئے دعا کرو۔"

تدفین

شہید کی لاش شہید کے چچازاد بھائی میجر اقتدار اور میجر ابرار حسین ڈھڈیال لائے تھے وہیں سیدوں کے آبائی قبرستان میں اس سید زادے کو بھی سپرد خاک کیا گیا تھا۔

قبر کے کتبے پر یہ اشعار درج ہیں۔

لہو سے داغ ملت دھو گیا ہے
فدا اپنے وطن پر ہو گیا ہے
یہ بزم افتخار رزم تو ہے
مجاہد تھک گیا تھا سو گیا ہے

ایک شاعر نے اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

بتا دیا ہے زمانے کو تو نے جان وطن
کہ ایسے ہوتے ہیں دنیا میں پاسبان وطن

بلند تیرے ہی دم سے رہا نشان وطن
ترے ہی عزم سے قائم ہے آج شان وطن

میں تجھ کو محسن ہر خاص و عام کہتا ہوں
تجھے اے وطن کے مجاہد سلام کہتا ہوں

شخصیت و کردار

نوجوان شہید افتخار جعفر جسمانی اعتبار سے بھی قدرت کے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا تھا۔ دراز قد، مضبوط، سرخ و سپید رنگ مسکراتی ہوئی اور ذہین آنکھیں ایسی چمکتی ہوئی جیسے ان میں ہیرے چمکتے ہوں۔ غرض وہ ہر اعتبار سے مردانہ وجاہت کی تصویر تھا۔

آہ کیسے کیسے لوگ اس ملک کی آزادی اور آن پر قربان ہوتے ہیں۔

صوبیدار میجر شہزادہ عالم کا بیان

سید شہزادہ عالم صاحب افتخار جعفر کے ماموں زاد بھائی ہیں۔ ان سے افتخار جعفر کا ذکر آیا تو کہنے لگے۔ عمر میں کافی فرق ہونے کی وجہ سے افتخار سے میرا براہ راست تعلق تو زیادہ نہیں رہا۔ البتہ افتخار کی شہادت کے سال بعد مجھے اس کے بارے میں اس کے ایک ساتھی اور دوست نے جو باتیں بتائیں وہ ضرور قابل توجہ ہیں۔

۱۹۶۶ء میں میں ۱۴ ہیوی آرٹلری میں ایجوکیشن جے۔ سی۔ او کے طور پر تعینات تھا۔ ایک دن بٹالین کے ایڈجوٹینٹ کیپٹن برکی (اب کرنل) سے جعفر کا تذکرہ آیا۔ تو میں نے کہا جعفر شہید تو میرا ماموں زاد بھائی تھا تو کہنے لگا عالم صاحب لڑنے والے سب ہی بہادر ہوتے

ہیں لیکن جعفر کی بات ہی اور تھی۔ جعفر کو میں پی ایم اے سے جانتا ہوں ہم دونوں ایک ہی کمپنی میں تھے۔ اس رفاقت کی وجہ سے میں جعفر کی افتادِ طبع سے خاصا واقف تھا۔ لیکن میدان جنگ میں، میں نے اسے جس عالم میں دیکھا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ غالباً وہ واحد افسر تھا۔ جو پوری لڑائی میں ٹینک سے باہر رہا۔ ٹینک کے محفوظ سیٹ میں بیٹھنا اس کی منچلی طبیعت نے کبھی گوارا نہ کیا۔ میدان جنگ میں اس طرح کھلے سے باہر رہنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ کوئی ٹوکتا تو جعفر کہتا جو گولی میرے لئے بنی ہے وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ باقی اللہ مالک ہے جعفر کے اسکواڈرن لیڈر کے شہید ہونے کے بعد قاعدے سے اسکواڈرن کے سیکنڈ ان کمانڈ کو جو ایک کیپٹن تھا۔ کمانڈر کی جگہ لینی چاہی تھی۔ جعفر کے سی او کی خواہش یہی تھی۔ لیکن جعفر نے اصرار کیا کہ اسے بھیجا جائے۔ سی او نے کہا۔ آپ لیفٹیننٹ ہیں تجربہ کم ہے۔ یہاں تجربہ چاہیئے۔ جعفر نے جوش سے کہا سر! میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ دشمن سے کچھ علاقے لے نہ سکا تو اپنی ایک انچ زمین دوں گا بھی نہیں اور ہوا بھی یہی جو اس نے کہا تھا کر دکھایا۔

یہ واقعہ جو میں نے کرنل برکی کی زبانی نقل کیا اس کی تصدیق میرے دوست صوبیدار میجر محمد افضل نے بھی کی۔ وہ جعفر کے ساتھ ٹھیک اس کے ٹینک میں شریک کار تھے۔ صوبیدار میجر محمد افضل نے مجھے بتایا جعفر ٹینک کی کمان کرتے تھے جب بھی میں نے کہا شاہ جی اندر آجائیے کچھ احتیاط بھی ضروری ہے۔ ان کا ایک ہی جواب ہوتا۔ علی والوں کو گولے کچھ نہیں کہتے۔ آپ فکر نہ کریں۔ جب لیفٹیننٹ جعفر صاحب کے گولہ لگا تو وہ حسب معمول ٹینک سے باہر تھے۔ گولہ لگتے ہی وہ گر پڑے۔ میں نے ٹینک سے نکل کر اس شیر دل سید زادے کو اٹھایا۔ تو وہ زخموں سے چور تھا۔ ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں اور کہا پانی دو۔ میں ابھی پانی کی بوتل کھول ہی رہا تھا کہ افتخار کے ہونٹ ہلے۔ کچھ کہا۔ غالباً مولیٰ علی کے الفاظ تھے اور یہ کہتے ہی اس جانباز کا سر ڈھلک گیا شبیر خدا کا نام لے کر یہ شیر شہید ہو گیا۔

افتخار بھائی کی نظر میں :- سب کا پیارا افتخار جو گھر میں آتا تو کوشش یہی ہوتی کہ سب

کے ساتھ مل کر بیٹھے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے اور سب کے ساتھ مل کر شرارتیں کرے۔ شاید زندگی کا عرصہ مختصر تھا اور اسی کم اور مختصر وقت اور زندگی میں وہ سب چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ یوں تو سب بہن بھائیوں سے پیار تھا۔ لیکن بڑے بھائی حسن جعفر سے بے حد پیار تھا اور اپنی ہر فرمائش انہیں سے کہا کرتا تھا اکثر ان کی قمیص اور ٹائیاں اس کی نذر ہوتیں۔ یہ تو گھر کی بات تھی اب دیکھئے باہر والے کیا کہتے ہیں۔

افتخار ملٹری کالج کے ہمعصروں کی نظر میں

لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین لکھتے ہیں:

میری زندگی کا پہلا ہیرو افتخار جعفر تھا۔ ایک حادثے میں جس ہمت و جرأت کا ثبوت انہوں نے دیا اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

تفصیل اس حادثے کی یہ ہے کہ یہ غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہے میں اس وقت پانچویں درجے میں تھا۔ افتخار جعفر مجھ سے سینئر تھے اور اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک چھوٹے کمرے میں رہتے تھے۔ ان دنوں ایک چھوٹے کمرے میں ایک دو لڑکوں کا اکیلے رہنا بڑی بات تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی صبح ہم حسب معمول ۴۴ ٹریک کے میدان میں (جو برڈووڈ ہاؤس کے اور جعفر کے کمرے کے عین پیچھے تھا) پی ٹی کیلئے جمع ہوئے۔ ابھی آدھی پی ٹی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے دیکھا کہ افتخار جعفر کے کمرے کے روشندان سے خوب دھواں نکل رہا ہے۔ سب لڑکے بھاگ کے ہاؤس میں جمع ہو گئے اور کمرے میں آگ لگنے کا تماشا دیکھنے لگے۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ پاس جائے اتنے میں، میں نے کیا دیکھا کہ افتخار جعفر دروازہ کھول کے کمرے کے اندر گئے اور بڑے اطمینان سے کچھ کتابیں اور کپڑے باہر نکال لائے اس طرح جعفر نے دو تین پھیرے کئے خوش قسمتی سے آگ پر جلدی ہی قابو پالیا گیا بعد کو پتہ چلا کہ جعفر کے ساتھی نے شیو کرنے کیلئے جو ہیٹر جلایا تھا وہ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ جعفر

نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ اچھی خاصی کھینچائی ہوئی۔ لیکن مجھے اس وقت جس چیز نے متاثر کیا وہ جعفر کی غیر معمولی جرأت تھی مجھے تو وہ کسی جنگی فلم کا ہیرو لگا جو ایک انتہائی مشکل حالات میں پہلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور میدان مار لیتا ہے۔

بریگیڈئیر رب نواز خان کالج نمبر ۲۰۹۲ نے افتخار جعفر کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔ ملٹری کالج میں افتخار مجھ سے جونیئر تھے۔ ساتھ کم رہا۔ لیکن وہ اس قسم کے جونیئر تھے جو کالج میں جانے پہچانے جاتے ہیں سب سے پہلے اسکین ہاؤس میں آئے تھے۔ جہاں مظہر صاحب ہاؤس ماسٹر تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ افتخار نے لیفٹیننٹ راؤ عبدالوہاب خان ایڈم افسر کے ریٹائر ہونے پر کیمسٹری لیبارٹری کے سامنے رات کو جو ڈنر ہوا تھا اس میں طلبہ کی طرف سے الوداعی تقریر کی تھی یہ افتخار کی پہلی تقریر تھی۔ بالکل بچہ تھا۔ پتلا دبلا لیکن جب بولا تو مزہ آ گیا۔ کچھ تو تقریر مزاحیہ تھی۔ اور پھر افتخار کے بولنے کا انداز بھی موثر تھا۔ جو لوگ اس زمانے کے ہیں انہیں یاد ہو گا کہ راؤ صاحب بہت بلند آواز تھے۔ ٹیلی فون پر اتنی زور سے بولتے تھے کہ ایک دو فرلانگ تو آواز جاتی ہی ہو گی اس بات کو افتخار نے یوں کہا تھا "راؤ صاحب فون پر تاروں کا احسان خواہ مخواہ لیتے ہیں۔ خدا نے جو قوت آواز ان کو دی ہے اس کی زد میں بہت دور دراز کے علاقے ہوتے ہیں"

مختصر یہ کہ بعد کو افتخار نے تقریر اور ڈراموں میں بڑا نام پیدا کیا۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر کا انٹرویو

سوال:۔ افسر کا اور جعفر کا ساتھ کالج میں بھی رہا ہے۔ آپ کا تاثر جعفر کی شخصیت کے بارے میں کیا ہے؟

جواب:۔ میرا کالج نمبر ۳۰۶۷ ہے جعفر کا ۱۰۸۰ ہے۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے خاصا جونیئر تھا تھوڑی دیر اسکین ہاؤس میں ہم دونوں کا ساتھ رہا۔ ۱۹۵۴ء میں رابرٹس ہاؤس میں وہ جونیئر ونگ میں تھا اور میں سینئر ونگ میں ۱۹۵۵ء میں جب مرتضیٰ صاحب نے مجھے پریفکیٹ بنایا تو

مجھے افتخار کو پرکھنے کا موقعہ ملا۔ اس سے پہلے ہاکی کے رشتے سے میں اسے جانتا تھا۔ چونکہ ہم دونوں کو ہاکی سے بے پناہ شوق تھا اس لئے کھیل کے میدان ہی میں زیادہ ملاقات ہوتی تھی۔ کھیل میں بھی انسان کی شخصیت خوب کھلتی ہے۔ کھیل بھی بے حد تیز اور بے خطر کھیلتا تھا۔ یہی بات مجھے اس کی پسند تھی۔ آگے آپ کی قسمت، اور مجھے یاد کرو گے۔ اس کا تکیہ کلام سا تھا۔ کھیلتے کھیلتے کہتا ہم نے تو صحیح پاس دے دیا۔ گول ہو نہ ہو۔ آگے آپ کی قسمت اور پھر وہی فقرہ ہمیں یاد کرو گے۔

سوال:۔ جعفر کی شخصیت کے بارے میں آپ کا کوئی ایک تاثر کیا ہے؟

جواب:۔ اگر اس کی شخصیت کو چند لفظوں میں سمیٹنا ہو تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ جو ارادہ وہ کر لے وہ کر کے چھوڑتا تھا۔ نتائج کی پرواہ کرنا اس کو نہ آتا تھا۔

سوال:۔ اس امر کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہو گی؟

جواب:۔ مثالیں تو اس کی بے شمار ہیں اس وقت صرف ایک بات یاد آ رہی ہے کہ جب میں ہاؤس پریفکیٹ تھا تو کہنے لگا محرم پر کافی چھٹی چاہیئے۔ ایک دن سے میرا بھلا نہ ہو گا۔ میں نے ہنس کر کہا تمہارا بھلا کتنے دنوں میں ہو گا۔ کہنے لگا اس بار کافی چاہیئں کم از کم چار میں نے کہہ سن کر ایک دن کی چھٹی اور دلوا دی۔ لیکن افتخار نے اپنی مرضی کی اور مزے سے چار دن گزار کر واپس آیا۔ میں نے کہا اب کیا ہو گا؟

کہنے لگا ہوتا کیا ہے۔ سزا ملے گی بھگت لیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ خطر پسندی اور خوئے وفا اس کے کردار کی خصوصیت تھی۔ جب بڑا ہوا تو یہ خطر پسندی اور خوئے وفا اسلام اور پاکستان کے کام آئی۔

کمانڈانٹ کرنل رفیق کی رائے

افتخار جعفر اکتوبر ۱۹۵۵ء سے اپریل ۱۹۵۹ء چار سال ملٹری کالج میں کرنل (اب ریٹائرڈ)

(بریگیڈیر) محمد رفیق کے زیر تربیت رہا۔ ہماری درخواست پر رفیق صاحب نے افتخار جعفر کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کیا۔

"اکہرے بدن کا بڑا سمارٹ لڑکا تھا۔ خوش مزاج اور خوش لباس۔ اس کی مزاح اور ظرافت کی حس بہت بیدار تھی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک چمک ہوتی تھی۔ بڑا تیز اور شریر۔ تقریروں اور ڈراموں میں اسے بہت مہارت تھی۔ اچھا طالب علم اور اچھا کھلاڑی۔ قیادت کی صلاحیت اس میں فطری طور پر تھی۔ سزا اسے میں نے صرف ایک بار دی بحیثیت مجموعی وہ کالج کے بہترین لڑکوں میں سے تھا۔ ہر لحاظ سے ممتاز۔ کالج میں اس نے اپنا نام روشن کیا تھا جنگ میں اس نے ملک و قوم اور کالج کا نام روشن کیا۔"

ایک جگری دوست کی یادیں

اب ہم افتخار جعفر کے ایک جگری دوست کی یادیں نقل کرتے ہیں۔ راجہ نادر پرویز لکھتے ہیں۔

"میرا ۲۷ ویں پی ایم اے لانگ کورس ہے۔ افتخار جعفر میرے کورس میٹ تھے۔ ہم ایک ہی کمپنی، صلاح الدین کمپنی میں تھے۔"

سب سے پہلے تو میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ جو مجھے افتخار نے خود سنایا۔

افتخار کو فوج میں جانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ لاہور میں ۲۷ لانگ کورس کے لئے اس کا میڈیکل ہوا تو اس کے سینے کے ایکس رے میں کچھ نقص تھا۔ ڈاکٹر نے کہا یہ معاملہ ہے تو تو فٹ نہیں۔ افتخار نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے تو افسر بننا ہے میں بنوں گا۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں آپ ایکسرے پھر دیکھئے۔ ڈاکٹر نے ایکس رے دیکھا اور پھر وہی رائے دی افتخار نے کہا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے ایک موقعہ اور دیجئے۔ صرف ایک اور۔ ڈاکٹر نے بمشکل اجازت دی۔ اچھا کل پھر آنا۔ جعفر سیدھا بڑے امام باڑے مصلے پر بیٹھ گیا۔ تمام رات روتا رہا۔ مولا پنجتن پاک کا صدقہ مجھے اس مرحلے سے گزارے۔ بہرحال صبح پھر ایکس رے ہوا اور صاف تھا۔ ڈاکٹر حیرت سے پلٹ کر

دیکھتا رہا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ گذشتہ روز کے ایکس رے میں جو نشانات تھے وہ دوسرے روز کے ایکس رے میں غائب تھے۔ افتخار نے جب یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا۔ تو اسے یقین تھا کہ اس کی دعاؤں نے اس کے سینے کو بدل دیا۔ میرا خیال ہے وجہ خواہ کچھ ہی ہو اس کی قوت ارادی کو بھی دخل تھا۔ بحیثیت دوست کے میں نے اسے بے حد ایثار پسند پایا۔ یوں تو چھوٹے بڑے بے شمار واقعات ہیں۔ اس وقت جو واقعہ مجھے یاد رہا ہے وہ ہتھیاروں کی ٹریننگ کے گھنٹے تھے جو افسر اس ٹریننگ کے انچارج تھے۔ بڑے سخت کسی کو معاف نہیں کرتے تھے ایک روز میں اپنا پل تھرو لانا بھول گیا۔ افتخار نے اپنا پل تھرو میرے حوالے کر دیا اور خود خوش خوش سزا بھگت لی۔ اس طرح کی باتیں روز ہوتی رہتی تھی۔

افتخار اور میں اپریل ۶۳ میں پاس آؤٹ ہوئے اس کی پوسٹنگ ۲۳ کیولری کوئٹہ میں ہوئی۔ میرا تقرر ۶ پنجاب میں ہوا تھا۔ وہ یونٹ بھی کوئٹہ میں تھی اس طرح حسن اتفاق سے ہم پھر اکٹھے ہو گئے۔ دفتر کے بعد زیادہ تر وقت ہم ساتھ ہی گزارتے تھے ایک روز ہم سینما دوسرا شو دیکھنے گئے جب شو ختم ہوا تو ہم نے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔ کسی افسر کی فیملی بھی سینما دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کس وجہ سے خواتین سوائے ایک لڑکے کے تنہا تھیں۔ ان کو اکیلا دیکھ کر غنڈے تنگ کرنے لگے۔ پاس سے گزرتے اور دھکا دینے کی کوشش کرتے۔ وہ بدمعاش سیاہ صافے باندھے ہوتے تھے جس سے ان کے چہرے بھی چھپے ہوتے تھے جعفر سے یہ منظر دیکھ کر رہا نہ گیا۔ اس نے بدماشوں کو منع کیا جب وہ نہ مانے تو بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنی باکسنگ کے مکے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ پانچ سات ہم دو وہ چیخ و پکار مچی اور افتخار نے چوٹیں بھی کھائیں میں بھی کچھ زخمی ہوا بہر حال ہم غنڈوں کو بھگانے اور افسر کی عزت بچانے میں کامیاب ہو گئے اس واقعہ کا کوئٹے میں مدتوں چرچا رہا۔ بیچ میں نام میرا بھی آتا رہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سارا کریڈٹ افتخار کا تھا۔ میں اگر میدان میں اترا تھا تو اپنے دوست کو بچانے اترا تھا جبکہ وہ اجنبی افسر کی عزت بچانے۔ کوئٹے کا واقعہ ہے کہ ایک پوسٹ آفس میں میرے ساتھ کچھ کلرکوں نے زیادتی اور بدزبانی کی۔ میں صبر

کر کے چلا آیا۔ آکر میں نے افتخار کو فون کیا افتخار نے موٹر بائک سنبھالی مجھے ساتھ لیا اور پھر ان گستاخوں کو اچھا خاصا سبق دیا۔ جس کی پاداش میں ہماری کافی کھینچائی ہوئی۔ لیکن افتخار اپنے دوست کی سبکی کا انتقام لے چکا تھا۔

میں نے بھی ابھی کہا ہے کہ افتخار کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ایثار پسندی تھی۔ اس میں خامیاں بھی تھیں جلد باز بھی تھا۔ تند تھا لیکن ذمہ دار بھی بہت تھا۔ پی۔ ایم۔ اے میں جو الاؤنس ملتا ہے وہ کون سی بڑی رقم ہوتی ہے افتخار اس میں سے اپنے بہن بھائیوں کے لئے کچھ نہ کچھ بچاتا رہتا تھا۔

پی۔ ایم۔ اے میں اس کا ریکارڈ بہت شاندار رہا اکیڈمی کی ہاکی ٹیم میں تھا۔ بہت اچھا مقرر تھا اس کو انعامات ملے۔ اپنی کمپنی کے تقریری مقابلوں کی صدارت کرتا تھا وہ اپنے کورس کے ٹاپ کیڈٹس میں سے تھا۔

آخر میں، میں عرض کروں گا کہ افتخار کو اس کی چھٹی حس بتاتی تھی کہ اسے زیادہ زندہ نہیں رہنا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔ کچھ کر کے جوانی میں مر جانا بہتر ہے۔ مجھے بے رنگ زندگی پسند نہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۶۵ء کو وہ کوئٹہ سے لاہور آیا مجھے دوسری ٹرین سے آنا تھا۔ میری گاڑی لیٹ ہو گئی۔ اس کو آگے جانا تھا۔ وہ اپنے سی۔ او کی اجازت سے مجھے اسٹیشن پر تلاش کرتا رہا۔ بعد کو اس کے سی۔ او صاحب نے مجھے بتایا کہ افتخار مجھ سے ملنے کے لئے بہت بے تاب تھا جب میں نہیں ملا تو کہنے لگا۔ واٹ اے پٹی۔ دیکھئے پھر ملتے ہیں یا نہیں" میں آج تک اپنی بدقسمتی کو روتا ہوں۔ صرف چند منٹ کی دیر نے زندگی بھر کیلئے یہ غم دے دیا کہ میں اسے مل نہ سکا"

افتخار جعفر کا خوبصورت سیلوٹ

آخر میں ہم افتخار کے ایک سینئر افسر کا ایک تاثر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک نقش بھی بھرپور ہے۔
"اپنی فوجی زندگی میں اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ایک اور راز اسکی خوش خلقی،

مسکراتا ہوا چہرہ، عجز وانکساری اور سب سے محبت وشفقت تھی۔ اس کی دلنواز مسکراہٹ اور خوبصورت انداز میں سلوٹ دو مخصوص چیزیں تھیں۔ اکثر افتخار جعفر کے آنے کی خبر ملتی تو میس سے کھانا کھاتے ہوئے سپاہی بھاگتے ہوئے آتے کہ جعفر کو سیلوٹ کریں اور پھر جواباً سلوٹ دیکھیں۔

حاصلِ کلام

حاصل کلام کے طور پر ہم مختار مسعود کی کتاب آواز دوست سے یہ فقرہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔"

کیپٹن احمد ضیاء خان شہید

بلوچ رجمنٹ

احمد ضیاء خان کی سوانح حیات اور ان کے آباؤ اجداد کے ذکر سے شروع کرتے ہیں۔

آباؤ اجداد

احمد ضیاء کے دادا سردار بابو کالا خان جنجوعہ اپنے قبیلے کے سردار تھے اور اپنے سب بھائیوں میں بڑے تھے۔ کالا خان نے اس زمانے میں جبکہ تعلیم اور وہ بھی تکنیکی تعلیم بہت کم تھی انجینئر کی تعلیم حاصل کی اور انجینئرنگ کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ بلوچستان میں ان کے تعمیر کرائے گئے کئی قلعے اب تک موجود ہیں اور بابو صاحب کے نام سے موسوم ہیں۔ بابو کالا خان کے چار بیٹے تھے۔ خداداد خان، محمد عبدالرحمٰن، محمد اسلم اور گل محمد بابو صاحب کی تربیت سے چاروں افسر بنے اور اپنے اپنے دائروں میں امتیاز حاصل کیا۔

میجر خداداد خان ایم۔بی۔ای کیپٹن احمد ضیاء شہید کے والد میجر خداداد خان کی زندگی کی کہانی بھی اپنے زور بازو اور فہم و فراست سے آگے بڑھنے اور اپنی جگہ پیدا کرنے کی کہانی ہے۔

میجر راجہ خداداد خان نے میٹرک کوئٹہ سے کیا اور اس عمر میں اسپورٹس میں اتنا نام پیدا کیا تھا کہ فٹ بال میں بلوچستان کی نمائندگی کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک راجہ صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ وہاں بھی انہوں نے اسپورٹس میں اعلیٰ کارکردگی کا معیار نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔ وہاں انہیں اپنے گروپ میں یونیورسٹی کا بہترین اتھلیٹ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کا شمار اپنے دور کے ممتاز ترین اسپورٹس مین میں ہوتا ہے۔

راجہ صاحب نے جنگ عظیم اوّل کے اواخر میں براہِ راست جونیئر کمیشن لیا۔ ۴/۱۰ بلوچ رجمنٹ سے وابستہ ہوئے۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں ریٹائر ہوئے تو ملٹری اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی پھر آنریری کیپٹن کا عہدہ پایا۔ دوسری جنگ عظیم میں خصوصی خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ نے ایم۔بی۔ای کے خطاب سے نوازا۔ جو اس زمانے میں ایک انڈین افسر کے لئے معمولی بات نہیں تھی۔ ۵ جون ۱۹۴۸ء کو راجہ صاحب کو آنریری میجر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں وہ ایم-ای-او کی آسامی سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۶۲ء مئی ۱۸ء کو حلد درجہ فعال زندگی گزارنے کے بعد راجہ صاحب نے انتقال کیا۔

جن لوگوں کو راجہ خداداد خان صاحب سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ گواہی دیں گے کہ وہ غیر معمولی پرکشش اور موثر شخصیت کے مالک تھے۔ پرجوش بیباک اور دھن کے پکے۔ ان کے انتظامی صلاحیت بے پناہ تھی۔ دوسری جنگ کے دنوں میں ان ہی صفات کی بنا پر ایم-بی-ای کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اپنی زندگی کا آخری زمانہ انہوں نے پنڈی میں گزارا اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے دو بیٹے جنرل ہیں۔ احمد جمال اور احمد کمال۔ تیسرے احمد نواز کاروبار کرتے ہیں۔ احمد ضیاء شہید ان کے چوتھے بیٹے تھے ان کے پانچویں بیٹے کا نام احمد شجاع ہے۔

احمد ضیاء خان۔ پیدائش اور بچپن

احمد ضیاء کا آبائی گاؤں مٹور تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی ہے۔ لیکن احمد ضیاء ۶ نومبر ۴۴ء کو کوہاٹ میں پیدا ہوئے جہاں اس وقت راجہ صاحب ایم-ای-او تھے۔ احمد ضیاء نے نے ابتدائی تعلیم اسٹیشن اسکول راولپنڈی میں پائی۔ یہیں سے انہوں نے فروری ۱۹۵۶ء میں چھٹے درجے کا امتحان پاس کیا اور ملٹری کالج میں ۲۲ جولائی ۱۹۵۶ء کو ساتویں درجے میں داخل ہوئے ۲۳۴۸ کالج نمبر تھا اور پہلا ہاؤس اسکین تھا۔

مئی ۵۷ء میں ساتویں درجے کے امتحان میں احمد ضیاء سوائے انگریزی کے سارے مضامین میں ناکام رہے۔ کلاس میں آخری پوزیشن تھی۔ نصابی ناکامی کے باوجود تعلیم و تربیت کے دوسرے شعبوں میں احمد ضیاء کی کارکردگی قابل تحسین تھی۔ ۱۹۵۶ء میں کالج کے کمانڈانٹ کرنل محمد رفیق تھے۔ اللہ نے انہیں دل ودماغ اور قیادت کی بہترین صلاحیتوں سے سرفراز کیا تھا کرنل رفیق ہر لڑکے پر ذاتی توجہ دیتے تھے اور ہر لڑکے کا باقاعدہ مطالعہ مختلف اوقات

میں کرتے تھے ان کی عقابی نظروں سے کسی کی خوبی یا خامی چھپی نہیں رہ سکتی کرنل رفیق کو (بریگیڈیئر) نے احمد ضیاء کے بارے میں مئی ۱۹۵۷ء میں یہ لکھا۔

ذہین اور سمارٹ اچھی انگریزی بولتا ہے۔ اپنے قد کے لحاظ سے جسمانی طور پر مضبوط ہے باہمت باکسر، کرکٹ کا اچھا کھلاڑی، ہاؤس کے ڈراموں میں حصہ لیتا ہے۔ اس لڑکے میں بہت کچھ ہے۔"

رفیق صاحب ایسے بالغ نظر کا یہ کہنا کہ اس لڑکے میں بہت کچھ ہے معنی رکھتا ہے بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس میں واقعی بہت کچھ تھا اس رپورٹ کا آخری جملہ یہ ہے۔ کاش اس کو اپنی صلاحیتوں کو پڑھنے لکھنے میں صرف کرنے کا خیال بھی ہوتا۔ لیکن یہ نہ ہو سکا۔ یہ وہ کمزوری تھی جو کبھی پورے طور پر دور نہ ہو سکی۔ ساتویں درجے میں دو بار فیل ہوئے۔ اور جی ایچ کیو کی خصوصی اجازت سے انہیں کالج میں رکھا گیا۔ ۵۹ء میں انہیں جب وہ ٹیپو سلطان ہاؤس میں تھے تو آٹھویں درجے میں ترقی دے دی گئی صورت حال کچھ بہتر تھی اس لئے اس بار انہوں نے صرف دو مضامین میں معیار سے کچھ نمبر کم لئے اس سال ان کے ہاؤس ماسٹر ایلن مور تھے۔ مسٹر مور نے یہ رائے ظاہر کی اس کے رویے میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ بہت اچھا کھلاڑی ہے اس نے اپنے ہاؤس کو کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال میں جتایا ہے۔"

۱۹۶۰ء میں آٹھویں درجے سے انہیں مشروط طور پر ترقی ملی۔ اردو اور حساب کی کمزوری اب بھی باقی تھی۔ لیکن قیادت اور شخصیت کے دوسرے دائروں میں ان کی ترقی قابل تحسین تھی۔ اس سال احمد ضیاء کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی۔

"ہنس مکھ اور پر اعتماد۔ پر جوش اور توانائی سے بھرپور۔"

۱۹۶۱ء میں نویں درجے میں انہیں ایک بار پھر شرط پر پاس کیا گیا لیکن جب وہ اگلے سہ ماہی امتحان میں اس شرط پر پورے نہ اتر سکے تو ایک بار یہ مسئلہ سامنے آگیا کہ تیسری بار ناکام ہونے پر انہیں کس طرح کالج میں رکھا جائے صورت حال بڑی عجیب تھی۔ ایک طرف تو تمام کھیلوں

اور اسپورٹس جیسے ہاکی، فٹ بال، کرکٹ باکسنگ اور تیراکی میں ان کی کارکردگی بہت اچھی تھی قیادت کے جوہر موجود تھے۔ شخصیت شائستہ تھی۔ لیکن اردو اور حساب کی کمزوری ابھی باقی تھی بہرحال تمام پہلوؤں پر غور کر کے انہیں ایک بار پھر خصوصی رعایت دی گئی اور احمد ضیاء نے اس چیلنج کو قبول بھی کیا اور جب جون ۱۹۶۲ء میں میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس تھے۔ ۴۶۹/۹۰۰ نمبر تھے ان کے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے پر بہتوں کو تعجب ہوا چونکہ یہ وہ پہلا امتحان تھا جس میں وہ پہلی کوشش میں پاس ہوئے تھے لیکن پھر احمد ضیاء کو جاننے تھے انہیں تعجب نہیں ہوا انہیں معلوم تھا کہ "احمد ضیاء میں بہت کچھ ہے" کرنل رفیق کا قول صحیح ثابت ہو چکا تھا اور اسے ایک بار پھر، میں راجستھان کے ریگ زاروں میں صحیح ثابت ہونا تھا۔

۱۹۶۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد احمد ضیاء نے فرسٹ ایئر میں آرٹس کے مضامین لئے۔ اکتوبر کے سہ ماہی امتحان میں پہلی بار ان کے نمبر اچھے تھے۔ ان ہی دنوں مار دھاڑ کے ایک کیس میں ماخوذ ہونے کی وجہ سے چند دنوں کے لئے انہیں معطل کر دیا گیا۔ وارننگ اور جرمانے کے بعد معافی ملی۔ اپریل ۱۹۶۳ء میں سیکنڈ ایئر میں آ گئے اگلے سال بورڈ کے امتحان میں دو پرچوں میں پھر رہ گئے۔ اردو اور جغرافیہ۔ احمد ضیاء کالج میں آٹھ سال گزارنے کے بعد ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء کو کالج سے رخصت ہوئے۔

کمیشن اور اس کے بعد

اکتوبر ۶۵ء میں احمد ضیاء ۲۷ لانگ کورس کے لئے پی۔ ایم۔ اے گئے۔ ایمرجنسی کی وجہ سے اس کورس کو شارٹ کورس میں بدل دیا گیا چنانچہ مارچ ۱۹۶۶ء میں انہیں شارٹ سروس کمیشن ملا۔ ۷ بلوچ میں پوسٹ ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں پلاٹون کمانڈر کی حیثیت سے ایس ایس جی میں شریک ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں ریگولر کمیشن دیا گیا

شخصیت پر تبصرہ

کسی پر اس کے دوستوں سے بڑھ کر کون تبصرہ کر سکتا ہے اس لئے ہم احمد ضیاء کے چند دوستوں کے انٹرویو نقل کئے جاتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل خالد بشیر نے ایک انٹرویو میں ہمیں بتایا۔

میں نے اور احمد ضیاء نے ملٹری کالج اور پی ایم اے میں خاصا وقت ایک ساتھ گزارا ہے ۱۹۵۶ء میں ہم ایک ساتھ ملٹری کالج میں داخل ہوئے تھے۔ پانچویں درجے میں اور ہاؤس بھی ایک تھا (اسکین اب بابر ہاؤس) اس زمانے کی دو تین باتیں میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

کھیلوں میں وہ بہت ممتاز تھے۔ بہت اچھے ڈائیور (غوطہ لگانے والا) کا اعزاز حاصل کیا۔ جمناسٹ بھی کمال کے تھے۔ کرکٹ بھی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ ان کی باکسنگ کو تو میں کیا اس دور کا کوئی لڑکا نہیں بھول سکتا۔ ۱۹۵۸ء میں ان کی فائٹ خالد کیانی سے ہوئی تھی۔ ضیاء کا قد کم تھا ہاتھ کی پہنچ بھی زیادہ نہیں تھی۔ خالد کیانی اپنے وزن میں مانے ہوئے باکسر تھے۔ فائٹ شروع ہوئی تو دھن دھن کی آوازیں آنے لگیں دونوں بپھرے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ خالد کی برتری تو خیر مسلم تھی۔ ضیا کے دوستوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے ڈر تھا کہ کہیں ضیاء ناک آؤٹ ہی نہ ہو جائے۔ ایک آدھ بار ضیاء پھسل کر گرے بھی ٹھیک اس وقت کرنل رفیق کی گرج دار آواز گونجی۔ باکس آن۔ دوسرے راؤنڈ میں ضیاء کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ ایک مکا چہرے پر زبردست لگا تھا۔ ضیاء لڑکھڑانے لگے تھے سکت بالکل نہیں رہی تھی صرف قوت ارادی اور حوصلے سے پاؤں پر کھڑے لڑ رہے تھے۔ آخر جب گھنٹی بجی تو ہماری جان میں جان آئی۔ ضیاء اپنے کارنر میں کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ان کا خاصہ تھا۔ نتیجے میں ضیاء کو بیسٹ لوزر قرار دیا گیا۔ ضیاء کی وہ فائٹ ان کے کردار کی آئینہ دار تھی سخت مشکل حالات میں بھی ڈٹے رہنا اور سب سے بڑی بات مسکراتے رہنا

ضیاء کی خصوصیت تھی۔

بس ایک کام ان کے بس کا نظر نہیں آتا تھا اور وہ تھا پڑھنا لکھنا۔ اُردو اور حساب میں ان کی گاڑی کسی طور پر چلتی ہی نہیں تھی۔

اکتوبر ۶۵ء میں ہم دونوں پی ایم اے میں ایک ساتھ ۳۷ کورس کے لئے داخل ہوئے اور ۱۳ مارچ ۶۶ کو ایک ساتھ ہی پاس آؤٹ ہوئے۔

پی۔ ایم۔ اے میں ضیاء نے آؤٹ ڈور میں خاصا نام پیدا کیا۔ پی۔ ٹی کے ایک خاص حصے ہارس کے تو وہ ایکسپرٹ تھے۔ ہم پہ جھاڑ پڑتی تو انسٹرکٹر کہتے دیکھو احمد ضیاء کو دیکھو یہ کس کمال سے ہارس کرتا ہے پھر احمد ضیاء سے کہا جاتا کہ وہ ہم نالائقوں کو اپنا کمال دکھائیں۔ پھر ضیاء میدان میں اترتے پھرتی سے بلکہ بے تکلفی سے دو ایک جست لگاتے اور ہمیں حیرت میں ڈال دیتے۔

اس زمانے میں احمد ضیاء کے بھائی کیپٹن (اب میجر جنرل) احمد کمال خان پی ایم اے کے ایڈجوٹینٹ تھے۔ لیکن احمد ضیاء نے کبھی ہم پر اس کا رعب نہیں ڈالا۔ کبھی ان کے نام کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا۔ احمد ضیاء کو اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا آتا تھا اور اس کے پاؤں بہت مضبوط تھے۔

شہادت

دسمبر ۷۱ء کی جنگ میں احمد ضیاء کی کمپنی چھور کے علاقے میں مصروف کار تھی ان کی پلاٹون کو کمپنی سے علیٰحدہ کر کے ایک آزادانہ مشن یہ دیا گیا کہ دشمن ہماری سرحدی چوکیوں پر قبضہ کرنے کی جو کوشش کر رہا ہے اس کا توڑ کیا جائے۔ ۵ دسمبر ۷۱ء کو دشمن نے ایک سرحدی چوکی پر انڈس رینجرز کی دو کمپنیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ انڈس رینجرز کے کمانڈنگ افسر کی درخواست پر احمد ضیاء رینجرز کی کمپنیوں کو گھیرے سے نکالنے گئے یہ جان جوکھوں کا کام تھا لیکن احمد ضیاء نے کمانڈو ایکشن کا بیڑہ اٹھا لیا۔ بدقسمتی سے اس عرصے میں دشمن چوکی پر قبضہ کر چکا تھا۔ احمد ضیاء

نے جوں ہی چوکی کے قریب اپنی کارروائی شروع کی وہ دشمن کی مشین گن کے فائر کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔

اس طرح احمد ضیاء جو لہلہاتے سبزہ زاروں اور سرد کوہستانوں میں پلا بڑھا اور جوان ہوئے تھا اس نے اپنی ابدی آسودگی کے لئے راجستھان کی گرم ریت چنی۔ پاکستان کے ناموس و وقار کے لیے۔

سلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

مدفن

حالات کچھ ایسے ہوئے کہ شہادت گاہ سے شہید کا جسد خاکی بھی واگذار نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ راجستھان کا ریگ زار ہی اس جیالے اور جوان شہید کا مدفن بنا۔

شخصیت و کردار

احمد ضیاء کی شخصیت و کردار کے جائزے کیلئے سب سے پہلے ہم ان کے بڑے بھائی لیفٹیننٹ جنرل احمد جمال خان کا انٹرویو پیش کرتے ہیں۔

سوال :۔ جمال صاحب! احمد ضیاء کے بڑے بھائی کی حیثیت سے ان کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب :۔ میں نے آپ کا مسودہ پڑھا ہے اس میں ضیاء کے بارے میں کم و بیش ساری ضروری باتیں آگئی ہیں۔

سوال :۔ پھر بھی ایک بھائی اپنے بھائی کے بُرے بھلے کو جتنی اچھی طرح جانتا ہے۔ گھر سے باہر کا کوئی فرد نہیں جان سکتا۔ اس لئے آپ کے تاثرات کی قدر و قیمت احمد ضیاء کی شخصیت و کردار کا جائزہ لینے کے لئے سب سے زیادہ ہے۔ یہ فرمائیے کہ ضیاء کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت جس نے آپ کو متاثر کیا۔ کیا تھی؟

جواب:۔ دو لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ نڈر اور بے خوف، ڈرنا اور خوف کھانا۔ ضیاء کی سرشت میں نہیں تھا۔

سوال:۔ اس فطری جرأت اور بے خوفی کی کوئی مثال اس وقت آپ کے ذہن میں ہے۔

جواب:۔ ایس ایس جی میں پیرا کورس بہت سخت سمجھا جاتا ہے۔ ضیاء نے پیرا کورس میں اوّل پوزیشن لی اور بہترین پیراٹروپر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۷۰ء میں ضیاء ۲۳ مارچ کی پریڈ کے لئے پیرا جمپنگ کی ریہرسل کر رہا تھا کہ مطلع ابر آلود ہو گیا۔ بادل ایسے گھر کے آئے کہ بارش ہونے کا امکان قوی نظر آنے لگا کسی نے کہا بارش ہوئی تو کیا کرو گے؟ ضیاء نے فوراً جواب دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں جمپ ضرور کروں گا۔ خواہ اولے ہی کیوں نہ پڑیں" اور جس لب و لہجے سے اس نے یہ کہا اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ صرف کہنے کی بات نہیں "کرنے کی بھی ہے۔ انگریزی میں اس نے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ بہت واضح تھے۔

سوال:۔ انگریزی کا فقرہ کیا تھا؟

LET IT RAIN OR HAIL, I'
M GOING TO JUMP ALL THE DAME.

جواب:۔ شکر ہے کہ اس دن بارش نہیں ہوئی۔

اب ہم احمد ضیاء کے چند دوستوں کے انٹرویو اور تاثرات نقل کرتے ہیں۔

جلیل احمد خان کا انٹرویو

سوال:۔ جلیل۔ آپ بھی کالج میں احمد ضیاء کے ساتھ کئی سال رہے ہیں۔ آپ کے ذہن میں کوئی ایسا واقعہ ہے جس سے احمد ضیاء کے کردار کے کسی اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔

جواب:۔ خالد کیانی سے ضیاء کی باکسنگ کا واقعہ بہت قابل ذکر ہے۔

سوال :۔ وہ تو ہم نے نوٹ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات؟

جواب :۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم واقعہ ضیاء کے ڈرم سے زخمی ہونے کا ہے۔

سوال :۔ اس کی تفصیل بتایئے؟

جواب :۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے زمانے میں کالج میں پریپ کلاسوں میں ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۶۲ء کی گرمیوں کا واقعہ ہے۔ مئی یا جون کا مہینہ تھا۔ ہم لوگ ہوسٹل ہال کی کلاسوں میں پریپ کے لئے محمود غزنوی ہاؤس سے سہ پہر کو آ رہے تھے کالج کنٹین کے سامنے سڑک کے اس پار چند کٹے ہوئے ڈرم پڑے تھے۔ مٹی کے تیل کے بڑے بڑے ڈرموں کو بیچ سے کاٹا گیا تھا پام کے پودے لگانے کیلئے ایسے پانچ سات ڈرم مٹی سے بھرے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے تھے احمد ضیاء کو جو شرارت سوجھی تو اس نے ایک سے دوسرے پر اور دوسرے سے تیسرے پر جمپ کرنا شروع کیا۔ ایک بار ایسا کر بھی لیا دوسری بار جب ذرا تیزی سے یہ کرتب دکھانا شروع کیا تو تیسرے یا چوتھے ڈرم سے گرے اور اس بری طرح گرے کہ ڈرم کا تیز کنارا گھٹنے سے ذرا اوپر ران میں اتر گیا۔ ضیاء کی پہلی چیخ تو ہم نے سنی۔ لیکن اس کے بعد مجال ہے کہ اس نے اُف بھی کی ہو۔ پھر اس کے چہرے پر اس کی مخصوص مسکراہٹ تھی ہم لوگ اسے اٹھا کر کالج ہسپتال لے گئے وہاں سے اسے سی ایم ۔ ایچ لے جایا گیا۔ جہاں سولہ ٹانکے لگے ران ہڈی تک کٹ گئی تھی لیکن ضیاء نے اپنی قوتِ برداشت پر حرف نہ آنے دیا۔ اس معاملے میں وہ قطعاً شیر تھا۔ اسی جرأت کا مظاہرہ احمد ضیاء نے وقت شہادت کیا۔

سوال :۔ مثلاً؟

جواب :۔ جب ضیاء دشمن کے فائر کی زد میں جیپ چلا رہا تھا۔ مشین گن کا برسٹ سینے اور گردن پر لگا اسی حالت میں اس شیر نے جیپ کو موڑا اور قریب دو سو گز تک چلا کر لے گیا۔ جب تک ہوش رہا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پہ رہا، جرأت، حاضر دماغی اور قوت ارادی

کی ایسی مثالیں شاذ ہیں۔

میجر محمد سلیم کا انٹرویو

سوال:۔ سلیم۔ آپ کا کالج نمبر کیا ہے۔ کالج میں کب سے کب تک رہے؟

جواب ۲۵۳۹ میں اپریل ۱۹۵۹ء میں کالج میں داخل ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء تک کالج میں رہا۔ ٹیپو سلطان ہاؤس میں۔

سوال:۔ احمد ضیاء سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟

جواب:۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ میں کالج میں اپریل ۵۹ء میں داخل ہوا تھا۔ احمد ضیاء مجھ سے بہت پہلے سے کالج میں تھے اور نمبر کے لحاظ سے بہت سینئر تھے۔ ضیاء سے میری پہلی ملاقات سی۔ ایم۔ ایچ جہلم میں بڑے ڈرامائی حالات میں ہوئی۔

سوال:۔ وہ کیسے؟

جواب:۔ اپریل ۵۹ء کے اواخر میں کالج میں آتے ہی مجھے شدید ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا اس وجہ سے مجھے سی۔ ایم۔ ایچ جہلم بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا دوسرا تیسرا دن تھا کہ ایک نرسنگ اردلی آیا اور میرے ساتھ والے بیڈ پر بستر وغیرہ لگانے لگا میں نے پوچھا کس کے لئے بستر تیار کر رہے ہو کون آرہا ہے۔ اس نے کہا آپ ہی کے کالج کا ایک لڑکا زخمی ہو کر آیا ہے۔ آپریشن تھیٹر میں اس کے ٹانکے لگ رہے ہیں۔ چونکہ اپنے کالج کے لڑکے کی بات تھی مجھے تجسس ہوا میں نے پوچھا تم نے اسے دیکھا ہے۔ اردلی نے کہا ہاں۔ میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔ ران پر بڑا گہرا زخم آیا ہے۔ ہڈی تک گوشت کٹ گیا ہے۔ چھوٹا سا لڑکا ہے۔ یہ روئیداد سن کر میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اسٹریچر پر ایک چھوٹے سے لڑکے کو لایا گیا اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ چلو شکر ہے۔ کمرے میں کوئی ساتھی تو ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی میرا خیال تھا کہ اتنا گہرا زخم ہے اتنے گہرے ٹانکے لگے ہیں یا تو وہ لڑکا بے ہوش پڑا

ہو گا یا درد سے چیخ چلا رہا ہو گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ابھی میری حیرانی کم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے بستر پر لیٹتے ہی پوچھا۔ کالج کے ہو؟ کیا نام ہے؟ پہلے تمہیں نہیں دیکھا کیا نئے داخل ہوئے ہو؟ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ آٹھویں میں داخل ہوا ہوں۔ نو یے باک لڑکا بولا۔ ٹھیک ہے۔ کلاس میں بھی ساتھ رہے گا میں بھی آٹھویں میں ہوں۔ میں نے پہلا سوال کیا تم کب داخل ہوئے تھے؟ وہ بولا یہ نہ پوچھو اور دیکھو وہ اپنے سامنے کا بٹن دبا کر کسی کو بلاؤ میں چائے پینا چاہتا ہوں۔

تو جناب یہ تھی احمد ضیاء سے میری ملاقات۔ ضیاء سے میں نے پھر پوچھا کہ چوٹ کیسے لگی؟ تو بتایا کہ کھیلتے ہوئے تارکول کے ڈرم پر گر گیا تھا۔ پھر کہنے لگا کوئی بات نہیں کھیل اور شرارتوں میں چوٹیں تو لگا ہی کرتی ہیں۔

سوال:۔ اس تمام واقعہ سے اس وقت آپ کے ذہن نے کیا تاثر قبول کیا تھا؟

جواب:۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ پر خاصا رعب پڑا تھا۔ ضیاء کی دلیری اور خوش مزاجی سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ بعد کو ضیاء کا ٹیپو ہاؤس میں اور کلاس میں ساتھ رہا۔ نہم ہی کلاس ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔

وہ تین سال جو میں نے ضیاء کے ساتھ گزارے ان کی بنیاد پر میرا تاثر یہ ہے کہ ضیاء اپنی خوش مزاجی، زندہ دلی اور دوست نوازی کی وجہ سے سارے ہاؤس میں بہت مقبول تھا۔ بڑا پیارا آدمی تھا۔ اس وقت جبکہ ضیاء کا ذکر چھڑا ہے میرا دل بھر آیا ہے اور وہی اپریل ۱۹۵۹ء والا منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل یعقوب علی ڈوگر نے ایک ملاقات میں بتایا۔

احمد ضیاء اور میں آٹھویں اور نویں جماعت میں ایک ساتھ تھے۔ ہاؤس بھی ایک عرصے تک ایک ہی رہا۔ اسکین ہاؤس (اب بابر ہاؤس) پھر ٹیپو سلطان ہاؤس، کالج میں ضیاء غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں کرنل رفیق صاحب کے

سامنے ان کی خالد کیانی سے باکسنگ۔ اس زمانے کے لوگوں کو اب بھی یاد ہوگی۔ سونیؔ ......
میں بیسٹ ڈرائیور کا اعزاز لیا تھا۔ بیسٹ جمناسٹ بھی تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۵۱ء
میں کسی انگریزی ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ اس زمانے میں کالج میں براس بینڈ بھی ہوا کرتا تھا۔
احمد ضیاء بینڈ میں تھے۔

شرارتیں بھی بہت کرتے تھے۔ خصوصاً جن میں خطرہ ہو اور ایڈونچر کا پہلو نکلتا ہو
غالباً ۵۹ء یا ۶۰ء کی بات ہے کہ ایک روز سہ پہر ہم لوگ پریپ کے لئے کلاسز کی طرف
آ رہے تھے۔ راستے میں کنٹین کے سامنے کول تار کے کئی ڈرم پڑے ہوئے تھے احمد ضیاء
نے اپنا جمنازم کا کمال دکھانے کے لئے اس کے آر پار چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ اتفاق
سے گر پڑے اور ایک ٹانگ بری طرح متاثر ہوگئی۔ لیکن ضیاء نے مسکرانا نہیں چھوڑا۔

نام بھی ضیاء تھا یعنی روشنی۔ اس کی زندگی بھی ضیاء تھی۔ روشنی کی تابندگی کی، مسکراہٹ
کی ایک شوخ لکیر۔ یہ روشنی اور مسکراہٹ کی بات میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ جن لوگوں
کو احمد ضیاء سے واسطہ پڑا تھا وہ گواہی دیں گے کہ احمد ضیاء کی شخصیت کا سب سے روشن
پہلو اس کی لازوال معصوم مسکراہٹ تھی مشکل حالات میں سدرتہ جسمانی اور ذہنی دباؤ
کے وقت بھی اس کو مسکرانا آتا تھا۔ ۶۶ میں کمیشن لیا تھا۔ ۷ بلوچ میں شامل ہوئے تھے لیکن
ان کی ایڈونچر پسند طبیعت نے انہیں ۶۹ میں ایس۔ ایس۔ جی میں شامل کر دیا۔ ایس۔ جی
کا کورس کرنے کے بعد انہیں ٹیپو کمپنی دی گئی۔ جو اس وقت ٹاپ پر تھی

ایس۔ ایس۔ جی میں ۷۱ء کے شروع میں ضیاء میرے انسٹرکٹر رہے مجھے یاد ہے کمانڈو
کورس کے درمیان منگلا سے چراٹ جاتے ہوئے وہ میرے گروپ کے ساتھ تھے۔ جو
لوگ اس کورس کی سختیوں سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ میلوں سخت ترین حالات
میں مارچ کرنے کے بعد بعض اوقات آدمی کی جسمانی اور نفسیاتی حالت کیا ہو جاتی ہے ان
حالات میں بھی احمد ضیاء نے اپنی مخصوص مسکراہٹ نہیں چھوڑی۔ بلکہ ہمیں بھی حوصلہ دلاتے

جاتے تھے۔

"میں کہتا ہوں میدان جنگ میں آدمی وہ ہوتا ہے جو وہ عام زندگی میں ہوتا ہے حوصلہ مندی اور خطر پسندی ضیاء کے کردار کی خصوصیات تھیں۔ میدان جنگ میں بھی انہوں نے انہی صفات کا مظاہرہ کیا"

میجر عارف شاہد کہتے ہیں:

میرا اور احمد ضیاء کا ایس ایس جی میں ساتھ رہا میرے ذہن میں ان کا نام آتے ہی ان کے تبسم کی تصویر ابھرتی ہے۔ میرا مطلب اس سے وہ تبسم وہ مسکرانا نہیں جو آدمی آرام سے بیٹھے ہوئے مسکراتا ہے۔ جبکہ ٹی وی پر کوئی مزاحیہ پروگرام ہو رہا ہو۔ میرا مطلب اس وقت کے مسکرانے سے ہے جب پندرہ بیس میل کراس کنٹری کرنے کے بعد مسکراتا ہے ایس ایس جی کی تربیت تو مشہور ہے اس میں ایسے مقام آتے ہیں جب بندہ اپنے آپ سے بات کرنے کا یارا نہیں رکھتا میں نے احمد ضیاء کو سخت دباؤ اور تھکن کے وقت خوش دلی سے مسکراتے اور مذاق کرتے دیکھا ہے ہم حیران ہوتے تھے کہ اس شخص کے اعصاب ضرور فولاد کے بنے ہوئے ہوں گے"

احمد ضیاء اتنا شاعرانہ، نازک نام اور دل پذیر تبسم لیکن چیتے کی سی چستی اور شیر کا حوصلہ اور دلیری۔ احمد ضیاء نے جس دلیری سے شہادت پائی اس کی تفصیل سے کم از کم مجھے تو بالکل تعجب نہیں ہوا۔ یہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب مشین گن کی گولیوں سے چھلنی ہو کر وہ گرے ہوں گے تو انہوں نے دلنواز تبسم کے ساتھ مسکرا کر فرشتے سے کہا ہو گا۔ ہیلو میں تیار ہوں۔

ایس ایس جی کے کمانڈر کا بیان

احمد ضیاء چونکہ کمانڈو تھے اور ایس ایس جی سے متعلق اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ایس ایس جی کے نامور کمانڈر بریگیڈیئر محمد حیات ایس جے (کالج نمبر ۲۸۷) سے ضیاء

کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کریں ان کا یہ جواب آیا۔

احمد ضیاء سے ایس ایس جی میں میرا کم تعلق رہا میں صرف ان کے ایس ایس جی میں انتخاب کا ذمہ دار تھا۔ اس کے فوراً بعد ترقی پر میرا تبادلہ ہوگیا۔ انٹرویو میں احمد ضیاء نے جو تاثر مجھے دیا وہ یہ تھا کہ یہ نوجوان افسر با حوصلہ ہے جرأت رکھتا ہے اور مشکل خطرناک حالات کا چیلنج قبول کرسکتا ہے۔ چنانچہ سیلکشن بورڈ نے احمد ضیاء کو ایس ایس جی میں تربیت کے لئے قبول کرلیا۔ لیکن چونکہ میں احمد ضیاء کے دونوں بڑے بھائیوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے پہلے کہ احمد ضیاء اٹھ کے جائیں میں نے مذاقاً پوچھا: احمد ضیاء تمہارے بڑے بھائی کیا ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ احمد ضیا نے قدرے حیرانی سے جواب دیا "جناب فوج میں افسر ہیں۔" حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ اسے بھی معلوم تھا کہ میں اس کے بھائیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، میں نے پھر سوال کیا ان میں سے کون بہتر افسر ہے؟

(واضح رہے کہ اس وقت احمد جمال کرنل تھے اور احمد کمال میجر اب احمد جمال لیفٹیننٹ جنرل ہیں اور احمد کمال میجر جنرل)

احمد ضیاء پھر خاموش رہا میں نے پھر سوال دہرایا تو احمد ضیاء نے جواب دیا۔

"جناب! ویسے تو دونوں بہتر ہیں لیکن یہ سوال ایک چھوٹے بھائی کے لئے بہت مشکل ہے۔ اس طرح یہ انٹرویو ختم ہوا۔ یوں احمد ضیاء کمانڈو ہو گئے مجھے بعد کو پتہ چلا کہ احمد ضیاء بہت کامیاب کمانڈو ثابت ہوئے۔

احمد ضیاء صرف کامیاب کمانڈو ہی ثابت نہیں ہوئے بلکہ کامیاب انسان بھی ثابت ہوئے اس انسان سے بڑھ کر کامیاب ہو سکتا ہے جو اللہ کی راہ میں جان دے اور اس کے پیچھے اس کے دوست، بھائی اور استاد اسے سب محبت سے یاد کریں۔

جو بندھ جائے وہ موتی!

ہاؤس ماسٹر کے تاثرات: جب احمد ضیاء کے ایک ہاؤس ماسٹر بریگیڈیر اعجاز اکبر صاحب

سے احمد ضیاء کا ذکر آیا تو انہوں نے ان تاثرات کا اظہار کیا۔

ملٹری کالج جہلم میں، میں بحیثیت کیپٹن ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء تک رہا۔ اس دوران ہاؤس ماسٹر بھی رہا۔ پڑھانا تو خیر روز کا مشغلہ تھا۔ اس طویل عرصے میں میرا واسطہ سینکڑوں طلبا سے پڑا۔ ان میں سے جن کی یاد آج تک اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میرے ذہن میں تر و تازہ ہے ان میں ایک احمد ضیاء شہید بھی ہے۔

یہ تاثر اس کے مخصوص کردار کی وجہ سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت اچھا اسپورٹس مین تیراک، باکسر بہت کچھ تھا۔ لیکن مجھے اس کی جو ادا پسند تھی وہ یہ تھی کہ شرارتوں سے باز نہ آتا غلطی بھی کرتا لیکن شرارت کرتے۔ غلطی کرتے ہوئے اس نے بزدلوں کا رویہ کبھی اختیار نہیں کیا کہ چھپتا پھرے بہانے کرے یا جھوٹ بولے۔ اس میں یہ جرأت تھی کہ شرارت کرکے سامنے آئے غلطی کا اعتراف کرے اور جب سزا ملے تو خوش دلی اور حوصلے سے برداشت کرے۔

میرا دوسرا تاثر اس کی خوش مزاجی ہے اس کے چہرے پر ایک طرح کی تازگی اور شگفتگی رہتی تھی۔ ہر وقت مسکراتا سا رہتا۔ پڑھنے سے دلچسپی واجبی سی تھی۔ اس لئے اس سلسلے میں بھی سرزنش ہوتی تھی۔ لیکن اس نے بدمزاجی کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا۔

اپنے ہم جماعتوں میں مقبول بھی بہت تھا یہ بھی اس کی خوش مزاجی اور بنیادی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے تھا۔

احمد ضیاء کے کیریر پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے ہم استادوں کو بھی ایک لمحہ کے لئے سوچنا چاہیئے کہ طلبہ کو تولنے کے صحیح بٹے کیا ہیں؟ کن بچوں کو اچھا کہیں؟ کیا صرف امتحانات میں اچھے نمبر لینے والا لڑکا ہی اچھا ہے؟ یا ہم بچے کے بنیادی رویوں اور قدروں کو بھی دیکھیں کیا سچے کھرے دلیر اور جرأت مند لڑکے زندگی کے اصل میدان میں زیادہ کامیاب نہیں ہوتے؟ شہادت کامیابی کی سب سے عظیم صورت نہیں تو کیا ہے؟

میجر عظمت حیات خان ملک شہید

آرٹلری

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ——————— ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

جائے پیدائش ——————— پیڑہ فتحال (اٹک)

کمیشن ——————— ۳۶ پی ایم اے

تاریخ شہادت ——————— ۸ ر دسمبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ——————— ۲۵ ر سال

مقام شہادت ——————— کھلنا مشرقی پاکستان

مدفن ——————— کھلنا مشرقی پاکستان

میجر عظمت حیات خان ملک شہید

نومبر ۱۹۷۱ء کے آواخر میں مشرقی پاکستان بھارت کی جارحانہ یلغار کی زد میں تھا۔ پاکستانی مجاہدین ہزار مشکلوں اور مصائب میں گھرے وطن عزیز کے چپے چپے کے دفاع کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ جلیسور کے محاذ پر میجر عظمت حیات ۲۲ ایف ایف کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے کہ انہیں ٹیلی فون پر ایک خوش کن اطلاع ملی۔ پہلے بیٹے کی اطلاع اسے سنتے ہی عظمت حیات نے کہا:۔

"اب کوئی فکر نہیں ایک مجاہد اور چھوڑے جا رہا ہوں جو ہندو کے ساتھ جنگ جاری رکھیگا"

یہ ۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے چھ دن بعد وہ اسی محاذ پر ہندو سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے لیکن ہندو سے جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی اور عظمت حیات پیدا ہوتے رہیں گے"

خاندانی پس منظر

تحصیل تلہ گنگ ضلع اٹک میں ایک گاؤں ہے موضع پیڑہ فتحال (یعنی ملک فتح خان کا پیڑہ) جو فوجی جوانوں، سرداروں اور افسروں کے لئے مشہور ہے یہاں ملک ذات کے ایک ہوشیار اور روشن دماغ سردار تھے۔ ملک غلام عباس خان جو اے ایس سی میں صوبیدار میجر

اور آنریری لیفٹیننٹ کے عہدے سے نومبر ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوئے ان کے چار بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے ملک عظمت حیات تھے۔

آنریری لیفٹیننٹ غلام عباس خان نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک اور ایس ایل سی کے امتحانات پاس کئے تھے انہیں ۲۲۰ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی اس میں بیس روپے جنگی انعام کے بھی شامل تھے ملک غلام عباس خان غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے خود بھی پڑھے لکھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تعلیم و تربیت کے مقاصد کا واضح شعور رکھتے تھے انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو انتقال کیا۔

پیدائش

ان ملک غلام عباس خان کے یہاں پٹڑہ فتحال میں میجر ملک عظمت حیات خان پیدا ہوئے۔ اگست کی چودہ تاریخ تھی اور سن چھیالیس۔ ٹھیک سال بھر میں مسلمانوں کا وہ پاک وطن وجود میں آنا تھا۔ جس کے لئے ۲۵ سال بعد عظمت حیات کو اپنی جان قربان کرنا تھی۔

خدوخال

عظمت حیات قد کاٹھ کے مضبوط اور بلند و بالا تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرہ کتابی ناک ستواں اور آنکھیں عقابی تھیں ان کے تمام چہرے میں ان کی تیز روشن آنکھیں نمایاں نظر آتی تھیں۔

ابتدائی تعلیم

جب وہ سکول جانے کے قابل ہوئے تو ان کے والد لاہور میں تعینات تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم لاہور میں شروع ہوئی۔ لاہور میں انہوں نے پی اے ایف سکول لاہور کینٹ اور اسلامیہ

ہائی سکول لاہور کینٹ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن ساتویں کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول تلہ گنگ سے مارچ ۱۹۵۸ء میں پاس کیا اور اسی سال ۱۱ اپریل ۱۹۵۸ء مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ملٹری کالج جہلم میں ساتویں درجے ہی میں داخل ہوئے۔ ان کا کالج نمبر ۲۴۸۰ تھا اور وہ پہلا ہاؤس جس میں وہ داخل ہوئے برڈووڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) تھا۔ داخلے کے وقت ان کا قد ۴ فٹ ۹ ۱ انچ تھا اور وزن ۸۰ پونڈ اور عمر بارہ برس سے چند مہینے کم۔

والد کی رائے

ملٹری کالج میں داخلے کے وقت میجر عظمت حیات خان ملک کے والد گرامی نے کالج کے ایک سوال نامے کے جواب میں میجر عظمت شہید کے بارے میں کچھ مفید معلومات بھی مہیا کی تھیں اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات بھی قلم بند کئے تھے ان کا تذکرہ خالی از دلچسپ نہ ہو گا۔

ایک سوال نصابی مضامین میں دلچسپی سے متعلق تھا اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ انگریزی اور ریاضی ان کے پسندیدہ مضامین ہیں۔ اخبارات اور رسالوں کے مطالعہ کے بارے میں بتایا کہ اس عمر تک ان سے کوئی خاص واسطہ نہیں پڑا۔ البتہ ریڈیو پروگرام دلچسپی سے سنتا ہے۔ کھیلوں میں ہاکی اور کرکٹ کا شوق ہے۔ ہابی کے بارے میں یہ کہ کوئی خاص اختیار تو نہیں کی لیکن آرٹ اور ڈرائنگ کی طرف رجحان ہے ایک سوال تنہائی پسند یا مجلسی ہونے کے بارے میں تھا اس کا جواب تھا "مجلسی، باتونی اور تیز طرار" اس کے علاوہ غلام عباس خان صاحب نے اپنے بارہ سالہ بیٹے کے بارے میں جو باتیں لکھیں وہ یہ تھیں "فلم دیکھنے کا شوق" طبیعت کا تند و تیز ہے۔ پڑھنے کی ترغیب دینی پڑتی ہے۔ سیر سپاٹے کا شائق ہے۔ گھر میں نہیں ٹکتا۔ کبھی کبھی بہن بھائیوں سے جھگڑا بھی ہو جاتا ہے لیکن دل کا کھرا ہے۔ بیباک ہے۔

غلام عباس صاحب یقیناً بڑی سوچ سمجھ کے آدمی تھے جس طرح انہوں نے اپنے بیٹے

کا مطالعہ کیا تھا کم کرتا ہے۔ انہوں نے اس کی قلمی جو تصویر کھینچی وہ یہ ہے۔
سختی سے ڈر جاتا ہے اس لئے میں نے کبھی اسے سخت سست نہیں کہا کبھی مارا
نہیں۔ ذہین ہے۔ البتہ محنت کی عادت نہیں۔ ذہانت کی وجہ سے حساب اچھا ہے لیکن
چونکہ جم کر بیٹھ کر کام کرنے کی عادت نہیں اس لئے تاریخ اور جغرافیہ میں کمزور ہے۔ آخر میں
انہوں نے لکھا "بہت خوش مزاج بھی ہے"۔

ملٹری کالج میں عظمت کی کارکردگی

اپریل ۱۹۵۹ء میں عظمت کا ساتویں درجے کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اسپورٹس افسر بھی ان
کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس زمانے میں برڈووڈ ہاؤس (حال ایم جی ہاؤس) کے ہاؤس
ماسٹر پروفیسر عین الدین علوی نے سالانہ رپورٹ (۱۹۵۹ء) میں لکھا۔
"عظمت خاصا ذہین اور پُرجوش ہے لیکن کبھی کبھی تند مزاجی سے کام لیتا ہے۔ لیکن
عموماً اس کا رویہ اچھا رہتا ہے کھرا اور سچا ہے"
صلاحیت رکھتا ہے۔ پُرجوش ہے" اور دوسرے سال علوی صاحب نے لکھا۔ سماجی
تعلقات میں پختگی آ گئی ہے۔ سمجھدار ہے" اور مشورہ دیا کہ ڈراموں اور تقریروں میں حصہ لینا چاہیئے۔
۶۱-۱۹۶۰ء میں عظمت اورنگ زیب ہاؤس میں چلے گئے تھے اس سال کی رپورٹ میں
مسٹر فضل حق حیدری نے اس خیال کا اظہار کیا۔
صلاحیتیں بہت اچھی ہیں لیکن ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا گو طبیعت تند و تیز
ہے لیکن قیادت کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے"
جولائی ۱۹۶۲ء میں عظمت حیات نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔
۶۲۳ نمبر تھے۔ فرسٹ ایئر میں انہوں نے ایف ایس سی پری انجینئرنگ کے مضامین لئے
ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سائنس کے مضامین میں کمزور تھے لیکن کوشش کر کے ۱۹۶۴ء

میں ایف ایس سی میں ۵۲۲ نمبر لے کر سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ لیکن ۳۶ پی۔ایم۔اے لانگ کورس کے لئے کچھ عرصے کے بعد منتخب ہوئے۔

ملٹری کالج میں عظمت حیات نے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک ۶ سال گذارے ساتویں درجے میں داخل ہوئے تھے اور ایف ایس سی کر کے کالج کو خیر باد کہا۔ ان کے تعلیمی ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اوسط درجے کے طالب علم تھے گو کسی دائرے میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں کیا لیکن متاثر انہوں نے ہر استاد کو کیا۔ ان کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں۔ خصوصاً قیادت کے اجزائے ترکیبی۔ تندی و توانائی، جوش و ولولہ ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے ان کی سمجھ اور دیانت داری کا تذکرہ علوی صاحب ایسے صاحب نظر ہاؤس ماسٹر نے کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ ملٹری کالج کے قیام تک عظمت کی ذہنی و شخصی صلاحیتوں کا کوئی پورا اظہار نہیں ہوا تھا لیکن قیادت کے جوہر ضرور نظر آنے لگے تھے۔

کالج سے کاکول تک کی کہانی

قطرے پر گہر ہونے تک بہت کچھ بیتی ہے۔ عظمت بھی ملٹری کالج سے فارغ ہونے سے کاکول جانے تک کے عرصے میں بہت سی کٹھن منزلوں سے گزرے یوں کہنا چاہیئے کہ زمانے کی بھٹی میں بہت تپے تب جا کے کندن ہوئے۔

اس دور کے حالات، واقعات کی تفصیل کے لئے ہم نے صوبیدار اکبر خان صاحب سے رجوع کیا تو ان سے گفتگو ہوئی۔

سوال:۔ اکبر صاحب، آپ کا عظمت سے کیا رشتہ تھا؟

جواب:۔ اگر صرف رشتے کو دیکھا جائے تو عظمت میرے چچازاد بھائی تھے۔ لیکن ہمارے تعلقات رسمی نہیں گہرے تھے۔ لاہور میں وہ ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔

سوال:۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ عظمت کی زندگی کے کالج سے جانے کے بعد کے

واقعات وحالات پر روشنی ڈالیں۔

جواب:۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ عظمت کے والد آنریری کیپٹن ملک غلام عباس کا انتقال عظمت کے کالج میں ہوتے ہوئے ہی ہو گیا تھا۔ ان کی وفات سے جو مسائل پیدا ہوئے ان کا اثر عظمت پر بھی پڑا۔ بہر حال جیسے تیسے انہوں نے کالج کی تعلیم کو پورا کیا اور آئی ایس ایس بی کے سامنے پیش ہوئے لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ لیکن اس ناکامی کو عظمت نے بہت شدت سے محسوس کیا۔ بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے سارے گھر بار، ماں، بہن، بھائیوں کی ذمہ داریاں ان ہی کے سر آن پڑی تھیں۔ وہ جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں تاکہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں لیکن پانسہ پلٹ جانے سے عظمت کی زندگی کے تاریک ترین دور کا آغاز ہوا۔ جس میں ہر قدم پر مایوس اور نئی آزمائشیں ان کا راستہ روکے کھڑی تھیں لیکن عظمت نے ہمت نہیں ہاری اور تاریک دنوں کو اپنی محنت عزم اور خودداری سے آخر کار کامیابی کی روشن صبح سے بدل دیا۔

سوال:۔ کیسے؟ ان واقعات کی تفصیل فرمائیے؟

جواب:۔ تفصیل یہ ہے کہ آئی ایس ایس بی سے ناکام ہونے کے بعد انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ایک قریبی رشتے دار کے تعاون سے انہوں نے تھرڈ ائر میں داخلہ لے لیا لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان رشتے دار صاحب نے ان سے منہ پھیر لیا اور عظمت کو تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔

سوال:۔ ان رشتے دار کے اس طرح برگشتہ ہو جانے کی کوئی وجہ تو ہو گی؟

جواب:۔ عظمت ہمیشہ کے منہ پھٹ تھے جو دل میں ہوتا بغیر کسی کی رعایت کے مصلحت کا لحاظ کیے بغیر کہہ ڈالتے تھے جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ کسی خاندانی تنازعہ پر عظمت نے موقع محل کا خیال کیے بغیر اس مسئلہ پر اس طرح رائے زنی کی جو ان صاحب کے مفاد کے خلاف

تھی یا انہیں وہ بات پسند نہیں تھی اس طرح وہ برگشتہ ہو گئے اور عظمت کو اپنی تعلیم سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بے باکی اور خودداری عظمت کی طبیعت کا خاصہ تھی اس کی وجہ سے انہیں ایک نہیں کئی بار نقصان اٹھانا پڑا۔

فیصل آباد سے عظمت لاہور آ گئے یہاں ایک اور رشتہ دار نے ان کی سرپرستی کرنا چاہی کچھ دنوں عظمت ان کے ہاں رہے بھی لیکن ان سے بھی زیادہ دیر تک ان کا نباہ نہیں ہو سکا چنانچہ اس گھر کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا اور تنہا بے یار و مددگار اپنا راستہ نکالنے کی جدوجہد کرنے لگے۔

سوال:۔ ان کے گھر کو خیر باد کہنے کی کیا وجہ تھی؟

جواب:۔ وہی جو پہلے تھی اپنی انا کا شدید احساس خودداری اور خطرناک حد تک منہ پھٹ ہوتا۔ یہ دن عظمت کی زندگی کے تاریک ترین اور ایک لحاظ سے روشن ترین تھے۔

سوال وہ کیسے؟

جواب تاریک ترین مادّی اعتبار سے کہ عظمت ان دنوں زور بازو سے کماتے تھے ان کو آرام کیلئے کسی گھر کی چھت بھی میسر نہیں تھی روشن ترین اس لئے کہ اس مرد غیور نے اپنے اور غیروں کے سارے سہاروں کو اپنی خوشی سے چھوڑ کر اپنی ٹھوکر سے اپنا راستہ پیدا کرنے اور اپنے زور بازو سے اپنا پیٹ بھرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ایسے پر عزم اور غیرتمند نوجوان روز روز دیکھنے میں نہیں آتے۔ آدمی کے اچھے بُرے کا پتہ دولت کی فراوانی میں نہیں تنگدستی کے دنوں میں چلتا ہے ان دنوں میں خود مجھے پتہ چلا کہ یہ لڑکا تو سراسر کھرا سونا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد خدا نے ان کی جلد ہی سن لی پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے ایک اچھے عہدے کے لئے انہوں نے مقابلہ کا امتحان دیا۔ انٹرویو اور بھی اچھا ہوا چنانچہ ٹوبیکو کمپنی میں ملازم ہونے گئے۔ اچھی جگہ تھی۔ اس عرصے میں کمیشن کے لئے دوبارہ امتحان دے رکھا تھا اس میں بھی کامیاب ہوئے لیکن ان کو اطلاع نہ ہو سکی طبی معائنے کے

لئے جن رشتے دار کے پتے پر سرکاری چھٹی آئی تھی وہ خدا بھلا کرے ان کا انہوں نے غائب کر دی۔ اتفاق سے ایک روز عظمت کو کالج کا ایک ہم سبق بس میں آتے جاتے مل گیا اس نے بتایا تم تحریری امتحان میں پاس ہو چکے ہو دوسرے لڑکوں کا میڈیکل بھی ہو چکا۔ تمہارا نام سی۔ ایم۔ ایچ لاہور کی فہرست میں بھی تھا تم گئے کیوں نہیں؟

سوال حیرت کی بات ہے۔

جواب وہ کلاس فیلو عظمت کے حق میں رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا اس روز وہ نہ ملتا تو وہ میڈیکل کے لئے نہ جا پاتے اور کمیشن نہ ملتا۔ لیکن ان کو تو کمیشن لے کر شہید ہونا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں جو موقعہ نکلا جا رہا تھا قدرت نے اسے نکلنے نہیں دیا۔ چنانچہ عظمت دوسرے روز سی ایم ایچ پہنچے بغیر سرکاری خط کے معائنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ خدا نے کمانڈنگ افسر کے دل میں نیکی ڈال دی اور اس طرح کمیشن کی طرف ایک اور قدم بڑھ سکا آئی ایس ایس بی سے منتخب ہو کر عظمت لانگ کورس کے لئے اکتوبر ۱۹۶۴ء میں پی ایم اے پہنچے ۱۹۶۵ء کی وجہ سے ان کا کورس مختصر کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں عظمت نے آرٹلری میں کمیشن لیا۔

کمیشن کے بعد

میجر عظمت حیات نے مئی ۱۹۶۶ء میں ۳۶ پی ایم اے لانگ کورس میں کمیشن حاصل کیا اور ۲۶ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں تعینات ہوئے مختلف آرمی کورسز کے بعد ۵۰ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں مظفر آباد رہے اور پھر وہاں سے رجمنٹ کے ساتھ کھاریاں پہنچے۔ وہیں ۹ ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل ملک محمد نواز کے اے ڈی سی مقرر ہوئے اور ان کے بعد میجر جنرل شوکت رضا کے اے ڈی سی بھی رہے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہیں میجر کے عہدے پر ترقی پائی۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے حالات بگڑنے لگے تھے اور مہیب خطرے

افق پر منڈلا رہے تھے خود سلامتی کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے بے اوسی کے ساتھ واپس آ جاتے لیکن عظمت نے اس پر آشوب زمانے میں وہاں ٹھہرنا ہی ضروری سمجھا اور اپنے جے اوسی سے درخواست کی کہ انہیں کسی فیلڈ رجمنٹ کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ ۵۵ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں ایک بیٹری کی کمان ان کے سپرد کر دی گئی۔

شروع میں وہ پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کو سپورٹ دے رہے تھے جو آخر انڈین آرمی کے گھیرے میں آ گئی اس صورت حال سے نمٹنے کیلئے بٹالین کو حکم ملا کہ انڈین گھیرے کو توڑ کر باہر نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اس موقعہ پر بٹالین کمانڈر کو ایک مشکل اور تکلیف دہ فیصلہ کرنا تھا کہ یونٹ کے بھاری اسلحہ اور ٹرانسپورٹ کو دشمن کے ہاتھوں میں جانے سے بچانے کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کر دیا جائے۔ اس نازک موقع پر میجر عظمت حیات نے خود کو والنٹیر کیا کہ میں گاڑیوں اور بھاری اسلحہ کو بچانے کی کوشش کروں گا گو بارودی سرنگیں آس پاس بچھی ہوئی تھیں لیکن عظمت کمال جرأت اور ہوشیاری سے اپنے کنوائے کو بحفاظت نکال لائے اس کارنامے کے بعد عظمت کو ۲۲ ایف ایف آر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ جو جیسور سے کھلنا کی طرف ایک بریگیڈ کے انخلاء کو حفاظتی مدد دے رہی تھی۔

میجر عظمت حیات آرٹلری کی ۲۰۱ فیلڈ بیٹری کے کمانڈر تھے ان کی بیٹری ۲۲ ایف ایف آر کو سپورٹ دے رہی تھی۔ سقوط جیسور کے بعد دشمن کے شدید دباؤ کی وجہ سے ایف ایف آر کی اس بٹالین نے پیچھے ہٹ کر درمیانی دفاعی پوزیشن لے لی۔ آخر وقت تک عظمت حیات اپنی بیٹری کے ساتھ اسی یونٹ کے لئے سینہ سپر تھے۔

۸ دسمبر ۷۱ء کو دشمن نے ٹینکوں کی مدد سے ۲۲ ایف ایف آر کی پوزیشن پر پوری قوت سے طوفانی حملہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بٹالین کے کھلنا جانے کا راستہ کاٹ کر بٹالین کو پورے طور پر تباہ کر دیا جائے بڑا نازک لمحہ تھا۔ عظمت کی بیٹری کی کارکردگی پر بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اس موقعہ پر عظمت کے اندر کا شیر پھر ایک بار بپھر گیا۔ عظمت نے مثالی دلیری اور

تدبیر سے کام لے کر اپنی بیٹری کے حملوں سے دشمن کو الجھائے رکھا دشمن کے پے در پے حملوں کو کند کیا تاکہ بٹالین کو بچایا جا سکے اپنے منصوبے میں ناکام ہو کر آخر کار دشمن نے تازہ دم دستوں اور ٹینکوں سے کام لے کر ایک بار پھر بھرپور حملہ کیا اور دشمن بٹالین کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اب وہ پوری طرح دشمن کے نرغے میں تھے۔ اس حالت میں بھی عظمت نے "آخری گولی اور آخری آدمی" کے اصول پر مقابلہ جاری رکھا تا آنکہ ایک ٹینک کے براہِ راست حملہ سے عظمت حیات شہید ہو گئے اس طرح اور ان حالات میں کہ ۲۲ ایف ایف آر کے کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ کمانڈر اور جی او سی نے عظمت حیات کیلئے نشانِ حیدر کے اعزاز کی سفارش کی۔ لیکن

صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ

شہادت کے وقت شہید کی عمر ۲۵ سال اور چند مہینے تھی۔ گویا عین عالم جوانی میں ملک و قوم پر قربان ہو گئے۔

ایک چشم دید گواہ صوبیدار محمد صادق کا بیان

سوال آپ میجر حیات کی بیٹری میں ان کے ساتھ رہے ہیں، آپ سے زیادہ ان کو، اور ان کے کارناموں کو کون جانتا ہو گا؟

جواب جی ہاں ۵۵ / ۲۰ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں وہ میرے بیٹری کمانڈر تھے میں اس وقت نائب صوبیدار تھا۔ مئی ۱۹۷۱ء میں آکر انہوں نے ہماری بیٹری کی کمان سنبھالی۔ اس سے پہلے وہ جی او سی، جنرل شوکت رضا کے اے ڈی سی تھے۔ وہیں سے میجر بن کر ہمارے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں ہماری بیٹری چواڈنگا تھی۔

سوال چواڈنگا کہاں ہے؟

جواب چواڈنگا جیسور سیکٹر میں ہے۔ اس وقت ہماری بیٹری ۱۸ پنجاب کو سپورٹ دے رہی

تھی۔ اس بٹالین کا پچھلا ہیڈ کوارٹر چواڈنگا میں تھا اور اس کی ایک کمپنی میرپور میں اور ایک درشنا میں متعین تھی اس زمانے میں اس علاقے سے مکتی باہنی کے پردے میں ہندوستانی فوج کبھی چھپ کے اور کبھی سامنے آکے اپنی کارروائی کررہی تھی۔ میرپور پوسٹ بالکل بارڈر پر واقع ہے یہ پوسٹ خاص طور پر دشمن کی توجہ کا مرکز تھی۔ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو دشمن نے راتوں رات اس پر قبضہ کرلیا اس سرحدی چوکی کی جنگی اہمیت کی وجہ سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں فیصلہ کیا گیا کہ اس چوکی کو دشمن سے چھڑایا جائے۔ چنانچہ چواڈنگا میں بٹالین ہیڈ کوارٹر میں میجر عظمت صاحب نے بٹالین کے کمان افسر کے ساتھ صلاح ومشورہ کیا اور چوکی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بیٹری کے آبزرور (دیدبان) کیپٹن امجد تھے۔ لیکن میجر صاحب نے خود یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا اور دشمن کے بہت قریب جاکر دیدبانی کی۔ ایک اونچے درخت پر چڑھ کر اتنا مؤثر فائر کرایا کہ دشمن کی پوزیشن کے پرخچے اڑ گئے اور وہ بھاگنے پر مجبور ہوگیا جب اس جگہ انفنٹری پہنچی تو پوسٹ بالکل خالی تھا۔ دشمن ایسی افراتفری میں بھاگا کہ اپنا سازوسامان بھی چھوڑ گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے میجر عظمت کی جرأت اور ہمت کو دیکھا۔ بیٹری کمانڈر کی حیثیت سے انہیں بٹالین ہیڈ کوارٹر میں ہونا چاہیئے تھا دیدبانی کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ لیکن ان کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ دشمن کے مورچوں کے انتہائی قریب جاکر دیدبانی کرتے تھے اور دشمن پر براہ راست فائر کراتے تھے۔ میرپور پوسٹ کو خالی کرانے کے بعد ہماری بیٹری جبسور واپس آگئی اور میجر عظمت صاحب مارشل لاء ہیڈ کوارٹر چلے گئے اور چند مہینے ادھر ہی ڈیوٹی دیتے رہے۔ مشرقی پاکستان میں ۱۲ر نومبر سے کھلم کھلا بڑے پیمانے پر لڑائی شروع ہوگئی تھی۔

عظمت صاحب ۲۰ر نومبر ۷۱ء کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے واپس آئے اور اپنی ۲۰/۵۵ بیٹری کی دوبارہ کمان سنبھالی۔

سوال:۔ اس وقت بیٹری کہاں تھی؟

جواب:۔ ان دنوں ہماری بیٹری چوا گا چھا میں تھی جو جیسور سیکٹر میں ہے سخت جنگ جاری تھی میں ایس جے سی او، گن پوزیشن افسر تھا اور ہم ۶ پنجاب رجمنٹ کو سپورٹ دے رہے تھے عظمت صاحب نے آتے ہی بیٹری کے دو حصے کئے چار گنیں بٹالین ہیڈکوارٹر سے پیچھے جمائیں اور دو گنوں کو ہیڈکوارٹر سے کوئی چار سو گز آگے لے گئے۔ کبھی ان سے فائر کراتے تھے اور کبھی ان سے تاکہ دشمن کو گنوں کی صحیح پوزیشن کا پتہ نہ لگے۔ یہ بھی ان کی تدبیر کاری تھی۔

شخصیت

میجر عظمت حیات کی شخصیت کے بارے میں ان کے چچازاد بھائی میجر محمد اعظم خان لکھتے ہیں۔

عظمت سعادت مند اور خدمت گزار تھے۔ ۱۹۶۰ء میں اپنے والد ملک غلام عباس خان کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی اور نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس کچی عمر میں بھی وہ ذمہ داری کی باتیں اور ذمہ داری کے کام کرتے تھے۔ کمیشن کے بعد تو اپنی والدہ اور بھائیوں کا بہت ہی خیال کرتے تھے ذمہ داری خدمت اور قربانی کا یہ جذبہ فرائض منصبی کی ادائیگی میں بھی روا رکھتے تھے یہی جذبہ ان کی شہادت کا محرک بنا ملک وملت کے ساتھ اور پاکستان کے نظریئے کے ساتھ جو انہیں تعلق تھا اس کا اظہار اس تاریخی فقرے سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲ر دسمبر کو اپنے بیٹے کی پیدائش کی خبر ملنے پر کہا۔

اب کوئی فکر نہیں! ایک مجاہد اور چھوڑے جا رہا ہوں جو ہندو کے ساتھ جنگ جاری رکھے گا۔

میجر اعظم خان مزید لکھتے ہیں۔

عظمت شہید میرے چچازاد بھائی بھی تھے اور میری بیوی کے سگے بھائی بھی لہذا

ملٹری کالج کے دوران چھٹیوں میں میرے پاس ہی آیا کرتے تھے تاکہ پڑھائی ٹھیک ہو سکے جو گاؤں کے ماحول میں نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بہت ہی خوش طبع مرنجامرنج قسم کی ان کی شخصیت تھی جس کے یوں اچانک ایک دم چلے جانے کا ابھی تک یقین نہیں آتا۔ جب کبھی ذکر چھڑ جائے تو اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ محفل میں اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں اور تمام لطیف شرارتوں کے ساتھ موجود ہیں بہت ہی نڈر اور بیباک تھے۔ اس وقت بھی چھوٹے چھوٹے خطرات مول لے لیا کرتے تھے کچھ مہم جو قسم کے تھے بہت جفاکس اور سخت جان بھی نہایت سادہ عادات تھیں۔ غالباً سب سے اعلیٰ صفت ان کا خلوص اور دوستی کی اقدار تھیں۔ میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے خطرے مول لینے پر انہیں ٹوکا کرتا تھا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ یہی چھوٹے چھوٹے واقعات بہت بڑے بڑے مقابلوں کی تیاری ہیں خدا کرے ملٹری کالج ایسے کئی عظمت پیدا کرے۔

بریگیڈیر عطا محمد خان ملک ستارۂ امتیاز کا بیان

جب وسط ۷۱ء میں عظمت کے جی او سی جن کے وہ اے ڈی سی تھے مشرقی پاکستان سے واپس آنے لگے تو عظمت نے ان سے درخواست کی انہیں کسی فیلڈ رجمنٹ کے ساتھ ایسٹ پاکستان ہی میں تعینات کر دیا جائے تاکہ انہیں دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ انہیں جیسور سیکٹر میں ایک فیلڈ بیٹری کی کمان دے دی گئی۔ اس حیثیت میں انہوں نے باغیوں کی سرکوبی کی کارروائیوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اوائل دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب بھارت نے ایسٹ پاکستان پر بھرپور حملہ کیا تو ان کی بیٹری کے سپرد جیسور کے دفاع کا کام ہوا۔ شروع میں وہ پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کو مدد دے رہے تھے۔ جب بھارتی فوجوں نے اس بٹالین کو دو حصوں میں کاٹ دیا اور اس کو گھیرے میں لے لیا تو یہ حکم دیا گیا کہ بھاری توپوں اور گاڑیوں کو تباہ کر کے بھارتی گھیرے سے نکالا جائے۔

اس موقعہ پر میجر عظمت حیات نے کمال جرأت سے اپنے آپ کو والنٹیر کیا کہ میں بیڑی اور گاڑیوں کو نکالوں گا۔ چنانچہ وہ بارودی سرنگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بیڑی اور گاڑیوں کو بچا لائے۔ اس کارنامے کے بعد انہیں ایف ایف آر کی ایک بٹالین کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا جو جیسور سے کھلنا کی طرف ایک بریگیڈ کے انخلا کو تحفظ دے رہی تھی یہ بٹالین ہندوستانی ٹینکوں کی زبردست یلغار کی زد میں تھی عظمت بحیثیت ایف او دشمن پر فائر کروا رہے تھے کہ ایک گولے کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔

بریگیڈیر عطا محمد خان ستارۂ امتیاز عظمت حیات کے بارے میں آخر میں لکھتے ہیں۔

بحیثیت انسان کے نوجوان عظمت میں دل و دماغ کے بعض نادر اوصاف یکجا ہو گئے تھے وہ فرض شناس تھے اور سعادت مند بھی۔

صوبیدار محمد اکبر کا انٹرویو

سوال اکبر صاحب کمیشن لینے سے پہلے عظمت نے بہت مشکل دن دیکھے تھے ان کے بھی بڑے بڑے مہربان تھے یہ فرمایئے کہ کمیشن کے بعد اپنے ان کرم فرماؤں سے ان کا کیا رویہ تھا؟

جواب کمیشن کے بعد ظاہر ہے کہ ان کے دن پھر گئے تھے اور وہ لوگ جنہوں نے ان کے راستے میں روڑے اٹکائے تھے شرمندہ ہوئے لیکن عظمت نے اپنے دل میں کسی کے لئے کدورت نہیں رکھی۔ ہر تلخی کو بھلا دیا۔ کمیشن کے بعد جو پہلا تاثر کوئی آدمی ان کی شخصیت سے لیتا تھا وہ بے فکری اور خوش دلی کا تھا۔ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہنسی مذاق کا دلدادہ بظاہر یہ لاپروا انسان ایک عرصے تک آزمائشوں اور مشکلوں کا شکار رہا۔

عظمت جس طرح ہمارے ہاں کمیشن سے پہلے آتے تھے کمیشن کے بعد بھی آتے رہے۔ میس میں کبھی نہیں ٹھہرے اور یہی ایک اچھی جگہ تھی۔ جہاں وہ زیادہ آرام اور زیادہ ٹھاٹھ سے رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے مجھ جے۔ سی۔ او کے یہاں رہنے کو ترجیح دی جب

کبھی آتے میرے گھر میں گویا رونق آجاتی۔ ہر ایک سے ہنسنا بولنا۔ مذاق کرنا، مزاحیہ فقرے چست کرنا عظمت کی عادت تھی۔ سنجیدہ رہنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ایک ہی چیز کے بارے میں سنجیدہ تھے اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھے اور وہ چیز عزت اور خودداری تھی۔

سوال آپ کی اور ان کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

جواب مشرقی پاکستان جاتے ہوئے آخری رات عظمت نے ہمارے یہاں لاہور میں گزاری۔ رات گئے تک حسب معمول اپنی مزاحیہ باتوں سے محظوظ کرتے رہے۔

سوال جاتے وقت سرراہے بھی کوئی ایسی کہی جس سے ان کے دل کے نہاں خانہ کے احساسات کا پتہ چلتا ہو۔

جواب جب رات ہونے لگی تو میں تو اٹھ آیا تھا بعد کو انہوں نے بڑے بیٹے سے چلتے چلتے ایک ایسی بات ضرور کہی جو اس وقت ذرا کھٹکی تھی۔

سوال کیا؟

جواب یہ کہ زندگی رہی تو ملیں گے یا شاید نہ ہی ملیں پھر ہنس کر کہا یار، ہم تو جنگ کا کھاجا ہیں ہمارے بغیر جنگ کیسے چمکی گی۔

عظمت دوستوں کی نظر میں

میجر غلام علی لکھتے ہیں۔

میں اپریل ۱۹۵۸ء میں عظمت کے ساتھ ہی ملٹری کالج میں داخل ہوا تھا۔ شروع کے چھ دن اسکین ہاؤس (اب بابر ہاؤس) میں ہم نے ایک ہی ڈارم میٹری میں گزارے پھر پی ایم اے میں ساتھ تھا۔ نوشہرہ میں آرٹلری کا کورس ساتھ کیا کوئٹہ میں بھی ایک کورس کے دوران رفاقت رہی۔ اس تمام تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ عظمت میں دو خصوصیتیں

نمایاں تھیں۔

ایک سخت ترین حالات میں موڈ کو شگفتہ رکھنا۔ اور جا و بلکہ بے جا بھی) مذاق کئے جانا (کوئٹے میں کورس کرتے ہوئے وہ شرارتوں سے باز نہیں آتے تھے) دوسری خصوصیت جو پہلی کی ضد تھی۔ یہ تھی کہ وہ بعض معاملات میں بے حد سنجیدہ تھے خصوصاً ذمہ داری کے معاملے میں۔

کمیشن کے بعد عظمت ۲۶ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری سے وابستہ ہوئے تھے اس رجمنٹ میں میں ۴۹ پہاڑی رجمنٹ آرٹلری کے میجر محمد رفیق نے دو سال ان کی رفاقت میں کام کیا۔ ہم نے عظمت کے سلسلے میں میجر رفیق سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

"عظمت اپنے دوستوں کے دائرے میں اے ایچ کے، کے نام سے معروف تھے۔ اے ایچ کے، کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ حددرجہ خوش مزاج اور پرظرافت انسان تھے۔ ۲۶ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری کے افسر اور جوان ان کی زندہ دلی کو کبھی نہیں بھول سکتے۔"

اے ایچ کے، کے متعلق چند واقعات اور مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

"پی ایم اے میری پہلی پوسٹنگ ۲۶ فیلڈ رجمنٹ میں ہوئی تھی جو اس وقت سیالکوٹ میں میں مقیم تھی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۶۶ء کو میں سیالکوٹ پہنچا اور سیدھا وہاں پہنچا جہاں ۲۶ فیلڈ رجمنٹ آرٹلری کے افسر رہتے تھے اے ایچ کے نے جو اس وقت سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے بھیس بدلا اور میرا بیٹ مین بن کر چرچ روڈ پر میرا استقبال کیا۔ ان کے کپڑے، بات چیت، انداز بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا کہ پی ایم اے کے بیروں کا ہوتا ہے اس لئے مجھے شبہ تک نہ ہوا۔ ضرورت کی مختلف چیزیں خریدنے کے لئے انہوں نے پیسے مانگے جو میں نے اسی شان سے عطا کئے جس طرح ایک نیا نیا افسر اپنے خدمت گاروں کو دیتا ہے۔ اے ایچ کے نے اسی انداز سے سیلوٹ مارا جس طرح ایسے موقعوں پر اردلیوں کو کرنا چاہیئے۔ پھر اے ایچ کے نے ایک تجربے کار اردلی کے طور پر مجھے کچھ اونچ نیچ سمجھائی۔ اگلے روز مجھے رجمنٹ میں حاضر ہونا تھا۔ وہاں کے متعلق اس بیرے نے کچھ رازدارانہ مشورے بھی دیئے۔ حالانکہ مجھے دوستوں نے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ بیٹ مین سے ہوشیار

رہنا یہ لوگ بعض اوقات نئے افسروں کو بڑے چکر دیتے ہیں لیکن عظمت کی ایکٹنگ اتنی کامیاب تھی کہ میں پوری طرح اس کے دام میں آگیا۔ اسی شام کو میں نے انہیں میس میں افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے دیکھا تو مجھے پتہ چلا کہ بات کیا تھی۔ مذاق، طنز، مزاح، عظمت کی شخصیت کا ایک ایسا رخ تھا جو ہر کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

عظمت کی حس ظرافت اکثر ایسے موقعوں پر بھی بھڑک اٹھتی تھی جہاں بڑے بڑے ظریف بھی چوکڑی بھول جاتے ہیں۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ یونٹ میں ایک ۲۵۰ سی سی ہونڈا موٹر سائیکل نئی نئی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر عظمت کو اسے ڈرائیو کرنے کا شوق چرایا۔ ٹرانسپورٹ جے سی او سے ہونڈا پر سواری کرنے کی ضروری ہدایات لیں اور ہونڈا کو دبا کر صدر بازار کی طرف نکل گئے۔ راستے میں ہونڈا سلپ ہوئی اور ہمارے شاہسوار صاحب تقریباً دس گز پرے جا گرے۔ چہرہ لہولہان ہو گیا کچھ چوٹ سر پر بھی آئی لوگ دوڑے ان کو اٹھایا۔ ہونڈا سیدھا کیا۔ انہیں سی۔ ایم۔ ایچ لے جانے کے لئے ایک کار کو روکا گیا۔ ٹھیک اس وقت عظمت کو ایک نئی سوجھی سامنے ایک فوٹو گرافر کی دوکان تھی وہ دوکان پر گئے اور بولے جلدی سے ایک سنیپ تو لے لو ایسے حادثے روز روز کہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ عظمت کے اصرار کرنے پر پہلے حضرت کا فوٹو ہوا پھر سی ایم ایچ کی یاترا کیلئے گئے۔

اس حادثے کے بعد عظمت دوستوں کو یہ فوٹو دکھایا کرتے تھے اور کہتے " دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔ عظمت کے پاس ہر ٹیڑھی سے ٹیڑھی بات کا فوری جواب ہوتا تھا فقرہ بازی میں اور ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ایک بار حضرت پھنس ہی گئے تھے۔ لیکن ذہانت آڑے آئی ہوا یوں کہ ایک بار ہم ٹلہ پہاڑیوں پر رجمنٹ کی ٹیسٹ مشقیں کر رہے تھے۔ عظمت کی بیلٹ کے چھلے زنگ آلودہ سے تھے اتنے چمک نہیں رہے تھے۔ جتنا چمکنا چاہیئے تھا۔ سی او نے دیکھا تو بیلٹ صاف نہ کروانے کی وجہ پوچھی عظمت نے مودب ہو کر کہا، سر، رجمنٹ جنگی مشقیں کر رہی ہے۔ میں نے قصداً بیلٹ کو میلا رکھا ہے تاکہ دشمن کو اس کی چمک دمک

سے اشارہ نہ مل جائے۔ سی او کا ارادہ جھاڑنے کا ہو گا لیکن یہ جواب سن کر صرف مسکرا کر رہ گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

لیفٹیننٹ کرنل سید دلبر حسین نقوی کے تاثرات

عظمت شہید کی ذات چند عجوبہ روزگار متضادات کا مجموعہ تھی۔ بزم میں جان محفل رزم میں فخر مقتل۔ خوشی کے لمحات میں عظمت شہید مسلسل قہقہوں کا نام تھا۔ فقرے بازی سے شور شرابا۔ جھگڑے پھر صلح اور پھر صلح اور پھر وہی شرارتیں لیکن وقت پڑنے پر شہید کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری ہو جاتی جیسے سارے جہان کا درد شہید ہی کے جگر میں ہو۔ مہربان افسر تھا تمام جوانوں کی جان۔ بہترین ساتھی تھا ہر وقت مدد کرنے کے لئے تیار اور ذمہ دار ماتحت تھا نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ بعض اوقات اپنی فطری سادہ لوحی سے خوبصورت غلطیاں کر جاتا تھا پھر بہت بھولے طریقے سے انہیں چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور جب پکڑے جانے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا تھا تو اپنی شرارتی سنجیدگی کے خلاف کو توڑتے ہوئے ہنس کر مان جایا کرتا تھا۔

میں عظمت شہید سے چھ ماہ سینئر تھا اور جب شہید یونٹ میں آیا تو میں فل لیفٹیننٹ تھا۔ فل لیفٹیننٹ یونٹ کی جان ہوتے ہیں۔ سیکنڈ لیفٹیننٹوں کو تنگ کرنا، سردار صاحبان پر اپنی لیفٹنی کا رعب جمانا۔ رولز ریگولیشن سے بے فکر اپنی کر گزرنا۔ ہم اپنی دانست میں یہ سب کر رہے تھے کہ اچانک پتہ چلا کہ عظمت شہید نے چپکے سے ہم سے یہ سب کچھ چھین لیا ہے اور اتنی خوبصورتی سے چھینا ہے کہ ہمیں اعتراض کا موقع بھی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ ہمیں پتہ چلتا یونٹ میں خبر گرم تھی کہ پرانے لیفٹیننٹوں کے پرزے اڑ چکے ہیں اور نیا لفٹین صاحب آگیا ہے۔ اب عظمت شہید تھا اور یونٹ کے شب و روز شہید اپنی ہر حرکت کے بعد رستم کی طرح

(اے ایچ کے) کا نعرہ لگایا کرتا تھا تندئی طبع کی بنا پر شہید وہ کر گزرتا جو جی میں آجائے وہ یونٹ کا واحد افسر تھا۔ جس کے پاس اڑھائی ٹن ٹرک چلانے کا لائسنس تھا اور جو یونٹ کے ڈی آر موٹر سائیکل کو چلانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ عظمت کے دم سے یونٹ میں زندگی تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ وہ یونٹ کے ہر شائستہ سیکنڈل میں بدرجہ اتم ملوث رہتا تھا۔

عظمت شہید ایک پر جوش انسان تھا۔ نڈر بیباک، اکثر اوقات کرنے کے بعد سوچنے والا لیکن یہ خصوصیات شہید کی ذات، کا اتنا اہم پہلو نہیں ہیں جتنا کہ اس کی وہ دلیری جس سے وہ اپنی حرکات کے نتائج کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ شہید عالی ظرف تھا اس کے سینے میں بہت بڑا دل تھا اور وہ معاف کر دینا بھی جانتا تھا ایک مرتبہ میں چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کے کمرے میں بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ شہید مسلسل کھیل میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ فقرے بازی۔ سوچنے کا موقعہ نہ دیتا۔ پتے ادھر کے ادھر اور ادھر سے ادھر ایک دو بار منع کرنے کے بعد بھی جب شہید باز نہ آیا تو مجھے غصہ آگیا غالباً میں ہار بھی رہا ہوں گا۔ میں نے کہا عظمت کھیل مزا لینے کے لئے کھیلا جاتا ہے بدمزگی کے لئے نہیں اس وقت تمہاری رگ ضرورت سے زیادہ پھڑک رہی ہے اس سے پہلے کہ کوئی الجھن پیدا ہو جائے ہمیں کھیل بند کر دینا چاہیئے۔ یہ کہہ کر میں تیزی سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا سادہ دل عظمت محض دل لگی کر رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کھیل کا یہ انجام ہو۔

مجھے اپنے کمرے میں جانے سے روکنے کیلئے اس نے میرے آگے اپنا پاؤں رکھ دیا۔ جسے میں عام حالات میں دیکھ لیتا، لیکن اس مرتبہ پارہ بلند ہونے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا نتیجہ دوسرے ہی لمحہ میں ایک زبردست دھماکہ کے ساتھ منہ کے بل زمین پر پڑا تھا اور اس کے بعد اگلے چند لمحوں میں بدمزگی پیدا ہو گئی جب کمرے میں پہنچا اور عقل ٹھکانے آئی تو عظمت شہید کی نیک نیتی کا شدت سے احساس ہوا میں فوراً عظمت کے پاس واپس آیا اور معافی مانگی شہید نے کہا۔ کوئی بات نہیں لیکن زہر خندہ معافی مجھے نہیں چاہیئے میں نے کہا کہ جب تک دل سے معاف

نہیں کرو گے یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ سزا دے لو یا معاف کر دو۔ تیسرا رستہ نہیں ہے عظمت نے کمال عظمت سے مجھے گلے سے لگا کر ان الفاظ سے معاف کیا کہ بڑے بھائی معافی نہیں مانگا کرتے۔ اس واقعے کے بعد دو سال عظمت شہید ہمارے یونٹ میں رہا اور اس کے جانے کے بعد یونٹ غریب تر ہو گئی۔

شہید اکثر اپنی بیٹری کا تنخواہ تقسیم کرنے والا افسر ہوا کرتا تھا۔ تنخواہ خود دیتا تھا۔ اور عام دستور کے مطابق (پے رول) کی صرف پہلی کاپی پر اندراج کرتا تھا ایک مرتبہ متعلقہ کلرک نے باقی کاپیوں پر اندراج کرتے وقت کچھ رقم خرد برد کر لی فراڈ کا کیس بن گیا سی او نے ماہر تحریر کی خدمات حاصل کیں۔ جس نے عظمت شہید کو غالباً ڈھائی یا تین ہزار دستخط کرنے کے لئے کہا۔ ایسے عالم میں بڑوں بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں لیکن عظمت شہید تھا اور اس کی ازلی مسکراہٹ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بات پر خوش ہے کہ یہ واقعہ اسی کی بیٹری میں ہوا ہے شہید کا دفتر میرے ساتھ والے کمرے میں تھا۔ ہر دستخط کرنے کے بعد شہید دفاع کے لئے باآواز بلند (اے ایچ کے) کا نعرہ بلند کرتا تاکہ سب لوگ ہو چکنے والے دستخطوں کی تعداد سے واقف رہیں۔ کیس کی تفتیش اور روئیداد کے دوران عظمت کی جولانی طبع اپنے عروج پر تھی۔ ہنگامہ خیز طبیعت کو مقدمہ راس آ گیا تھا ہر روز نئی چیز نئے سوالات نئے نکات جب مقدمہ ختم ہوا تو عظمت شہید باعزت بری الذمہ ہوا لیکن اس دن وہ بہت اداس تھا جیسے کسی نے ایک بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا ہو۔ اسی دن شہید نے لہو گرم رکھنے کے لئے یونٹ ڈی آر سے زبردستی موٹر سائیکل لے کر گیلی زمین پر ٹیسٹ کرنے کی کوشش کی اور جب ٹیسٹ ناکام رہا اور عظمت زخمی ہو گیا تو سی ایم ایچ جانے سے پہلے اس نے زخمی حالت میں اپنی نادر روزگار تصویر کھنچوائی۔

عظمت شہید سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۱ء کے اوائل میں نوشہرہ میں ہوئی۔ تب میں آرٹلری سکول میں تعینات تھا اور عظمت شہید میجر جنرل شوکت رضا کے ساتھ اے ڈی سی تھا۔ میں نے اپنی شادی کے لئے کچھ کپڑے گھر بھیجنا تھے۔ عظمت کھاریاں جاتے ہوئے ان

کپڑوں کو میرے بھائی لیفٹیننٹ کرنل ایس ایم الیاس کے ہاں ملٹری کالج چھوڑ گیا پڑے ویسے ہی ہیں لیکن عظمت اب ہم میں نہیں ہے جب بھی وہ کپڑے نظر آتے ہیں گھر میں عظمت شہید کا ذکر ضرور ہوتا ہے شہید عظیم تھا۔ منفرد تھا تندخو بھی تھا صلح جو بھی تھا اس کو ایسی ہی ظاہری موت ملنا چاہیئے تھی جیسا کہ ملی خداوند کریم اس کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور اس کے اعزاہ کو صبر و استقامت بخشیں آمین ثم آمین۔

بریگیڈیر محمد حیات ستارہ جرأت کے تاثرات

میجر عظمت حیات جیسور ایسٹ پاکستان میں ۹ ڈویژن کے جی او سی کے اے ڈی سی تھے جب جنرل موصوف کا تبادلہ مغربی پاکستان ہوا تو وہ عظمت کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار تھے۔ لیکن عظمت نے وہیں مشرقی پاکستان ہی میں کسی فیلڈ رجمنٹ میں پوسٹ ہونے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ انہیں جیسور میں ۵۵ فیلڈ رجمنٹ میں پوسٹ کر دیا گیا میں جیسور میں بریگیڈ کمانڈر تھا۔ اور ۵۵ فیلڈ رجمنٹ میرے بریگیڈ کی ڈائریکٹ سپورٹ رجمنٹ تھی۔ اس طرح مجھے میجر عظمت کی کارکردگی کو براہِ راست دیکھنے کا موقعہ ملا۔

میدان جنگ میں اور وہ بھی اس طرح کے میدان جنگ میں جب حالات کا رخ اپنے خلاف ہو، بڑوں بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں اور وہ جائے پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ لیکن عظمت ان افسروں میں سے تھا۔ جو تندی باد مخالف سے قطعاً ہراساں نہیں ہوتے۔ نہ صرف اس کا حوصلہ بلند تھا بلکہ اس کی طبعی خوش مزاجی میں بھی فرق نہیں آیا تھا۔ میرا خود یہ وطیرہ رہا ہے کہ مشکل حالات میں طبیعت کو شگفتہ رکھا جائے۔ چنانچہ جب بھی موقعہ ہوتا میں نوجوان افسروں سے ایک آدھ بات چھیڑ کی ضرور کیا کرتا۔ ایک دن اگلی صفوں میں۔ میں عظمت کی بیٹری کا معائنہ کرنے گیا۔ تو ضروری باتوں کے بعد میں نے پوچھا " نوجوان، تمہارا کوئی بیٹا بھی ہے؟" عظمت نے فوراً جواب دیا۔ ابھی نہیں سر، لیکن بہت جلد ہو جائے گا یہ سن کر میں نے کہا۔ تو پھر ذرا

جلدی کرو۔ اگر ہم اس جنگ سے نہ بچ سکے تو ہمارے بیٹے ہی فوج میں ہماری جگہ لیں گے
میں اس طرح کی باتیں اس لئے کیا کرتا تھا۔ کہ دیکھوں آفیسرز کے عزم و حوصلہ کی کیفیت کیا ہے
عظمت نے جس لب و لہجہ میں میرے مذاق کا جواب دیا تھا اسی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا
یہ شیر نر ہے۔

عظمت نے جون ۱۹۷۱ سے ۸ دسمبر ۱۹۷۱ء تک ۵۵ فیلڈ رجمنٹ کی ایک بیٹری کمان کی۔ اس عرصے میں دشمن کی برتر قوت کے سامنے عظمت نے مختلف معرکوں میں جس طرح بیٹری کی جرأت مندانہ قیادت کی۔ اس کی علیحدہ ایک ولولہ انگیز داستان ہے۔ اس وقت میں اس کے آخری معرکہ کی کچھ تفصیل بتاؤں گا۔

یکم دسمبر سے دشمن کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ جیسور میں ہمارے دفاعی حصار کو توڑتا ہوا آگے بڑھے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے نمبر ۹ ڈویژن کو را ور ڈیو آرٹلری، ڈیڑھ ٹینک رجمنٹ، دو انجینئرز بٹالین اور ایک مارٹر بٹالین سے ہمارے ہی دفاعی لائن پر تقریباً ایک ہفتہ تاپے بپے بھرپور حملے کئے اور آخر کار وہ جیسور سے تقریباً تین میل شمال میں ہمارے اکہرے دفاع میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ چونکہ دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے وقت تھا اور نہ ٹروپس تھے۔ اس لئے بہت جلدی میں شہر کے ٹھیک پیچھے ایک دفاع منظم کیا گیا۔ جس کو وائی جنکشن کا نام دیا گیا اور میجر عظمت کو بٹالین (۲۲ ایف ایف آر) کا سپورٹ بیٹری کمانڈر مقرر کیا گیا۔ ٹارگٹ یہ تھا کہ یہ پوزیشن دشمن کو ۶ دسمبر سے ۸ دسمبر تک الجھائے رکھے تاکہ ۱۰۷ بریگیڈ کو اس دفاع سے پیچھے جا کر کھلنا کے سامنے ایک مضبوط دفاعی لائن منظم کرنے کا وقت مل جائے۔ بہر حال ہوا یہ کہ ۶ دسمبر کو سر شام ہی کو دشمن وائی جنکشن کے سامنے پہنچ گیا اور آدھی رات تک اس نے ایک حملہ کیا بھی جو عظمت حیات کی بیٹری کی موثر کارروائی کی مدد سے پسپا کر دیا گیا واقعہ یہ ہے کہ عظمت کے بروقت اور موثر فائر کے بغیر اس پوزیشن کو بچانا بہت مشکل ہوتا دوسرے دن صبح دشمن نے تازہ دستوں سے ایک اور حملہ کیا اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس دن یعنی ۷ دسمبر

کو جب میں وائی جنگشن کی پوزیشن پر گیا۔ (جہاں عظمت اپنی بیٹری سے ۲۲ ایف ایف آر کو سپورٹ دے رہے تھے) اس سنگین صورت حال میں نیند اور آرام کی کمی اور سخت نقصانات اٹھانے کے کے بعد باوجود، میں نے عظمت کو خلاف توقع اسی لاپرواہ موڈ میں پایا۔ میں نے عظمت کے شانوں کو تھپتھپایا اور اس پر اس نے فوراً کہا۔ سر، ہم آپ کو لیٹ ڈاون نہیں کریں گے۔ جب تک آپ اپنے دفاع کو منظم نہ کرلیں، ہم دشمن کو یہاں سے گزرنے نہیں دیں گے۔ ۸ دسمبر کی شام سے پہلے تو اسے ہمیں اس پوزیشن سے سنگین مار کر نکالنا پڑے گا۔ یہ بہت دلیر الفاظ ہیں۔ میری عمر انفنٹری میں گزری ہے اس وقت جب کہ برتر قوت کے ساتھ دشمن سر پر پہنچ چکا تھا۔ توپ خانے کے ایک افسر کے یہ پرعزم الفاظ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور بڑا فخر ہوا کہ میری زیر کمان کس حوصلہ کے افسر ہیں۔ اس وقت جبکہ فضا میں موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنی جاسکتی ہو اس طرح کا مورال بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ۸ دسمبر کی صبح کو آخری معرکہ شروع ہونے سے کچھ پہلے، عظمت کو مختلف جگہوں سے ہوتا ایک باسی تار ملا جس میں ۲ دسمبر کو بیٹے کی پیدائش کی نوید دی گئی تھی۔ اس کو پڑھ کر عظمت نے کہا میرا بدل آگیا ہے اب میں خوشی خوشی مرسکتا ہوں۔

تقدیر کا فرشتہ جیسے انہی الفاظ کا انتظار کر رہا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دشمن نے عابتر آکر بالکل سامنے سے ٹینکوں کے ساتھ ایک پورے بریگیڈ سے حملہ کیا۔ اور مزید ایک مارٹر بٹالین ایک ٹینک اسکواڈرن کی مدد سے وائی جنگسن پوزیشن کو ایک بازو کی طرف سے آؤٹ فلینک کرلیا۔ دو گھنٹے تک خون ریز لڑائی ہوتی رہی۔ ۲۲ ایف ایف کی بیشتر اگلی پوزیشنیں بالکل تباہ ہوگئیں اور پیچھے سے بھی رابطہ منقطع ہوگیا۔ بیٹری کمانڈر عظمت حیات کو حکم دیا گیا کہ وہ پیچھے کی پوزیشن پر پسپا ہوجائیں۔ لیکن دشمن نے تو پسپائی کا راستہ بھی کاٹ دیا تھا۔ اب دو ہی راستے تھے یا ہتھیار ڈالے جائیں یا پھر آخر دم تک لڑا جائے۔ میجر عظمت حیات کی عظمت کو سلام کہ اس نے ایک انفنٹری کے افسر کی طرح پوزیشن پر لڑنا پسند کیا۔ آخر کار دشمن نے اسے گھیر کر لفظی طور پر سنگینوں ہی سے مارا۔ اللہ اکبر۔ پاکستان کا یہ جیالا سپوت فرض کی لکیر سے بہت آگے جاکر انفنٹری پوزیشن پہ شہید ہوگیا۔ اور اس طرح

طرح گنرز کے لئے ایک انوکھی روایت چھوڑ گیا۔ عظمت کی جرأت اور فرض سے وفاداری اس پائے کی تھی کہ میں نے عظمت کے لئے نشان حیدر کا اعزاز تجویز کیا تھا وہ اسکا ہر طرح سے مستحق تھا۔ لیکن افسوس۔ چندروز بعد وہ بساط ہی الٹ گئی۔ سقوط مشرقی پاکستان کے طوفان کے عقب میں سب کچھ غت ربود ہوگیا۔ بہتوں کی جی داریاں، دلیریاں اور جرأتیں خاک میں مل گئیں۔ اور عظمت کو بھی اس کا حق نہ مل سکا بہرحال شہید کا اصل اجر تو اللہ کے پاس ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مرتب کرتے وقت غالباً راشد صاحب کو علم نہیں تھا کہ میں عظمت کا بریگیڈ کمانڈر رہا ہوں۔ ورنہ جہاں انہوں نے مجھ سے لیفٹیننٹ کرنل صاحب زاد گل شہید ستارہ جرأت اور لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی اور میجر اکرم شہید نشان حیدر پر انٹرویو لیا وہاں عظمت کا ذکر ضرور کرتے۔ بہرحال جب تذکرۂ شہداء میں، میں نے عظمت کا تذکرہ پڑھا تو میں نے اخلاقی ذمہ داری سمجھی کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ دنیا کو بتاؤں اور یہ بھی بتاؤں کہ میرے حساب سے میجر عظمت حیات بھی نشان حیدر ہے۔ اسی اعزاز کی میں نے سفارش کی تھی یہ اور بات ہے کہ حالات نے اس کی منظوری کی نوبت نہیں آنے دی۔ میں نے ایک بار پھر عظمت کو سلام کرتا ہوں اور ان سے بہت سے عظمتوں کو بھی جن کی گمنام جرأتوں سے کسی نے پردہ نہیں اٹھایا۔

اے رب مشرقین والمغربین ہمیں عظمتوں کی آج بھی ضرورت ہے ہمیں عظمتوں سے محروم نہ کرنا۔

شہید کا خاندان

شہید کے تین بھائی ہیں ایک بڑے دو چھوٹے۔ ایک چھوٹے بھائی ظفر محمود نے ملٹری کالج میں تعلیم پائی ہے۔ شہید کی ایک ہی بہن ہیں جو انکے چچازاد بھائی میجر محمد اعظم خان سے بیاہی ہیں۔ شہید کے دوسرے چچازاد بھائی بریگیڈیر (ریٹائرڈ) عطا محمد خان ملک ستارہ امتیاز ملٹری کالج جہلم کے ایک ممتاز اولڈ بوائے ہیں۔ ان ہی کی صاحبزادی سے عظمت کی شادی مئی ۱۹۶۹ء میں کھاریاں میں ہوئی۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں عظمت کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اللہ نے شہید کو ایک بیٹے سے شہادت سے صرف چندروز پہلے ۲ دسمبر ۷۱ء کو نوازا۔ شہید کی یادگار یہی دو بچے ہیں خدا انکو سلامت رکھے اور انکی عظیم ماں کو ان سے سکھ پہنچائے آمین۔

کیپٹن سلیم اختر شہید

پنجاب رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ——————— ۲۰ر اگست ۱۹۴۷ء

جائے پیدائش ——————— سہارنپور

کمیشن ——————— ۴۱ پی ایم اے

تاریخ شہادت ——————— اکتوبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ——————— ۲۴ رسال

مقام شہادت ——————— چرکولیا (کھلنا)

مدفن ——————— جیسور (مشرقی پاکستان)

کیپٹن سلیم اختر شہید

"خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ چرکولیہ گاؤں کو مکتی باہنی نے اپنا اڈہ بنایا ہوا ہے یہاں کے بانس کے جنگل ان کی کمین گاہوں کا کام دے رہے ہیں اس وجہ سے چرکولیہ کو مکتی باہنی سے صاف کرنا خاصا دشوار اور خطرناک آپریشن ہوگا لیکن اس اڈے کا صفایا کرنا بھی ضروری ہے اس کے بغیر اس علاقے میں حکومت کا اقتدار بحال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک کمپنی کو اس مشن پر بھیجا جائے۔"

"سر میں اپنے آپ کو والنٹیئر کرتا ہوں۔ مجھے اس کمپنی کے ساتھ اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے۔" "ینگ مین، میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن تم تو کوارٹر ماسٹر ہو اور پہلے ہی سے ایک ضروری کام سرانجام دے رہے ہو۔"

"سر پیچھے بیٹھے کچھ مزہ نہیں آتا میں چاہتا ہوں کہ میدان کارزار میں کچھ کر کے دکھاؤں۔ یوں بھی میری اپنی پلاٹون ایکشن کرنے جا رہی ہے۔ اس آپریشن میں خود اس کے ساتھ ہونا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگر تمہیں اتنا شوق ہے تو اپنا زور بازو دکھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

کل صبح کارروائی شروع ہوگی۔"

یہ واقعہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کی شام کا ہے۔ ۱۲ پنجاب کے سی او لیفٹیننٹ کرنل (اب میجر جنرل) امتیاز وڑائچ ہیڈ کوارٹر میں اپنے افسروں سے تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ جس گاؤں چرکولیہ

کانڈکرہ ہو رہا تھا وہ کھلنا مشرقی پاکستان میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس افسر نے اس مہم پر جانے کیلئے بڑے شوق سے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں وہ کیپٹن سلیم اختر تھے جو دوسرے دن ۱۲ اکتوبر ۷۱ء کمپنی کے ہر اوّل دستے کی کمان کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

سوانح زندگی

کیپٹن سلیم اختر شہید کا آبائی گاؤں جاتلی ہے جو تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی میں واقع ہے لیکن سلیم اختر ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کو سہارنپور (انڈیا) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مرحوم کرنل سردار خان باؤنڈری فورس کے ساتھ اہم خدمات انجام دے رہے تھے۔

سلیم اختر نے اپنی رسمی تعلیم کا آغاز لارنس کالج مری سے کیا۔ وہاں سے پریزنٹیشن کانونٹ سکول مری منتقل ہو گئے۔ چند برس وہاں پڑھا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۶۰ء میں دوبارہ لارنس کالج مری میں داخل ہوتے اور تقریباً ایک سال ۱۳ اپریل ۱۹۶۱ء تک وہاں رہے اور چھٹی فارم کا امتحان پاس کیا جو آٹھویں درجے کے برابر ہوتا ہے اسی سال ۶۱ء اپریل کے تیسرے ہفتے میں ملٹری کالج جہلم میں آٹھویں درجے میں داخل ہو گئے۔ ان کا کالج نمبر ۲۶۴۷ تھا۔ سلیم اختر کے بڑے بھائی سعید اختر (اب لیفٹیننٹ کرنل) پہلے سے اس کالج میں داخل تھے۔

۱۹۶۲ء میں سلیم اختر نے آٹھویں درجے کا امتحان اوسط درجے کے نمبروں کے ساتھ پاس کیا لیکن پی ٹی اور کھیلوں میں امتیاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۳ء میں سلیم نویں جماعت میں تھے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان سالوں میں سلیم کی تعلیمی حالت معمولی تھی لیکن کھیلوں میں خاص طور پر باسکٹ بال میں سلیم نے کافی امتیاز حاصل کیا۔ ۶۴-۶۳ء کے تعلیمی سال کے انٹر ہاؤس باسکٹ بال مقابلوں میں سلیم نے اپنے ہاؤس (بابر ہاؤس) کی نمائندگی کی۔ اسی سال سلیم کالج کی باسکٹ بال ٹیم میں لئے گئے اور انٹر سروسز پبلک سکول ٹورنامنٹ میں کالج کی نمائندگی کی۔ ۶۵ء میں سلیم کو کالج باسکٹ بال کا کیپٹن مقرر کیا گیا اور باسکٹ بال میں کالج کلر بھی

دیا گیا۔ لیکن حسب معمول سلیم کی نصابی کارگزاری کمزور تھی۔ خصوصًا اردو میں۔ چنانچہ فرسٹ ائیر آرٹس کے سالانہ امتحان میں سلیم کو مشروط طور پر اگلی کلاس میں ترقی دی گئی۔ اس عرصے میں چھوٹے موٹے ڈسپلن کے مقدمے بھی چلتے رہے۔ ایک وارننگ ۱۳ر نومبر ۶۵ء کو دی گئی تھی اوائل جون ۶۶ء میں سلیم پھر ایک ڈسپلن کے کیس میں ماخوذ ہوئے۔ دوسری طرف انہیں ۶۶-۶۵ء کا باسکٹ بال کلر بھی ملا۔ جون کے تیسرے ہفتے میں سلیم نے سیکنڈ ائیر آرٹس کا امتحان دیا۔ اردو میں انتہائی کمزور ہونے کی وجہ سے پاس ہونے کی توقع تو نہیں تھی لیکن جیسے تیسے ۱۰۰۰ میں سے ۴۱۷ نمبر لے کر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہی ہو گئے۔ ۳۰ر جون ۱۹۶۰ء کو سلیم نے کالج کو الوداع کہا۔ اسی سال نومبر ۱۹۶۶ء میں وہ پی ایم اے لانگ کورس کیلئے منتخب کر لئے گئے۔

شہادت

کیپٹن سلیم اختر کے بارے میں ۲۱ پنجاب کے موجودہ کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل گل نواز نے ہمیں یہ بتایا۔

کیپٹن سلیم اختر شہید ۱۹۷۰ء میں ۹ پنجاب سے ۲۱ پنجاب میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ شہید نے چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو ۲۱ پنجاب کے ماحول میں اسی طرح ڈھال لیا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اسی پلٹن میں رہ رہے ہوں۔ سلیم شہید ۱۹۷۱ء میں پلٹن کے ساتھ مشرقی پاکستان چلے گئے اس وقت وہ بٹالین کوارٹر ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ شہید جذبہ شہادت سے اس قدر لبریز تھے کہ انہوں نے اپنے فرائض سے ہٹ کر ایک آپریشن میں حصہ لینے کی پیش کش کی۔ اس آپریشن کو چار کولیا آپریشن کا نام دیا گیا۔ چرکولیا کھلنا کے قریب ایک گاؤں تھا جس کو مکتی باہنی نے ایک مضبوط دفاعی پوزیشن میں تبدیل کیا ہوا تھا۔ مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو کیپٹن سلیم شہید اپنے پلاٹون کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کو گھیرنے کی کوشش میں تھے کہ اچانک جنگل سے مشین گن کا فائر کھلا اور پلاٹون حوالدار سخت زخمی ہو گیا۔ سلیم شہید بڑی بے جگری سے آگے بڑھے اور اپنے

حوالدار کو جھک کر دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں گولیوں کی بوچھاڑ ان کی ٹانگ میں لگی جس سے وہ زخمی ہو گئے اس کے بعد زخموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی مشین گن سے دشمن پر فائر کھول دیا۔ مگر دشمن کی طرف سے مشین گنوں کا زبردست فائر شروع ہو گیا۔ جس کی گولیاں کیپٹن سلیم شہید کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ انتہائی زخمی ہونے کے باوجود وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں رہے اور پلاٹون کی رہنمائی کرتے رہے۔ جس سے ان کی پلاٹون کے حوصلے بلند رہے اور دشمن اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کچھ دیر بعد سلیم شہید زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس بہادری پر کیپٹن سلیم شہید کیلئے ستارۂ جرأت دینے کی سفارش کی گئی۔

اکتوبر ۷۱ء میں ۱۲ پنجاب کو لیفٹیننٹ کرنل (اب میجر جنرل) امتیاز دڑائچ کمان کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے رجوع کیا کہ سلیم کی شہادت کے متعلق اپنے مشاہدات سے مستفیض کریں تو ان کا یہ جواب آیا:۔

چر کولیہ کھلنا سے ۲۰ میل جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ اس گاؤں کو مکتی باہنی نے اپنا اڈہ بنایا ہوا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں نے کمپنی کو حکم دیا کہ اس علاقے کو باغیوں سے نجات دلائے اور حکومت کا اقتدار بحال کرے۔ ۱۲/ اکتوبر ۷۱ء کو صبح ۶ بجے لانچوں کے ذریعے سے کمپنی روانہ ہوئی اور مولائٹ گوپال گنج پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ یہ جگہ نشانے سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی اس مقام سے کمپنی نے ہوشیاری سے آگے بڑھنا شروع کیا تاکہ دشمن سے دو دو ہاتھ کئے جا سکیں۔ یہ علاقہ جنگلوں سے گھرا ہوا اور دریائی ہے دو ڈھائی مربع میل میں پھیلے ہوئے بانسوں کے اس جنگل میں ایک ندی کے اس پار چر کولیہ واقع ہے ندی اس جنگل کو دو حصوں میں بانٹتی ہے اس خطرناک جنگل سے صرف ایک کچا راستہ یا پگڈنڈی گزرتی ہے کمپنی نے ابھی بمشکل دو میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سب سے آگے والی سلیم کی پلاٹون پر دشمن کا فائر کھل گیا۔ پیڑوں کے اوپر سے بھی اور درختوں

کی آڑ سے زمین پر بھی۔ سلیم نے فوراً اپنی پلاٹون کو پوزیشن لینے اور جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا۔

اس موقعہ پر سلیم اختر نے جرأت اور فراست سے کام لیتے ہوئے باقی دو سیکشنوں کے ساتھ اپنی داہنی طرف سے آگے بڑھ کر دشمن کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں پلاٹون حوالدار جو کیپٹن سلیم اختر کے ساتھ ساتھ تھے۔ دشمن کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو گئے اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ بھی دشمن کی زد میں ہیں لیکن سلیم اختر نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جدھر سے فائر آیا تھا ادھر بے جگری سے حملہ کر دیا۔ سلیم اختر کے اس دلیرانہ اقدام نے دوسروں کے بھی حوصلے بڑھا دیئے وہ بھی جوش میں آ گئے اور سخت مقابلہ شروع ہو گیا اس عرصے میں جب سلیم اپنی اسٹین گن کو دوبارہ بھر رہے تھے کہ اتنے میں ایک گولی آکر ان کی دائیں ٹانگ میں لگی خون بہنے لگا لیکن اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ لیڈنگ سیکشن سے تقریباً ۳۰۰ گز آگے دریائی نالے تک پہنچ گئے۔ یہ جگہ دشمن کا مرکز تھی نالے کے پار سے ایک دو نہیں اکٹھے ۶ ایل ایم جی کا فائر کھلا اور ایک برسٹ سیدھا ان کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ”جاؤ اور کمپنی کمانڈر کو بتا دو کہ دشمن کو ضرور کچلنا ہے“ یہ تھے وہ آخری الفاظ جو کیپٹن سلیم نے اپنے ایک این سی او سے کہے۔

تدفین

کیپٹن سلیم اختر شہید کو جیسور کینٹ میں سی ایم ایچ کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔ دفن کے وقت سلیم اختر کے ایک عزیز نعیم موجود تھے انہوں نے سہرا پہنایا (چونکہ شہید کی شادی نہیں ہوئی تھی گویا شہادت ہی شادی تھی) یوں دولہا بنا کر رخصت کیا۔ نعیم صاحب کا بیان ہے جب آخری بار سر سے کفن ہٹایا تو چہرہ نور سے دمک رہا تھا۔

شہادت پر ماں کے تاثرات

جوان بیٹے کا غم بڑا غم ہوتا ہے۔ جب بیٹے کی شہادت کی خبر ان کو ملی تو جو دل پر گزری

ہو گی گزری ہو گی۔ لیکن زبان سے صرف اتنا کہا۔
"شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کو یہ عزت دی"

سلیم شہید کی شخصیت

شہید کی والدہ مکرمہ لکھتی ہیں :۔

سلیم بہت نرم دل اور سب سے محبت کرنے والا بچہ تھا۔ بہن بھائیوں اور والدین اور رشتہ داروں سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جانوروں سے جو پالتا تھا بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ ڈھاکے جانے سے پہلے اس نے بلی پالی ہوئی تھی وہ جاتے ہوئے میرے پاس چھوڑ گیا اور ڈھاکہ سے اس کی خیریت معلوم کرتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ اس کے ابو کا ایکسڈنٹ ہو گیا وہ ان دنوں کا کول کورس کر رہا تھا چھٹی ملنی مشکل تھی ہم نے اس کو نہیں لکھا معلوم نہیں کس نے اس کو بتا دیا اور وہ رات کو سفر کر کے صبح گھر پہنچا اپنے ابو کے پاس ہی بیٹھا رہا اور ایکسڈنٹ کی تفصیلات پوچھتا رہا۔ پھر شام کو روانہ ہو کر دوسرے دن ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اس کو تسلی نہ ہوئی جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا۔

بہت نیک بچہ تھا وعدہ کا بہت پابند، وفادار دوستوں کا سچا دوست وہ ہے جو وقت پر کام آئے۔ خود اپنے دوستوں کے لئے جان تک دینے کو تیار رہتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین اور سمجھدار تھا بہت حوصلہ مند تھا۔ تین سال کا تھا کہ بیمار ہوا میں اس کو کار میں ہسپتال لے جا رہی تھی راستہ میں کار کو جھٹکا لگا اور دروازہ کھل گیا۔ سلیم شہید ۵ فٹ کے فاصلے پر جا گرا۔ میں نے سوچا بہت چوٹ آئی ہو گی اور بے ہوش ہو گا مگر کیا دیکھتی ہوں وہ اٹھ کر کپڑے جھاڑتا ہوا کار کی طرف آ رہا ہے میں نے پوچھا کہیں چوٹ لگی ہے کہنے لگے نہیں امی بالکل ٹھیک ہوں۔ شرارتی بھی بہت تھا۔ مگر کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ ایسی شرارت کرتا تھا کہ سب لطف اندوز ہوتے تھے۔

وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا ایک مرتبہ اس کے ابو نے ملازم کو کسی بات پر غصہ

یں تھپڑ مار دیا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا سلیم شہید کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کہہ رہا تھا ایو کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بہت ہی نرم دل تھا۔ اپنے اردلی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ مجھے بھی کہتا کہ میرے اردلی کو کپڑے ضرور دیا کریں۔ اس کے آباؤ اجداد سب فوجی تھے وہ ایک فوجی خاندان کا فرد تھا۔"

سلیم کی شخصیت کے بارے میں (۱۷ء میں ۱۲ پنجاب کے کمانڈنگ افسر) میجر جنرل امتیاز وڑائچ لکھتے ہیں۔

"سلیم دراز قد، مضبوط قد کاٹھ کا نوجوان افسر تھا۔ جوان سال ہی نہیں جوان ہمت بھی پر جوش پر عزم اور ذہین وہ ہر عنوان سے ایک اچھے فوجی کی صفات کا حامل تھا۔ چیتے کی نظر شیر کا جگرہ۔ لیکن انسانی تعلقات میں جوانوں اور افسروں سے رسم وراہ میں اس کا رویہ یکسر مختلف ہوتا تھا۔ ہمدرد اور بامروت اپنے سپاہیوں کے لئے، اپنے یونٹ کے فوجی کے لئے، ملک کے لئے، بڑی سے بڑی قربانی دینے کیلئے تیار اسی وجہ سے وہ بٹالین کے ہر دائرے میں مقبول تھا۔

جہاں تک میرے علم میں ہے اس کے تین شوق تھے۔ کتابیں۔ تیز ڈرائیونگ اور اچھا لباس شہادت کے وقت وہ یونٹ میں کوارٹر ماسٹر کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس آپریشن میں اس کی شرکت ضروری نہیں تھی۔ لیکن اس نے لوگوں کے سمجھانے کے باوجود اس پر خطر مشن کے لئے اپنے کو والنٹیر کیا اور غیر معمولی جرأت سے لڑتے ہوئے ملک و ملت کیلئے اپنی جان دے دی۔

شہید کا ایک خط

۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو سلیم نے اپنی زندگی کا آخری خط اپنے ایک بھائی جاوید اختر کو لکھا:

"صرف چند لفظ لکھ رہا ہوں چونکہ ایک اہم مشن کی تکمیل میں مصروف ہوں امی کو میرا سلام بار بار کہنا اور ان کا خاص خیال رکھنا۔ تاکید ہے۔ میرے لئے دعا کرو۔"

نورانی چہرہ :۔ سلیم شہید کے ایک عزیز جیسور میں سلیم کی تدفین کے موقع پر موجود تھے۔ انہوں

نے گھر لکھا:۔

سلیم کی شہادت اور تدفین کے درمیان خاصا وقت گزر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید دیر سے جسد خاکی میں کچھ فرق پڑ جائے لیکن جب تابوت کا تختہ ہٹا کے میں نے چہرہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جسم سے ایک خوشبو سی آ رہی تھی اور چہرہ نور سے روشن تھا۔ سنتے آئے تھے کہ شہید کا چہرہ نورانی ہو جاتا ہے۔ سلیم کا چہرہ دیکھ کر میرا ایمان پختہ ہو گیا۔ واقعی شہید مرتے نہیں۔

دفن کے وقت میں نے خوب ہار پھول ڈالے۔ سہرا پہنایا۔ کچھ دل کی حسرتیں نکالیں۔ قبر پر آپ سب کی طرف سے دو دو مٹھی مٹی ڈال کے چلا آیا۔ کہتے ہیں شہید کے آخری الفاظ تھے "خدا حافظ"

بھائی کے تاثرات

سلیم کے بڑے بھائی سعید اختر نے ایک انٹرویو میں ہمیں بتایا سلیم لاابالی نظر آتا تھا لیکن اندر سے بہت تند اور اپنی آن کا پکا تھا۔ کبھی کبھی اس پہ غصے اور ضد کے دورے پڑتے تھے۔ حد درجہ منہ پھٹ ہو جاتا تھا۔ خاندان میں سب لوگ اس کی ادا کا احترام کرتے تھے۔"

لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود کا انٹرویو

کیپٹن سلیم اختر شہید شروع میں ۹ پنجاب ہی سے وابستہ ہوئے تھے اس لئے ہم نے ۹ پنجاب کے موجودہ سی او لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود (کالج نمبر ۲۴۲۰) کو لکھا کہ وہ سلیم اختر کے بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کریں کرنل خالد کا یہ جواب آیا۔

"آپ نے بھی کیا بات یاد دلادی۔ دل تڑپ کے رہ گیا۔ کیسے جیالے اس ملک کی سالمیت پر قربان ہو گئے اور کیسی کیسی تابناک مثالیں پیچھے چھوڑ گئے۔ سلیم ۱۹۶۸ء میں ۹ پنجاب کی سی کمپنی سے منسلک ہوئے میں اس وقت پلٹن میں کیپٹن تھا اور ہم دونوں نے خاصا وقت

۹ پنجاب کی میس میں ایک ساتھ گزارا میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکا۔

پریڈ سے زیادہ آدمی کا حال میس میں کھلتا ہے یہاں کوئی پردہ پڑا نہیں رہ سکتا۔ آدمی اندر سے جو کچھ ہوتا ہے سامنے آجاتا ہے۔ زندہ دلی سلیم پر ختم تھی وہ سخت منہ پھٹ تھا جو دل میں ہو وہ کہہ ڈالتا خواہ کسی کو اچھا لگے یا بُرا اس کا دل بہت بڑا تھا۔ مذاق کا برا نہیں مناتا تھا۔

سلیم مخلص، نڈر اور لاپروا تھا اس کا اظہار ہر روز ہوتا رہتا تھا۔ تیزی اس کی طبیعت کا خاصا تھی خواہ باسکٹ بال ہو یا سکوٹر، یا عام بات چیت۔ سستی سے اسے نفرت تھی۔ باسکٹ بال اور ہاکی کا بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ یونٹ کے اسپورٹس مین شپ میں اس نے جان ڈال دی تھی۔ اس وجہ سے جوانوں میں وہ بہت مقبول تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ہماری راہیں جدا ہوگئیں میں ایس ایس جی میں چلا گیا وہ ۲۱ پنجاب سے وابستہ ہوگیا لیکن ۹ پنجاب پلٹن اب بھی اسے یاد کرتی ہے اور فخر سے یاد کرتی ہے۔

کیپٹن جاوید مجتبیٰ کے تاثرات

کیپٹن جاوید مجتبیٰ ایڈجوٹینٹ ملٹری کالج جہلم کا تعلق ۹ پنجاب سے ہے کیپٹن سلیم اختر نے بھی فوج میں اپنا کیریر ۹ پنجاب سے شروع کیا تھا۔ اس لئے ہم نے مجتبیٰ سے سلیم کے بارے میں پوچھا تو یہ باتیں ہوئیں۔

سوال:۔ مجتبیٰ، تم کالج میں سلیم اختر سے ملے تھے؟

جواب:۔ نہیں میرا کالج نمبر ۲۹۸۴ ہے اور کیپٹن سلیم اختر کا نمبر ۲۶۳۶ ہے وہ کالج میں مجھ سے بہت سینئر تھے۔ وہ ۱۹۶۶ء میں کالج سے رخصت ہوئے جبکہ میں اسی سال داخل ہوا تھا۔ اس لئے یہاں ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی میں ان سے کبھی روبرو نہیں ملا۔ لیکن پھر بھی میں انہیں خوب جانتا ہوں۔

سوال:۔ ملاقات بھی نہیں ہوئی لیکن جاننے بھی خوب۔۔ ہو۔ وہ کیسے؟

جواب یہی تو میں بتانا چاہتا ہوں۔ سلیم اختر کے کردار کا یہی تو کمال ہے۔

سوال ذرا وضاحت کریں۔

جواب میں ۹ پنجاب سے اپریل ۱۹۷۲ء میں وابستہ ہوا۔ اس زمانے میں یہ بٹالین قصور سیکٹر میں تھی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں قیصر ہند کا علاقہ فتح کرنے کی وجہ سے اس کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ جنگ کو ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لئے افسروں اور جوانوں میں پلٹن کے شہیدوں کا ذکر اکثر ہوا کرتا تھا اور جب بھی یہ ذکر چلتا کیپٹن سلیم اختر شہید کا نام ضرور آتا اور اس طرح آتا کہ مجھے تجسس ہوتا کہ یہ کون افسر ہے کہ جس کا پلٹن میں اتنا نام ہے اور اتنی عزت ہے۔

سوال لیکن سلیم تو اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ایسٹ پاکستان میں ۲۱ پنجاب کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔

جواب یہی تو شہید کی شخصیت کا اعجاز تھا۔ انہیں ۹ پنجاب چھوڑے ہوئے دو سال ہو چکے تھے لیکن ۱۹۶۸ء سے جون ۱۹۷۰ء تک شروع کے دو سال جو سلیم نے ۹ پنجاب میں گزارے تھے ان کی یاد دو سال کے بعد بھی اور دوسری پلٹن میں چلے جانے کے باوجود تازہ تھی بلکہ شدید تر تھی۔ ۹ پنجاب کے افسروں سرداروں اور جوانوں میں سلیم کا نام اس طرح لیا جاتا تھا جیسا کہ وہ اب بھی ان کی پلٹن میں ہوں۔

سوال اس مقبولیت اور عزت کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔

جواب سلیم کی ہر دل عزیزی، مقبولیت اور عزت یقیناً ان کی شخصیت و کردار کی وجہ سے تھی جو کچھ میں نے دوسروں سے سنا اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بہت کھلے دل کے، کھلے ہاتھ کے، دلیر اور زندہ دل افسر تھے مجھے باسکٹ بال کا شوق ہے جب میں نے پلٹن کی باسکٹ بال ٹیم میں کھیلنا شروع کیا۔ اور اس کو منظم کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ یہاں بھی ہر کھلاڑی کی زبان پر سلیم اختر کا نام ہے۔

"صاحب! کیا بتائیں کبھی ہماری باسکٹ بال ٹیم لاجواب تھی" ایک کھلاڑی کہتا۔ پھر

دوسرے کی آواز آتی۔ جب لفٹین سلیم اختر صاحب ہماری ٹیم میں تھے تو ٹیم کی بات اور ہی تھی۔ ”تیسرا کہتا“ جناب، بڑا بے نظیر افسر تھا۔ ان کے ساتھ کھیلنے میں مزہ آتا تھا اسکور کرنے میں ماہر تھے۔

ان تبصروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ سلیم اختر بہت مقبول اور معروف تھے۔ میں نے ان کے کمانڈ اینڈ کنٹرول کی تعریف بھی سنی۔

ایک دوست کا تعزیتی خط

سلیم شہید کے ۲۱ پنجاب کے ایک دوست کیپٹن نعیم احمد سیفی نے ۱۲؍اکتوبر ۱۷۔ کو سلیم کی والدہ کو لکھا:

”کیپٹن سلیم کی شہادت سے یقیناً آپ کو انتہائی صدمہ پہنچا ہو گا اس غم میں، میں آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ مگر جس جواں مردی و دلیری سے ایک عظیم مقصد کے لئے میرے دوست نے جان کی بازی لگادی وہ ہم سب کے لئے بہترین مثال ہے۔ میں خود سلیم پر رشک کرتا ہوں۔ کاش ایسی شہادت اور رتبہ مجھے بھی نصیب ہو۔ جس روز سلیم یہاں سے اپنے مشن پر روانہ ہوئے وہ شب برات کا مبارک دن تھا اور جس دن شہادت پائی وہ جمعے کا دن تھا۔ عین نماز کا وقت۔ میرے دوست نے عین نماز کے وقت اپنا سر اللہ کے حضور جھکا دیا۔ اللہ اس کے درجات کو بلند کرے۔ سلیم بہت اچھے افسر اور بہت اچھے دوست تھے۔ حد درجہ ہنس مکھ ان کے دم سے یونٹ میں چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ انہیں یاد کر کے ہم سب اداس ہیں لیکن ان کا نقش قدم ہمارے سامنے بے روشن اور تابناک ہے“

۱۱؍اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ۲۱ پنجاب کے ایک اور افسر کیپٹن ظہور بٹ نے سلیم کی والدہ مکرمہ کو لکھا:

وہ صف اوّل کا مجاہد ایک گولی کھانے کے باوجود کہتا رہا کہ میری پروا نہ کرو۔ ایڈوانس جاری رکھو اور آخر کار باغیوں کے وار کو مردانہ وار سینے پر سہہ کر اس نے اپنی گراں قدر جان کو قوم و ملک و اسلام کی سالمیت اور بقا کے لئے قربان کر دیا۔

سلیم شہید کا خاندان

شہادت کے وقت سلیم شہید کی شادی نہیں ہوئی تھی گو ایک آدھ جگہ بات چل رہی تھی سلیم کے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں بڑے بھائی سعید اختر ملک فوج میں لیفٹیننٹ کرنل ہیں اور چھوٹے نعیم اختر ایک بنک میں ملازم ہیں۔ سلیم کا خاندان اب ساہیوال میں آباد ہے۔

حرف آخر

سلیم شہید کے بھائی سعید اختر نے سلیم کی نفسیات کے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قابل غور نکتہ ہے۔ جس چیز کو ضد، ہٹ، تندی، تیزی کہہ کر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اصل میں شخصیت کا وہی فولادی عنصر ہوتا ہے جو زندگی کے معرکوں میں کام آتا ہے۔ بچے کی انا اور اس کی تندی کا احترام کرنا چاہیئے۔ طالب علم کی انفرادیت اور اس کے جوش و جذبے کی سمت کا تعین تو ضروری ہے۔ لیکن اس کو دبانا مضر۔

کامل نہ اٹھا فرقہ زہاد سے کوئی
جو کچھ ہوئے یہی رندان قدح خوار ہوئے

سیکنڈ لیفٹیننٹ مشتاق نواز کیانی شہید

ایف ایف آر

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ــــــــــــ ۱۷؍جولائی ۱۹۵۰ء

جائے پیدائش ــــــــــــ کلڈانہ (مری)

کمیشن ــــــــــــ ۴۳ پی ایم اے

تاریخ شہادت ــــــــــــ ۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۱ء

شہادت کے وقت عمر ــــــــــــ ۲۱ سال

مقام شہادت ــــــــــــ دہلوئی سلہٹ مشرقی پاکستان

مدفن ــــــــــــ بدلوٹ (جہلم)

سیکنڈ لیفٹیننٹ مشتاق نواز کیانی شہید

ایف ایف آر

۷ اکتوبر ۱۹۷۱ء کی صبح ڈھاکہ ایئر پورٹ پر پی آئی اے کا جہاز ایک خصوصی پرواز کے لئے تیار کھڑا تھا۔ پی آئی اے ایک افسر مسٹر ظفر احمد خان جہاز کی سیڑھیوں کے قریب کھڑے تھے اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک پونے پانچ بجے ایک فوجی دستہ ٹرکوں سے اترا اور دیکھتے دیکھتے نہایت نظم و ضبط سے جہاز میں سوار ہو گیا۔ ظفر دستے کے کماندار نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ کو نہیں پہچان سکے لیکن جب کماندار نے "ہیلو! بھائی جان" کہہ کر ظفر کو مخاطب کیا تو ظفر کو خوشگوار حیرت ہوئی پھر انہوں نے پہچانا۔ یہ مشتاق تھا۔ ان کے ملٹری کالج کے زمانے کے دوست اور پی آئی اے کے ساتھی نثار کیانی کا چھوٹا بھائی۔ مشتاق کو کمیشن کے بعد ظفر نے پہلی بار دیکھا تھا وردی میں بڑا سمارٹ نظر آ رہا تھا۔ مبارک باد دی۔ جہاز نے پرواز شروع کی تو دونوں میں مشرقی پاکستان کے حالات پر باتیں ہونے لگیں۔ مشتاق جو پہلے کبھی کم گو ہوتا تھا۔ اب بڑے جوش سے کہہ رہا تھا "یہ معاملہ گہرا ہے۔ اس کے پیچھے ہندو ہے۔ یہ پاکستان کو توڑنے کی سازش ہے ہندو نے کبھی کھلے دل سے پاکستان کے وجود کو مانا ہی نہیں ہے۔ ۶۵ء میں مغربی محاذ پر ناکام ہونے کے بعد اب سیاسی شبخون مارا جا رہا ہے" ظفر بیچ میں بولے "پھر بھی ان حالات میں کیا مشرقی پاکستان کو بچانا مشکل نہیں ہوگا" "مشکل کیوں؟ یہ بازو کس لئے ہیں؟" مشتاق نے بڑے عزم و اعتماد سے جواب دیا" "وہ ٹھیک ہے۔ مشتاق، لیکن اندر سے بغاوت اور باہر سے

ہندوستانی فوج کا دباؤ۔ اس کا کیا توڑ ہو سکتا ہے'' اس کا توڑ ہے حوصلہ، عزم، ہمارے جیسے جی مشرقی پاکستان کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔

سلہٹ قریب آنے سے گفتگو کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا اور جب جہاز رن وے پر ٹھہر گیا اور جہاز کا دروازہ کھلنے لگا تو ظفر نے پوچھا۔

''تو پھر ڈھاکہ کب واپس آرہے ہو مشتاق؟''

اب تو ہمیں کوئی یہاں سے اٹھا کر ہی لے جائے گا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو مشتاق دلوئی پوسٹ سلہٹ کا جانبازانہ انداز میں دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گیا اور پھر اسے اٹھا کر ہی لایا گیا۔

مشتاق کی داستان شجاعت و شہادت پاکستان کی عسکری تاریخ کا ایک قابل فخر عنوان ہے۔ لیفٹیننٹ مشتاق کیانی شہید کی زندگی اور سیرت کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

خاندانی پس منظر

جہلم شہر سے دس میل شمال مشرق میں ٹلہ رینج زمیں ایک گاؤں ہے۔ بدلوٹ اس میں گکھڑوں کا ایک ممتاز خاندان آباد ہے جس کا پیشہ صدیوں سے سپہ گری رہا ہے۔ مشتاق نواز شہید کا تعلق بدلوٹ کے اس مشہور و ممتاز گکھڑ گھرانے سے تھا انہوں نے اپنے دادا راجہ فیروز خان کیانی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ راجہ فیروز خان کیانی بڑی آن بان اور سوجھ بوجھ کے آدمی تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے زور سے خود بنتے ہیں اور پھر سارے خاندان کو بناتے ہیں اور اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ راجہ فیروز خان ۱۹۰۱ء میں فوج میں بھرتی ہوئے پھر ترقی کرتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں وائسرائے کمیشن کے عہدیدار کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے جنگی خدمات کے صلے میں دو مربع زمین ملی تھی اور پنشن کے ساتھ جنگی انعام کی پنشن بھی شامل تھی۔ بڑے زبردست شہسوار تھے۔ نیزہ بازی کے بے شمار مقابلے جیتے۔ سیر و شکار کے شوقین لیکن ساتھ ہی دیندار

بھی تھے۔ دوبار حج کیا۔ الحاج ہوئے۔ بڑی عمر پائی۔ ۱۹۷۵ء میں ۹۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ آخری عمر تک چاق وچوبند رہے۔ بیٹوں اور پوتوں کی آب یاری کی۔ مشتاق کیانی کے یہ باباجی۔ مشتاق پر بڑے مہربان تھے ان کے جوش وجذبے سے مشتاق نے بہت کچھ سیکھا۔

والد اور بہن بھائی

مشتاق کیانی کے والد صوبیدار میجر حق نواز ایسٹ پاکستان رائفلز سے ۱۹۶۳ء میں واپس آکر بچوں کی تربیت اور زمینوں کی دیکھ بال میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنے والد کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دیندار ہمدرد اور خدا ترس بزرگ ہیں اپنے دو بھائیوں راجہ خداداد خان اور لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد ایس جے کی طرح ملٹری کے سابق طالب علم ہیں۔

مشتاق شہید کے چار بھائی اور ہیں سب سے بڑے افتخار کیانی۔ بی اے کر کے لندن میں کاروبار کرتے ہیں۔ دوسرے نثار کیانی ملٹری کالج میں پڑھتے ہیں۔ اب پی آئی اے میں ایک ممتاز عہدے پر فائز ہیں مشتاق شہید کے چھوٹے بھائی کا نام امجد کیانی ہے وہ بھی لندن میں ہیں سب سے چھوٹے نوید کیانی بی اے میں زیر تعلیم ہیں۔ مشتاق شہید کی کوئی بہن نہیں۔

پیدائش اور بچپن

مشتاق نواز کیانی شہید ۱۷ جولائی ۱۹۵۰ء کو کلڈنہ مری میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد صوبیدار میجر حق نواز کیانی سگنل میں تعینات تھے۔ پانچ برس کے ہوئے تو پشاور پبلک اسکول میں داخل ہوئے (چونکہ والد کی پوسٹنگ اس وقت پشاور میں تھی) پھر والد کے ساتھ پنڈی آگئے اور کینٹ پبلک سکول پنڈی میں کچھ دنوں تک پڑھا۔ ۱۹۵۷ء میں صوبیدار میجر حق نواز ریٹائر ہوئے تو مشتاق گورنمنٹ اسکول بدلوٹ میں پڑھنے لگے اسی زمانے میں باباجان راجہ فیروز خان سے مانوس ہوتے۔ وہ پرانے قصے سناتے جنگ اور شکار کے جنہیں مشتاق بہت

دلچسپی سے سنتے۔ ۱۹۵۹ء میں حق نواز کیانی صاحب نے ایسٹ پاکستان رائفلز کیلئے اپنی خدمات کی پیش کش کیں۔ تو مشتاق نے اصرار کیا "اباجی! میں بھی ساتھ جاؤں گا" گویا ایسٹ پاکستان کی مٹی اسے پکار رہی تھی۔ حق نواز کیانی کہتے ہیں کہ مجبوراً مجھے مشتاق کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لے جانے میں جھجک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشتاق نے اسی سال چھٹے درجے سے انگریزی شروع کی تھی اور ایسٹ پاکستان میں انگریزی تیسرے درجے سے شروع ہوتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ وہاں نہ چل سکے گا۔ بہر حال جب میں بدلوٹ کے اسکول سے استاد سے اس کا سرٹیفکیٹ لینے گیا تو اس کے کلاس ٹیچر ماسٹر محمد زمان نے مجھ سے کہا۔ راجہ صاحب! اس بچے کو اسکول سے نہ لے جائیں یہی تو ایک کام کا بلکہ دکھانے کا لڑکا ہے۔ میں نے مجبوری بتائی تو بڑی مشکل سے انہوں نے چھوڑا" حق نواز صاحب نے مزید کہا "میری توقع کے برخلاف، مشتاق نے بہت جلد اپنی انگریزی ٹھیک کر لی۔ اس حد تک کہ اس نے ملٹری کالج کے داخلے کا امتحان ماڈل ہائی سکول ڈھاکہ سے کامیابی سے پاس کیا۔ چنانچہ اپریل ۶۳ء کو وہ ملٹری کالج جہلم میں داخل ہو گیا"

ملٹری کالج کی طالب علمی کا زمانہ

مشتاق نواز کیانی ۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء کو ملٹری کالج میں داخل ہوئے کالج نمبر ۲۷۵۹ تھا داخلے کے وقت ان کی عمر ۱۲ سال آٹھ مہینے کی تھی۔

وہ ہاؤس جس میں مشتاق نے شروع کے تین سال گزارے ٹیپو سلطان ہاؤس تھا۔ جو اس زمانے میں ایک جونیئر ہاؤس تھا۔ مشتاق کو کالج کے ماحول سے ہم آہنگ ہوتے کچھ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملٹری کالج تو گویا اس کے خون میں تھا، باپ، بھائی، چچا، تایا، چچازاد سب یہیں پڑھے تھے اور ایک اور ماموں زاد بھائی رفیق کیانی اس وقت بھی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ یہ مشتاق کی خوش قسمتی تھا کہ ٹیپو سلطان ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر کیپٹن رحال

بریگیڈیر) اعجاز اکبر اور اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کیپٹن (حال کرنل) غلام سرور تھے۔ دونوں ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ ماہر تربیت بھی ہیں۔ ان دونوں سے مشتاق نے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا۔ ٹیپو سلطان ہاؤس کی تربیت نے مشتاق کی صلاحیتوں کو چمکا دیا۔ چنانچہ مشتاق کی پہلی سالانہ رپورٹ میں اعجاز اکبر صاحب نے بحیثیت ہاؤس ماسٹر کے لکھا:

"شائستہ اور ذمہ دار ہے۔ اسپورٹس اور کھیلوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتا ہے۔ ہاکی فٹ بال، اور کرکٹ کا ابھرتا ہوا کھلاڑی ہے۔ ڈراموں اور تقریروں میں دلچسپی ہے۔ ڈسپلن بہت اچھا ہے۔ اب تک کوئی شکایت کا موقعہ نہیں آیا۔ لیکن حساس ہے۔ جذباتی انداز میں سوچتا ہے پڑھائی میں اوسط درجے کا ہے"۔ نویں اور دسویں درجے کی رپورٹ بھی کم وبیش یہی تھی۔ اس اضافے کے ساتھ کہ اس میں گانے اور اسکاؤٹنگ سے دلچسپی کا ذکر بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق کو سائنسی مضامین سے کم دلچسپی تھی۔ فزکس کیمسٹری، فزیالوجی میں اس کا رزلٹ اچھا نہیں آتا تھا۔

جنوری ۱۹۶۶ء کے ٹیسٹ میں جو میٹرک کے امتحان سے پہلے ہوا تھا وہ ان تینوں مضامین میں فیل تھا۔ بہرحال کوشش جاری رہی اس اپریل کی موسم بہار کی چھٹیوں میں بھی وہ کالج ہی میں رہ کر میٹرک کے امتحان کی تیاری کرتا رہا بہرحال جب مئی ۶۶ء میں امتحان ہوا وہ فرسٹ ڈویژن لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ مشتاق کی فطرت تھی کہ وہ چیلنج کو ضرور قبول کرتا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد مشتاق نے آرٹس کے مضامین لئے اور محمود غزنوی ہاؤس میں (جو اس وقت سینئر ہاؤس تھا) چلے گئے۔ محمود غزنوی ہاؤس میں بھی مشتاق نے اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کی کارکردگی کو قائم رکھا اور کلاس پوزیشن کو بہت بہتر کر لیا اور کلاس میں دوم سوم آنے لگے۔ فرسٹ ائر کے سالانہ امتحان میں ان کی پوزیشن تیسری تھی فرسٹ ائر میں ان کے ہاؤس ماسٹر کیپٹن (حال کرنل) سیف الدین تھے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

فرماں بردار ہے اور ڈسپلن کا از خود پابند ہے۔ اہم نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا

ہے۔ کالج کے سالانہ اردو ڈرامہ میں اس نے کامیابی سے حصہ لیا۔ فٹ بال کرکٹ کا اچھا کھلاڑی بھی ہے۔ پڑھائی کے بارے میں سنجیدہ ہے بحیثیت مجموعی بہت اچھا کیڈٹ ہے"

مشتاق نواز نے ایف اے کا امتحان مئی ۱۹۶۸ء میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ ۱۰۰۰/۵۳۸ نمبر تھے۔ لیکن کالج میں سیکنڈ پوزیشن تھی جس کے لئے ایک انعام بھی ملا تھا۔ انعامی کتابوں میں ایک سیرت کی کتاب "محسن اعظم" بھی تھی جسے مشتاق نے بار بار پڑھا اور جو ابھی تک اس کے گھر میں اس کی یادگار کے طور پر محفوظ ہے"

ملٹری کالج میں مشتاق نواز کے کارنامے

مشتاق کو ڈراموں میں حصہ لینے کا خاص شوق تھا اور جو پارٹ بھی مل جاتا بڑے شوق سے اور انہماک سے کرتا۔ ٹیپو ہاؤس کے اس وقت کے اسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کیپٹن (اب کرنل) غلام سرور نے اپنے ایک مضمون میں "مشتاق کیانی شہید چند یادیں چند باتیں" میں لکھا ہے کہ کس طرح ایک بار اس سے ایک پیٹو سیٹھ کا کردار ادا کرنے کو کہا گیا۔ مشکل رول تھا لیکن مشتاق نے چیلنج کو قبول کرلیا اور اس خوبصورتی و مہارت سے پیٹو سیٹھ کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ سرور صاحب نے ایک پنجابی اسکٹ ساڑھے گھرتار آئی اے، کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جس میں مشتاق نے اسکول ماسٹر کا کردار ادا کیا اور کردار کا حق ادا کر دیا۔

مشتاق کو گانے کا شوق بھی تھا سرور صاحب نے ایک مزاحیہ قوالی کا ذکر کیا ہے۔ جو عدم کے مشہور شعر:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

کی پیروڈی تھی اور یوں شروع ہوتی تھی۔

شاید مجھے نکال کے کچھ "کھا" رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

مشتاق کا کام انترہ اٹھانا تھا۔ ساتھی تان اڑاتے تھے۔ مشتاق نے اتنے لہک لہک کر خالص قوالانہ انداز میں کان پر ہاتھ رکھ کے بول اٹھائے کہ قوالی میں جان پڑ گئی اور بقول سرور صاحب کے محفل کو لوٹ لیا۔ ڈراموں سے ماہرانہ دلچسپی مشتاق کو کالج کے ڈرامہ اسٹیج تک لے گئی۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے اردو ڈرامے میں مشتاق نے حصہ لیا اور ناظرین سے داد پائی۔

ڈراموں اور گانے کے علاوہ مشتاق خطابت میں بھی طاق تھا۔ ہاؤس اور کالج کے مباحثوں میں وہ حصہ لیتا تھا لیکن آنکھیں بند کرکے نہیں کہ جو موضوع مل جائے حق وصداقت کی پروا کیے بغیر اس کی حمایت یا مخالفت میں بولنے لگے محض حمایت کی خاطر موضوع کی حمایت اور محض مخالفت کی خاطر موضوع کی مخالفت کرے۔ جیسا کہ پیشہ ور مقرروں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ جو موضوع ملا۔ جس طرف سے ضرورت ہوئی بولنے لگے۔ خواہ اس وجہ سے کتنی ہی کٹ حجتی نہ کرنا پڑے۔

ایک بار اسے مخلوط تعلیم پاکستانی نوجوانوں کے لئے سم قاتل ہے۔ کے موضوع کے خلاف بولنے کو کہا گیا۔ اس نے معذرت کی موضوع کے خلاف بولنا میرے لئے ممکن نہیں البتہ اس کی حمایت میں بولنا شوق سے پسند کروں گا۔ چونکہ یہی میرا خیال ہے۔ اسی طرح اس نے اخلاقی انحطاط کے ذمہ دار ہمارے اساتذہ ہیں۔ کے موضوع پر حزب اقتدار کی طرف سے بولنے سے گریز کیا۔

مشتاق کا پسندیدہ موضوع تاریخ اسلام تھا۔ مشاہیر اسلام اس کے ہیرو تھے۔
کرنل سرور لکھتے ہیں۔

"مشتاق ہمیشہ ایسے موضوعات منتخب کرتا جن میں مردانگی کا پہلو نمایاں ہوتا۔ اسلاف کا تذکرہ کا تذکرہ چھڑتا تو بچے پر گداز کی کیفیت، طاری ہو جاتی۔ مشاہیر اسلام کے کردار سے وہ حد درجہ متاثر تھا۔ اس نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور حضرت سعد بن ابی وقاص کے جنگی کارناموں پر دو معرکہ الآرا تقاریر کالج اسٹیج سے پیش کیں

مجھے یاد پڑتا ہے۔ مشتاق کی ایک تقاریر کے اختتامیہ جملے کچھ یوں تھے،
میرے اللہ! تونے اسلام کے صدقے ہمیں یہ پاکستان کی مملکت عطا کی۔ ہمیں توفیق بخش کہ ہم تیرے اور تیرے حبیبؐ کے نام کو یہاں سربلند کرسکیں۔ اور اس مملکت میں تیرا قانون نافذ کرسکیں اس عمل میں اگر ہمیں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑے تو ہم حاضر ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے تری دی ہوئی زندگی اگر تری راہ میں کام آجائے تو اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہوسکتی ہے،،

ڈرامے اور تقاریر کا یہ دھنی کھیل کا مرد میدان بھی تھا۔ کھیل اس کے نزدیک کھیل تھا۔ جو انہیں تھا۔ کھیل کے میدان میں بھی وہ اپنے وقار اور حق پسندی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کرنل سرور نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ کس طرح پٹارو کیڈٹ کالج میں فٹ بال کے ایک میچ کے موقعہ پر ایک ناگوار صورت حال کو مشتاق نے اپنے تدبر اور جرأت سے بگڑنے سے بچالیا۔

پی ایم اے اور اس کے بعد

نومبر ۱۹۶۸ء میں مشتاق پی ایم اے ۴۳ ویں لانگ کورس کے لئے منتخب ہوئے اور اکتوبر ۱۹۷۰ء میں کمیشن لیا۔ کمیشن کے بعد اپنی خواہش سے انفنٹری میں گئے اور ۳۰ ایف ایف آر میں تعینات کردیئے گئے جو اس وقت کراچی میں تھی مارچ ۱۹۷۱ء میں ان کی یونٹ کو مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا۔

مشرقی پاکستان ان دنوں اندرونی خلفشار کی زد میں تھا اور وہاں جانا خطرے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ کراچی میں مشتاق کے چچازاد بھائی میجر (اب کرنل) منور حسین متعین تھے۔ ڈھاکہ پرواز کرنے سے پہلے مشتاق ان کے گھر گئے تو میجر منور کی بیگم نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو مشتاق نے بہ کمال اطمینان کہا "آپا میرا کیا ہے، میں اکیلا ہوں میں ہر مرحلے سے گزر سکتا ہوں۔ اگر میرے بجائے بھائی جان کو جانا پڑتا تو آپ کیا کرتیں؟ آپ کے تو چھوٹے چھوٹے

بچے ہیں۔آپ میری فکر نہ کیجئے ایک بات ضرور کہوں گا۔

انہوں نے پوچھا۔کیا؟

"مشتاق نے کہا۔آپا میری امی کی کوئی بیٹی نہیں ہے آپ ہی بیٹی ہیں ذرا ان کا خیال رکھیئے گا۔"

یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مشتاق۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ہاں آپا بس دعا کرو۔میں ہر امتحان میں پورا اتروں۔موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔یہ پہلا اشارہ تھا کہ مشتاق کا لاشعوری جذبۂ شہادت ان کو اپنی منزل کی طرف بلا رہا تھا۔

شہادت کی طرف

مارچ ۱۹۷۱ء میں مشتاق اپنی یونٹ کے ساتھ مشرقی پاکستان پہنچ گئے اور اس دور میں جب وہاں بغاوت کی سی صورت تھی مشتاق انتہائی شوق سے ملکی سالمیت کے تحفظ کی خاطر مصروف کارزار رہے۔شاید کسی اور کے لئے یہ تگ ودو محض ایک رسمی فرض کی بجا آوری ہوتی۔ لیکن مشتاق کا یہ رویہ ذاتی جوش وجذبے کا تھا۔وہ میدان کارزار سے بچنا نہیں اس میں شامل ہونا چاہتے تھے ان ہی حالات میں مشتاق کی بٹالین کو سلہٹ جانے کا حکم ملا۔یہ اوائل اکتوبر ۱۹۷۱ء کی بات ہے اپنے جوانوں کے ساتھ مشتاق بھی پی۔آئی۔اے کی ایک پرواز سے سلہٹ روانہ ہوئے۔ڈھاکہ سے سلہٹ تک کی اس پرواز میں مشتاق کے بھائی نثار کے ایک دوست اور ساتھی ظفر احمد خان پی آئی اے کے ایک افسر کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے۔جب جہاز سلہٹ ایئرپورٹ پر اترا تو سخت حفاظتی اقدامات تھے بالکل جنگ کا ساسماں تھا۔ایک پُرخوف سناٹا چھایا ہوا تھا جسے بھاری بوٹوں کی تھاپ ہی کبھی کبھی توڑتی تھی۔ہر طرف سرگوشی ہو رہی تھی کہ حالات بہت خراب ہیں سلہٹ ہندوستانی حملے کی زد میں ہے۔

جب ائیرپورٹ سے مشتاق اور ان کے جوان گاڑیوں میں سوار ہونے لگے تو مشتاق

نے ظفر صاحب کا بڑا شکریہ ادا کیا۔ گلے ملے یوں ٹوٹ کر جیسے اب کے بچھڑے پھر کبھی نہیں ملیں گے۔

ظفر صاحب نے پوچھا۔

اب ڈھاکہ کب واپس جائیں گے؟

اب تو ہمیں کوئی یہاں سے کندھوں پر اٹھا کر ہی لے جائے گا۔ مشتاق نے مسکرا کر اطمینان سے کہا۔

مشتاق سلہٹ میں

مشتاق کی پلٹن ۳۰ ایف ایف آر سلہٹ سیکٹر میں سرحدی دفاع پر مامور تھی۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر مولوی بازار میں تھا جو سلہٹ سے ۳۲ میل دور ہے اور پلٹن کا ہیڈ کوارٹر سری منگل تھا۔ جو مولوی بازار سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ تمام علاقہ مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے تخت وتاراج کی زد میں تھا۔ دلوئی یا ڈھلوائی پوسٹ کے دفاع پر مشتاق کی کمپنی متعین تھی۔

شہادت سے ذرا پہلے

۲۵ر اکتوبر ۷۱ء کو مشتاق اپنے چچا میجر ارشد کیانی سے ملنے سلہٹ آئے روزے تھے۔ افطار اور نماز کے بعد واپس دلائی پوسٹ پر چلے گئے۔ مشتاق کو آنے والے لمحے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ۲۷ر اکتوبر ۷۱ء کو انہوں نے تمام قریبی عزیزوں کو الوداعی خطوط لکھے۔

شہادت کی صبح

مشتاق کیانی ۳۰ ایف ایف آر کی "بی" کمپنی میں تھے ہم تے "بی" کمپنی کے کمانڈر اور

میجر احسان قادر سے رابطہ قائم کیا کہ وہ ہمیں مشتاق کے ایکشن کی چشم دید تفصیلات بتائیں اور مشتاق کیانی کے آخری لمحوں کی روئداد سنائیں۔

میجر احسان قادر جو ملٹری کالج کے اولڈ بوائے ہیں خود بھی ۷۱ء کی جنگ میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان کے سر میں اب بھی ایک گولی پیوست ہے انہوں نے جو کچھ بیان کیا وہ کالج کے ایک اور اولڈ بوائے راجہ جمیل اختر نے ہمیں لکھ کر بھیجا اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

۳۰ ایف ایف آر کی بی کمپنی جو بہادر کمپنی کہلاتی تھی بریگیڈ کے لڑاکا ہراوّل دستے میں شامل تھی یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ کمپنی میرے زیر کمان تھی لیفٹیننٹ مشتاق کیانی اس بہادر کمپنی کی ایک پلاٹون کے کمانڈر تھے ۲۷ اکتوبر ۷۱ء کو بہادر کمپنی کو حکم ملا کہ چھاتک کے علاقے کو باغیوں سے صاف کرے۔ جب میں بلٹن کے ہیڈ کوارٹر چھاتک (ضلع سلہٹ) سے سری منگل جہاں بہادر کمپنی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ہماری بٹالین کی سی کمپنی کا ہندوستانی دشمنوں سے ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ کمانڈنگ افسر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں لڑاکا بی کمپنی کی پلاٹون "سی" کمپنی کی مدد کے لئے بھیجوں۔

لیفٹیننٹ مشتاق نے ازخود والنٹیر ہو کر کہا کہ میں اپنی پلاٹون سی کمپنی کی کمک کے لئے لے جاؤں گا۔ چنانچہ مشتاق اپنی پلاٹون لے کر سری منگل سے دلائی پوسٹ پہنچ گئے۔ اس وقت اس چوکی پر ایک ہندوستانی ڈویژن کا توپخانہ شدید گولہ باری کر رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستانیوں نے ایک بریگیڈ کی قوت کا حملہ دو بلٹنوں سیکنڈ جاٹ اور پانچ گمایوں اور چھاپہ ماروں کی مدد سے شروع کر رکھا تھا۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ میں نے ۶۵ء کی جنگ بھی دیکھی تھی۔ پھر ۷۱ء کی جنگ بھی لڑی گولہ باری کی جو شدت اس دلائی پوسٹ پر تھی وہ ان دونوں جنگوں میں کم از کم میرے تجربے میں تو نہیں آئی۔ یہ بڑا ہندوستانی حملہ بڑی حد تک پسپا کر دیا گیا۔ پھر بھی وہ ایک دو سیکشن کی پوزیشنوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

چونکہ میری کمپنی کی ایک پلاٹون مشتاق کے زیر کمان دلائی کے دفاع میں "سی" کمپنی

کی مدد کر رہی تھی اس لئے میں نے اپنا ہیڈ کوارٹر دلائی منتقل کر لیا۔

۳۱ اکتوبر ۷۱ء کو کوئی ۱۰ بجے میں نے وائرلیس پر مشتاق سے صورت حال کے متعلق بات کی۔ مشتاق نے کہا چند پوزیشنوں پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے میں جوابی حملے کی تیاری کر رہا ہوں۔ تاکہ ان پر ہمارا دوبارہ قبضہ ہو سکے۔ میں نے مشتاق سے انتظار کرنے کو کہا میں نے مزید کہا کہ میں ۴۵ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ وائرلیس ہی پر مشتاق نے مجھے بتایا کہ آپ کے پہنچنے سے پہلے انشاء اللہ یہ پوزیشنیں ہمارے قبضے میں ہوں گی۔ جس لب و لہجے میں مشتاق نے اس عزم کا اظہار کیا اس سے مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس حالت میں جوابی حملہ کرنا اور کامیابی حاصل کرنا تقریباً ناممکن کام تھا۔ دشمن اور ہماری نسبت دس اور ایک کی تھی۔ جس وقت مشتاق مجھ سے بات کر رہا تھا ٹھیک اس وقت ہماری پلٹن کے کمانڈنگ افسر سے "سی" کمپنی کی طرف درخواست ہو رہی تھی کہ مزید ایک کمپنی کی کمک فوری طور پر بھیجی جائے تاکہ پوزیشنوں کی واگزاری کے لئے حملہ کیا جا سکے بظاہر یہ مطالبہ عام معیاروں سے معقول ہی تھا لیکن مشتاق کی فراست اور جرأت نے اسے بتا دیا تھا کہ جوابی حملے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے چنانچہ اس نے سی کمپنی کے کمانڈر سے کہا اگر ہم کمک کا انتظار کرتے رہے تو اس سے بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا اور ہندوستانی اپنی پوزیشنیں مضبوط کر لیں گے میں ہیڈ کوارٹر سے اجازت لیتا ہوں انشاء اللہ بہت جلد چوکی دوبارہ ہمارے قبضے میں ہو گی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے بات نہ ہو سکی تو مشتاق نے وقت ضائع کئے بغیر ایک جرأتمندانہ فیصلہ کیا اور جوابی حملہ داغ دیا۔ مشتاق کے پاس صرف ۱۲ کی نفری تھی۔ بظاہر اس نفری سے چوکی پر قبضہ کرنا ناممکن سا تھا۔ لیکن جب فراست ہو۔ جرأت و ہمت ہو، ایمان کی قوت ہو تو ناممکن کام ہو جاتا ہے۔ مشتاق اور اس کے جوان بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کو وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ہمارے جوانوں نے دشمن کو اس کی خندقوں میں جا لیا۔ دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ اس معرکے میں دشمن کا

ایک کیپٹن ایک جے سی او اور ستره ادر رینک کام آئے (جن کی لاشیں بعد کو بی کمپنی نے اٹھائیں) لیکن خود مشتاق ایک گرنیڈ پھینکتے ہوئے ایک مشین گن برسٹ سے مہلک طور پہ زخمی ہوئے۔ جب میں میدان کارزار میں پہنچا تو مشتاق کو ایک انڈین خندق پہ پڑے ہوئے پایا۔ وہ اپنے آخری دشمن کو اپنا نشانہ بنا چکے تھے۔ لیکن خود بھی ایم جی فائر کا شکار ہو گئے تھے۔ مشتاق کا بایاں بازو اور چہرہ برسٹ کی زد میں آئے تھے ابھی ان میں سانس تھی آنکھوں میں چمک اور عزم بھی۔ میں نے فوراً اٹھا کر جیپ میں رکھا مشتاق کا سر میری آغوش میں تھا۔ میں نے اس کی خون آلودہ پیشانی کو چوما آواز دی مشتاق۔ مشتاق نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ ہونٹ ہلے اور پھر سر ڈھلک گیا۔''

دلائی پوسٹ کے اس ہیرو کے آخری لمحات کے بارے میں ایک اور روایت یہ ہے۔

لیفٹیننٹ مشتاق کیانی نے دو گرنیڈ جو ان پر پھینکے گئے تھے اٹھا کر دشمن پر پھینک دیئے۔ تیسرا گرنیڈ بیشتر اس کے کہ وہ اسے دشمن پر پھینکتے وہ پھٹ گیا اس سے ان کا نچلا جبڑا سخت زخمی ہو گیا اس کے ساتھ ہی مشین گن کی دو بوچھاڑیں ان کے سینے اور بائیں بازو پر پڑیں پھر انہیں خندق میں پہنچایا گیا۔ ابھی ہوش میں تھے۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اپنے نائب صوبیدار حبیب اللہ سے اشارہ سے کہا کہ میری گھڑی اتار لو اور نوٹ بک نکال لو۔ مشتاق کا ایک جوان بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ ڈاکٹر سے کہا کہ جوان کی جان بچاؤ۔ میں نہیں بچوں گا۔ مجھے شوٹ کر دو۔ بولنا مشکل تھا لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک ہمت و حوصلے کی باتیں کرتے رہے۔

صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ

مشتاق کی یہ جرأت اور فراست پاکستان کی عسکری تاریخ میں ایک مثالی اقدام کے طور پر ہمیشہ یاد رہے گی۔ شہادت کے وقت مشتاق روزے سے تھے رمضان کی دس تاریخ تھی اور اکتوبر ۱۹۷۱ء کی ۱۳ تاریخ دس بجے صبح زخمی ہوئے تھے پلٹن کے ہیڈ کوارٹر سری منگل بیلتے ہوئے دو میل ادھر آخری سانس لی۔

شہادت کے بعد

مشتاق کے ایک چچا میجر ارشد کیانی نے جو وہاں موجود تھے اور دوسرے افسروں نے پورے اعزاز کے ساتھ مشتاق کو مولوی بازار سلہٹ میں امانتاً دفن کر دیا۔ یکم نومبر ۱۹۷۱ء کو یہ خبر والدین کو پہنچی اور اسی دن مشتاق کا ۲۷ اکتوبر کو لکھا ہوا خط ماموں زاد بھائی جمیل کے نام آیا کہ بھائی میری امی کا خیال رکھنا اس خط کو دیکھ کر اور بھی کہرام مچ گیا۔ سارے عزیز آبائی گاؤں بدلوٹ میں جمع ہوئے وہیں غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ چونکہ بڑے بھائی نثار لندن میں تھے انہیں ڈھاکہ مشتاق سے ملنے جانا تھا انہیں کراچی دفتر سے اطلاع کروائی گئی کہ سیدھے گاؤں آئیں۔ ادھر جب نثار کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ دیوانہ وار ڈھاکہ پہنچے وہاں سے جیسے تیسے حکام کو راضی کیا کہ مشتاق کو ڈھاکہ میں دفن کرنے دیا جائے چنانچہ مشتاق شہید کے تابوت کو ڈھاکہ ائرپورٹ پر لے آئے۔ وہاں سے اللہ نے مدد کی اور ناممکن بناتے ہوئے تابوت کراچی، کراچی سے اسلام آباد اور وہاں سے بدلوٹ لایا گیا۔ دوسرے اتوار کو مشتاق کا جسد خاکی اس کے والدین کے ہاتھوں میں تھا۔ سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

شہادت سلہٹ میں اور کفن دفن بدلوٹ میں۔ یہ بھی محبت کا معجزہ تھا جب سب قبر پر مٹی ڈال چکے فاتحہ ہو چکی تو پی آئی اے کے ظفر صاحب نے حاضرین کو پکار کر جمع کیا اور سلہٹ ایئرپورٹ پر مشتاق سے اپنی آخری ملاقات کے وقت مشتاق کے لفظ دہرائے "اب تو ہمیں کوئی کندھوں پر اٹھا کر لائے گا"

ان الفاظ سے، اور اس سے پہلے ڈھاکہ جاتے ہوئے کراچی میں جو مشتاق نے کرنل منور کی بیگم سے کہا تھا آپا جی میری کوئی بہن نہیں ہے تم میری ماں کا خیال رکھنا اور پھر ۲۷ اکتوبر کے خط سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ مشتاق شہید کو شہادت کی آرزو بے چین کر رہی تھی اور اسے لاشعوری طور پر احساس ہو گیا تھا کہ شہادت کا وقت آن پہنچا ہے۔

والدہ کا خواب

مشتاق کی شہادت سے کچھ دن پہلے مشتاق کی والدہ نے ایک خواب دیکھا کاؤں میں مشتاق کہیں دور سے آیا ہے۔ گلے سے ننگا ہے مجھے پیارا ہیں آگے بڑھی تو نزدیک کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہیں بھاگ کر کنویں پر پہنچی کہ کسی طرح اسے باہر نکالوں لیکن یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ کنویں میں ایک نہیں بیسیوں کٹے ہوئے سر تیر رہے ہیں میں چارپار ترکاؤں والوں کو بلانے لگی اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

یہ خوفناک خواب دیکھ کر مشتاق کی والدہ بہت گھبرا گئیں حق نواز صاحب سے اپنا خواب بیان کیا حیرت تو انہیں بھی ہوئی لیکن کسی طور انہیں دلاسہ دینے اپنے بھائی کرنل رشید کے گھر لے گئے وہاں کچھ تسلی ہوئی لیکن دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔

والد کے تاثرات

مشتاق کے والد حق نواز خان صاحب سے جب ہم نے اس تذکرے کے لئے انٹرویو لیا تو یہ درخواست بھی کی آپ مشتاق نواز کے دو چار ایسے واقعات بتاتے جس سے اس کی شخصیت و کردار پر روشنی پڑتی ہو۔ تو انہوں نے مندرجہ ذیل دو تین واقعات بیان کئے۔

"میرے بچے اور بھی ہیں لیکن مشتاق اپنی عادات اور خصائل میں بچپن ہی میں دوسروں سے مختلف تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی مٹی ہی اور تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کی سمجھ اور ہمدردی کے دو واقعات سناتا ہوں۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے کہ میری پوسٹنگ پشاور میں تھی مشتاق چار پانچ برس کا ہوگا اس نے ابھی ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا۔ ایک روز وہ اسکول سے بھاگ آیا۔ ماں نے پوچھا کیوں آئے۔ بچہ تھا کیا جواب دیتا چپ ہو رہا۔ ماں نے کہا تیرے باپ مجھ سے ناراض ہوں گے کیوں آنے دیا۔ یہ سنتے ہی مشتاق ایک دم چونک

پڑا اور کہا۔ میری وجہ سے آپ پر ناراض ہوں گے؟ اچھا میں ابھی جاتا ہوں۔ خود ہی اردلی کو ساتھ لیا اور اسکول واپس چلا گیا۔"

دوسرا واقعہ ڈھاکہ کا ہے۔ ای۔پی۔آر کے سگنل ونگ میں تھا۔ ۱۹۶۲ء کی بات ہے ہم چھاؤنی میں رہتے تھے۔ مشتاق کو کھیلنے کا شوق تھا اکثر ساتھ کے کوارٹرز کے دوسرے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا رہتا تھا۔ ایک روز مجھے خبر ملی کہ بعض دوسرے لڑکوں نے مشتاق کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ کچھ مارا پیٹا ہو گا مجھے بہت غصہ آیا اور فکر ہوئی مشتاق آیا تو میں نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے اس کو میرے لہجے سے میرے غصے کا اندازہ ہوا ہو گا کہنے لگا نہیں ابا جی نہیں کوئی خاص جھگڑا نہیں کھیل کھیل کی بات تھی۔ آپ ان لڑکوں سے یا ان کے والدین سے کچھ نہ کہیئے گا مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ حق نواز صاحب یہ واقعہ سنا کر کہنے لگے اس طرح کے ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی شریف النفس اور سعادت مند تھا۔" اس پر ہم نے پوچھا کہ بچہ آخر بچہ ہوتا ہے کبھی اس نے کوئی ضد یا شرارت تو کی ہو گی۔ "ہاں کیوں نہیں" حق نواز صاحب نے جواب دیا۔ اور پھر خود ہی یہ واقعہ بیان کیا۔" گاؤں میں کھانے پینے پھلوں وغیرہ کی ایک آدھ دکان ہی ہوتی ہے ایک بار دکان پر آم آئے جلد ختم ہو گئے ہم وقت پر منگوا نہ سکے۔ مشتاق ضد کر گیا کہ لوں گا تو ابھی لوں گا۔ سخت گرمی اور دوپہر کا وقت تھا۔ گھر سے باہر نکلنا مشکل۔ بابا جان نے بھی سمجھایا لیکن مشتاق پر جیسے بھوت سوار تھا اس نے ایسی ضد کبھی نہیں کی تھی۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے کسی کو شہر بھیجا وہاں سے آم آئے تو مشتاق ایک دم بدل گیا۔ خوش ہو کر امی سے لاڈ کرنے لگا۔ میری پیاری امی کتنی اچھی ہیں، آپ لیکن ایسی ضد مشتاق شاذ و نادر ہی کرتا تھا

ایک ہم سبق کی رائے

ایثار کرنا مشتاق نواز کی سرشت میں تھا۔

میجر شاہد احمد (کالج نمبر ۳۰۲۳) لکھتے ہیں۔

میں اور مشتاق ایک ہی کلاس اور ایک ہاؤس (محمود غزنوی ہاؤس) میں تھے۔ ہر وقت کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ زیادہ بے تکلفی ہو تو ایک دوسرے کی خامیاں بھی زیادہ سامنے آتی ہیں۔ لیکن مشتاق کے بارے میں، میں یہ کہوں گا کہ اس کے قریب ہونے سے اس کی خوبیاں زیادہ میرے علم میں آئیں۔ اور میں خاموشی سے اس کی عزت کرنے لگا۔ ایک واقعہ آج بھی میرے ذہن میں زیادہ ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔

ہوا یوں کہ ہمارے وقتوں میں (۶۷-۱۹۶۶ء) ویک اینڈ ذرا مشکل ہی سے ملتا تھا۔ اس لئے جب ملتا تو زیادہ خوشی ہوتی۔ ایک بار مجھے بڑی تگ و دو کے بعد ویک اینڈ ملا۔ ہفتے کو ہاف ڈے ہوتا تھا جوں توں کر کے میں نے پانچ پریڈ گزارے آخری گھنٹی بجتے ہی میں ہاؤس کی طرف بھاگا تاکہ جلد سے جلد گھر روانہ ہو سکوں۔ ہاؤس پہنچ کر لنچ کا انتظار بھی نہ کیا۔ اب لاکر سے جو پرس میں نے نکالا تو وہ تقریباً خالی۔ دو تین روپے پڑے تھے۔ پیسے تو میں سارے خرچ کر چکا تھا۔ یا اللہ اب کیا ہو۔ بڑی بھاگ دوڑ کی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ میں ڈارم میں اداس اور پریشان بیٹھا تھا کہ مشتاق آیا اور آتے ہی دو نوٹ ایک دس کا ایک پانچ کا میرے حوالے کئے کہنے لگا لے "یار تو تو چل۔ عیش کر۔ اپنا کام تو نہیں بنا۔ میں نے کہا کیوں؟ تیرا ویک اینڈ تو پچھلے ہفتے ہی منظور ہو گیا تھا۔ مشتاق نے لاپرواہی سے کہا۔ ہاں ہو گیا تھا۔ لیکن گھر سے خط آ گیا۔ اگلے اتوار بھائی نثار کراچی سے آ رہے ہیں اس وقت جاؤں گا۔"

میں نے کہا او کے "ڈیر! پیسے جیب میں ڈالے اور چل کھڑا ہوا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ شہر میں مجھے مشتاق کے وہی بھائی نثار جنہیں کراچی سے آنا تھا ملے۔ کہنے لگے "یہ کیا بات ہے مشتاق نہیں آیا۔ اس نے بس کے اڈے پر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ بدلوٹ جانا ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ مشتاق اگلے ہفتے آئے گا۔ جب میں واپس آیا تو میں نے پوچھا "کیوں استاد! یہ کیا چکر ہے تمہارے کراچی والے بھائی نثار تو اڈہ لاریاں پر کھڑے تھے"، مشتاق ہنس پڑا۔

بات ٹال کر کہنے لگا "گھر سے کچھ لایا ہو تو نکال۔ بڑی بھوک لگی ہے۔" تو جناب یہ تھا۔ مشتاق نواز۔ یاروں کا یار، ہمدرد، غمگسار اور دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والا۔

مشتاق نواز تعزیتی خطوط کے آئینے میں

مشتاق ۱۳؍اکتوبر ۱۹۷۱ء کو شہید ہوا تھا یکم نومبر ۷۱ء کو اس کے چچا میجر ارشد کیانی نے لکھا،

بھائی جان حق نواز — سلہٹ

۱؍نومبر ۷۱ء

السلام علیکم! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ لیفٹیننٹ مشتاق کی شہادت پر افسوس کر سکوں یہ پچھلے تین دن سے مجھ پر ایسی کیفیت ہے۔ مشتاق مجھ سے تین دن پہلے مل کر گیا تھا۔ اس کی پوزیشن مجھ سے ۵۳ میل کے فاصلے پر تھی۔ کل دن کے ۱۱ بجے مجھے وائرلیس پر پتہ چلا کہ وہ بہت زخمی ہوا ہے میں یہاں سے جیپ لے کر آگے بٹالین ہیڈکوارٹر میں گیا۔ ہندوستانی توپیں لگاتار فائر کر رہی تھیں۔ ہم نے ڈاکٹر کو اگلی پوزیشن پر بھیجا لیکن واپسی کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ مشتاق کو اتنی سخت گولیاں لگی تھیں کہ واپس بٹالین ہیڈکوارٹر پہنچنے سے دو میل پہلے وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میں نے خود مشتاق کو دیکھا ہے لیکن خدا کو کچھ ایسے ہی منظور تھا۔ جنازہ ہم نے سری منگل میں پڑھا اور مولوی بازار میں بریگیڈ کے قبرستان میں دفن کیا۔

میں کل رات کے بارہ بجے تک مشتاق کی قبر پر رہا۔ اور پھر رات کے دو بجے واپس سلہٹ آیا۔ امانت کے طور پر دفن کیا گیا ہے۔ مشتاق کے ساتھ اس کی یونٹ کے چار سپاہی بھی شہید ہوئے ہیں۔ پھر بعد میں مشتاق کا کمپنی کمانڈر میجر جاوید بھی شہید ہوا۔ جو کہ ابھی تک فارورڈ پوزیشن ہی پر ہے۔ خدا اس کی روح کو سکون اور جنت الفردوس عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ تین دن پہلے میں نے مشتاق کو یہاں اپنے پاس سلہٹ میں بلایا۔ پورا دن میرے پاس رہا اور شام کو واپس بٹالین میں گیا۔ جب خیال آتا ہے آنسو نکل آتے

ہیں۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی کہ اس سے بات کرلوں لیکن میرے پہنچنے سے پہلے وہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ خدا کو ملاپ منظور نہ تھا۔ حالانکہ میں بہت جلدی تقریباً ۰ ۱ میل کا فاصلہ طے کرکے اس کے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ جو پوزیشن دشمن نے لے لی تھی۔ اس پر مشتاق نے حملہ کیا اور دوبارہ پوزیشن لے لی۔ لیکن اس پوزیشن پر مشین گن کے دو برسٹ اس کو لگے پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور تیسرا برسٹ پھر لگا۔ یہ شہادت ماہِ رمضان کی ہے اور اس بہادر کی جس نے پاکستان اور اپنے خاندان کی روایات کے مطابق دشمن سے ہار نہیں مانی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچھ بول سکوں۔ یونٹ کے تمام جوان اور افسر مشتاق کے لئے روتے ہیں۔ اس نے کام ہی ایسا بہادری کا کیا ہے کہ کوئی نہیں بھول سکتا۔

اچھا خدا حافظ

فقط آپ کا تابعدار

بھائی ارشد

اسی دن شام کو مشتاق کی پلٹن کے افسر کیپٹن خسرو فرید نے شدید جذبات سے لبریز خط لکھا۔ اس خط کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ فرید خود بھی تھوڑے دنوں بعد مشرقی پاکستان میں شہید ہوگئے۔ فرید ملٹری کالج کے ایک اولڈ بوائے میجر فرید کے بیٹے تھے۔

بزرگوارم

مجھے پتہ نہیں چلتا کہ میں یہ چند لکیریں آپ کی طرف کس طرح لکھوں۔ میرا نام خسرو فرید ہے اور میں مشتاق کی پلٹن کا افسر ہوں۔ مشتاق میرا بے حد عزیز دوست اور بھائیوں کی جگہ پر تھا۔ بس اسی تعلق کی بنا پر میں نے آپ کے دکھ کو شدت سے محسوس کیا۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ لوگ مشتاق کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ خدا نے اس کو آپ سے چھین لیا اور آپ کی امیدیں اور حسرتیں جو برادرم مشتاق

سے وابستہ تھیں۔ پوری نہ ہو سکیں۔ سوائے اس کے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کی چیز تھی جو اللہ نے ہم سے لے لی۔ جب سے ہم ادھر آئے ہیں ہمیں بھی مشتاق کے ساتھ اچھی طرح اٹھنے بیٹھنے کا موقعہ نہ ملا اور وہ ہمیشہ ہی ہم سے دور رہا۔

مشتاق کا بدلہ لیتے ہوئے ہم سے ایک اور اعلیٰ کردار اور دلیر افسر جدا ہو گیا اور اس کے علاوہ جتنے لوگوں نے جان دی ہیں اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں اور میری پلٹن کے تمام افسر مشتاق کے دکھ میں آپ کے برابر کے شریک ہیں مشتاق کا افسوس پوری پلٹن کے جوانوں کو ہے۔ کاش آپ دیکھ سکتے کہ آپ کے بیٹے کا افسوس ہم لوگوں کو کتنا ہے اور ہم اس کی خاطر کتنا روتے ہیں۔ مشتاق نے اپنے خاندان اور قوم کی عزت کو بہت بلند کیا ہے ہم یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ پتلا دبلا بچہ اتنا نڈر اور دلیر ہو سکتا ہے۔ آپ کو مشتاق کے ایکشن کی تفصیل پہنچ گئی ہو گی۔ مختصراً اس نے دو سو ہندوستانی فوجیوں پر تقریباً ۱۲ جوانوں سے حملہ کر کے مورچے خالی کروا دیئے اور اس حملے کے دوران ایک گولی چھاتی پر اور ایک برسٹ چہرے پر کھایا ایک گرنیڈ اس کے ہاتھ میں پھٹ گیا۔

آپ اپنے بچے پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے اس شیر پر ہزاروں نشان حیدر قربان اور اس بچے کے قدموں کی دھول پر ہم قربان اس کے پاؤں کے نشان چومنے کے لئے قربان، جب تک ہم لوگ زندہ ہیں مشتاق کی شہادت ہمارے دل گرماتے رہے گی اور ہم اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ مشتاق کی روح پر ہزاروں درود اور سلام۔ اس کی روح پر فرشتے بھی درود اور سلام بھیجتے ہوں گے۔

آپ کا تابعدار

خسرو فرید

---

۳۰ ایف ایف کے میجر سیف الرحمٰن آفریدی نے لکھا:

۳۰ ایف ایف

معرفت

ایچ۔ بی۔ پی۔ او

مشرقی پاکستان

محترم حق نواز صاحب

سلام و آداب

مجھے اور میری پلٹن کے ہر فرد کو دلی دکھ ہے کہ مشتاق نواز صاحب ہم سے جدا ہوتے اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین مشتاق نواز میرے ساتھ ایک جگہ اس پلٹن میں آیا تھا اور ہم دونوں ایک ساتھ اکھٹے رہے مشتاق نواز نے اس جرأت سے دشمن پر حملہ کیا کہ وہ سب اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور خود کو ملک کے نام و ناموس کے لئے قربانی دی۔ خدا اس کی روح کو ہمیشہ خوش رکھے آمین ثم آمین۔ ہم سب اس کی تا زندگی یاد رکھیں گے اور ہمارے دلوں سے اس کی یاد کبھی نہ نکلے گی۔ خدا آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

آپ کا

میجر سیف الرحمٰن آفریدی

۳۰ ایف ایف

آخر میں مشتاق نواز کے ایک گمنام پرستاران کے ایک اردلی کا خط نقل کرنا ضروری ہے یہ سپاہی تھوڑے عرصے کے لئے مشتاق کا اردلی رہا تھا اس کے کھرے اور سچے جذبات دیکھئے یہ خط مشتاق کے کردار پر سب سے زیادہ صحیح دستاویز ہے۔ اس کے بعد اسے کسی تعریف کی ضرورت

نہیں اصل تعریف وہ ہے جو کوئی ماتحت بے غرضی سے بے لوثی سے بغیر کسی ڈر کے بغیر کسی لالچ کے کرے۔

از راولہ ٹلی پارہ   از محمد ایاز

بحضور جناب میرے پیارے کمانڈنگ آفیسر سیکنڈ لیفٹیننٹ مشتاق نواز صاحب

السلام علیکم زیادہ دعا اور آداب کے بعد عرض یہ ہے کہ میں خیریت کے ساتھ ہوں اور آپ کی خیریت اللہ تعالیٰ سے نیک چاہتا ہوں۔ دیگر صورت احوال آنکہ جناب میرے پیارے کمانڈر آفیسر مشتاق نواز صاحب تین چار مہینے ہونے والے ہیں کہ میں نے آپ کو نہیں دیکھا ہے اور نہ مجھے پتہ ہے کہ آپ کون سی جگہ پر ہیں جناب میرے پیارے کمانڈنگ آفیسر آپ کے ساتھ جدا ہوئے تین چار مہینے ہوئے تھے اور میں نے آپ کے ساتھ بہت اچھے دن پاس کئے تھے اور آپ نے جو میرے ساتھ سلوک کیا ہے وہ میں پوری زندگی نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مجھے بھائی کی شکل پر نہیں دیکھا تھا۔ آپ کے ساتھ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں ایک سپاہی ہوں اور آپ ایک افسر ہیں صرف دعا کروں گا اور کوئی ایسے کام لوں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ترقی اور عزت دے دیں آمین اور دوسرا کراچی سے میرے بھائی نے تین چار خطوط ارسال کئے ہیں اور سب میں آپ کو دعا و سلام لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشتاق نواز کو عزت اور ترقی دیں آمین۔ تیسری ہماری بی کمپنی سے پورا پانچ پلاٹون ڈی کمپنی میں بدلی ہوا ہے اور ڈی کمپنی کے بارہ پلاٹون بی کمپنی میں پانچ پلاٹون کی جگہ پر گیا ہے اور میں ابھی ڈی کمپنی ۱۲ پلاٹون میں ہوں اور ٹلی پارہ میں ہوں اور آپ کو پانچ وقت نماز میں دعا کرتا ہوں۔ میری طرف سے آپ کو زیادہ زیادہ دعا سلام قبول ہوں۔

فقط والسلام

مشتاق نواز کی تربت کا کتبہ

باسمہ سبحانہ'

لیفٹیننٹ مشتاق نواز کیانی شہید کی داستان شجاعت وشہادت

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

جواں سال خوش گفتار جذبہ جہاد سے سرشار، مشتاق نواز کیانی کی یہ آخری آرام گاہ ہے طارق اور خالد کی یاد تازہ کرنے والے اس نوجوان کا سرزمین مشرقی پاکستان میں انتہائی بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو جانا اور پھر انتہائی نا مساعد حالات میں اس کی معصوم نعش کا آبائی وطن پہنچنا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۷ء کی خونی صبح طلوع ہوتی ہے دشمن کی ایک بھاری جمیعت مشتاق شہید کی پلاٹون کی بائیں جانب اسکاؤٹ کی ایک پلاٹون پر صبح صبح قبضہ کر لیتی ہے مشتاق کی بہادر کمپنی کے کمانڈر موقع پر موجود نہیں ہیں۔ وقت کم ہے اور دشمن کے زور کو توڑنا ہے۔ مشتاق ایک عسکری خاندان کا چشم و چراغ ہے۔

ملٹری کالج جیسے عسکری ادارے اور اکیڈمی جیسی اعلیٰ درسگاہ نے اس نوجوان کو فولادی عزم سے نواز رکھا ہے۔ مشتاق اپنے بارہ ساتھیوں کی مدد سے دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ دشمن بھی غافل نہیں وہ دستی بموں اور مشین گنوں کے اندھا دھند استعمال سے مجاہدوں کے اس مختصر سے قافلے کو خاک و خون میں تڑپا دیتا ہے زخموں کی مہلک گھاؤ کے باوجود مشتاق اور اس کے جانباز ساتھی دشمن کو اپنی سرحدوں سے مار بھگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مشتاق اور اس کے ۹ ساتھی جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ مشتاق کی شہادت اس کے والدین تک پہنچتی ہے تو وہ صبر استقامت کا پیکر بن کر اپنے ہونہار بیٹے کی بے مثال قربانی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ماں کی ممتا اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کی وطن واپسی کی دعا مانگتی ہے ادھر صدر پاکستان کے حکم سے شہیدوں کی لاشوں کو مغربی پاکستان لانا ممنوع قرار پا چکا ہے۔ مشتاق کے بڑے

بھائی نثار کیانی جو پی آئی اے میں ملازم ہیں۔ ۳ نومبر دیار غیر سے وطن لوٹتے ہیں تو بھائی کی شہادت کی خبر ان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ وہ کراچی سے سیدھے ڈھاکہ پہنچ کر سلہٹ میں مقیم میجر ارشد کیانی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ میجر ارشد جو مشتاق شہید کے عزیز ہیں شہید کو سلہٹ سے کوئی پچاس میل دور مولوی بازار میں دفن کرنے کی دعا سعادت حاصل کر چکے ہیں انتہائی دوڑ دھوپ کے بعد نعش کو مولوی بازار سے ڈھاکہ منتقل کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ ڈھاکہ سے کراچی اور پھر راولپنڈی تک شہید کی نعش کو اس کا بھائی پی آئی اے کی امداد و تعاون سے لے آتے ہیں اور شہید کی نعش کو اپنے آبائی گاؤں موضع بدلوٹ ۷ نومبر کو پہنچائی جاتی ہے۔ میجر ارشد اور نثار کیانی ایک ناممکن کام کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ ماں اپنے پردیسی بیٹے سے لپٹ جاتی ہے۔ آنسوؤں کی ندی رواں ہے شیر دل شہید کی مقدس نعش پاکستانی جھنڈے میں لپٹی ہوئی ہے خاندان اور علاقہ کے ہزاروں سوگوار انسان شہید کو ابدی نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں تو اللہ اکبر کی گونج فضائے آسمانی میں گونجنے لگتی۔ کلمہ طیبہ کا ورد زبان پر طاری ہو جاتا ہے۔ شہید کو آخری سلامی دی جاتی ہے۔ مشتاق دادا جان کے پہلو میں اپنی آرام گاہ منتخب کرتا ہے۔

مشتاق شہید موت کی دسترس سے باہر ہے اس کی بے مثال قربانی اس کے خاندان اور اس کی قوم کے لئے مایہ عزت و افتخار ہے۔ اے اسلام کے نڈر سپاہی اے آقائے نامدار کے سچے خادم۔ اے پاکستان کے ناموس پر کٹ مرنے والے مجاہد! تجھ پہ لاکھوں سلام۔

تتمہ ایک اہم دستاویز

آخر میں ہم مشتاق نواز کیانی کی ذاتی ڈائری کے دو ورق پیش کرتے ہیں۔ ان سے مشتاق کی سوچ کا پتہ چلتا ہے وہ جو اس اٹھتی ہوئی جوانی میں قوم اور ملک پر قربان ہو گیا اور اپنی خوشی سے قربان ہو گیا اس کی سوچ کا انداز کیا تھا۔

اپریل ۷۱ء میں اپنی بٹلین کے ہیڈ کوارٹرز جو عارضی طور پر آدم جی کالج ڈھاکہ میں قائم کیا گیا تھا) میں بیٹھ کر مشتاق نے یہ لکھا۔ فزکس کے تجربات لکھنے کی کاپی کے نیلے کاغذ پر جو غالباً مشتاق کو کسی ڈیسک میں پڑے ہوئے ملے ہوں گے۔

جب میں کراچی میں تھا تو عوامی لیگ کے ستم اور ظلم کی ایسی ایسی کہانیاں سننے میں آئی تھیں کہ آدمی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب میں یہاں آیا تو جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اس پر یقین کرنا پڑا۔ ہماری کمپنی برہمن باڑیہ سے آٹھ میل ادھر ریلوے لائن پر دفاعی مورچوں میں تھی چونکہ میری اپنی پلاٹون سب سے آگے تھی اس لئے وہ مجھے برہمن باڑیہ سے آنے والے لوگوں کی دل ہلا دینے والی داستانیں سننے کا براہِ راست موقعہ ملا۔ یہ قصے عوامی لیگ اور ای پی آر کے ظلم و ستم سے متعلق تھے۔

۱۵ اپریل ۷۱ء کی صبح کو مجھے ایک بوڑھے آدمی نے بتایا کہ عوامی لیگیوں نے بہراب بازار اور آس پاس کے علاقوں سے تمام اُردو بولنے والوں کو ایک جگہ جمع کر لیا ہے اور وہ انہیں بیدردی سے قتل کر رہے ہے۔ اسی رات برہمن باڑیہ کی طرف سے آنے والے دو آدمیوں کو میرے سنتری نے روکا۔ یہ دونوں شدید زخمی تھے ایک کے بازو اور سینے پر گولیاں لگی تھیں دوسرا بھی اسی طرح گولی کا نشانہ بنا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بہتوں کو مار کر لاشوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے رات ہونے پر چلے گئے یہ دو ابھی زندہ تھے۔ جیسے تیسے وہاں سے جان بچا کر یہاں پہنچے تھے ان میں سے ایک تو اتنی بری طرح زخمی تھا کہ میرا خیال نہیں کہ وہ صبح تک بچا ہو گا۔

پھر ہماری بٹالین برہمن باڑیہ میں امن بحال کرنے بھیجی گئی تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سینکڑوں کو مار کر ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں بند کر دیا گیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن تے، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا تھا ان کے گھروں کو لوٹ کے جلا دیا گیا اور یہ لوگ انتہائی خستہ و خراب حالت میں تھے۔ یہیں سے جوانوں نے ایک ڈبے سے دو بچیوں کو نکالا ان کے ماں باپ قتل کر دیئے گئے تھے۔ یہ خوف زدہ ایک کونے میں چھپی بیٹھی تھیں چھوٹی بچی کوئی

دو برس کی ہو گی۔ دہشت سے اس کا بُرا حال تھا۔ بڑی کی عمر کوئی پانچ چھ برس ہو گی۔ وہ بھی کچھ زیادہ نہیں بتا سکی۔ میں نے اسے بہت دلاسا دیا تو کہنے لگی مجھے چچا کے پاس کراچی پہنچا دو۔

میمن سنگھ میں بھی، میں نے یہی حسرتناک نظارہ دیکھا۔ سینکڑوں تباہ حال بوڑھے بچے عورتیں ایک بڑی مسجد میں جمع ہو گئے اور اپنے قتل کیے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب ہم پہنچے تو ان کی جان میں جان آئی۔ ہر ایک اپنی دلدوز کہانی سنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر سخت سے سخت دل انسان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

یہاں ایک سترہ برس کے بہاری لڑکے سے ملا۔ وہ اپنی دو بہنوں اور ماں کو باپ چچا اور بڑے بھائی کی قربانی دے کے بچا لایا تھا۔ خود اس پر بھی حملہ ہوا تھا۔ اور وہ زخمی ہو کر بھی جان بچا لایا تھا۔ ان عورتوں کی حالت قابل رحم تھی۔

اسی طرح جودھے پور میں بھی میں نے وحشت اور بربریت کے مظاہرے دیکھے۔ ایک مکان کی اوپر والی منزل پر کوئی تیس سے زیادہ ڈھانچے پڑے تھے ان میں کچھ بچوں کی بھی تھی ایک پلنگ کے نیچے خون کے بڑے بڑے دھبے تھے اور سیڑھیوں پر خون جما ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بدقسمت مقتول نے اپنے آپ کو چارپائی کے نیچے چھپ کر بچانے کی کوشش کی تھی۔ پہلے تو وہاں اسے چھرے مارے گئے پھر سیڑھیوں کے اوپر کھینچ کر لے جایا گیا اور کمرے میں دوسری لاشوں میں ڈال دیا گیا۔

ڈھاکہ میں، میں نے ایک سولہ برس کے لڑکے کو دیکھا جو عوامی لیگیوں کی بربریت کا شکار ہوا تھا۔ اس کو رسی سے باندھ کے اس کے ننگے بدن پر کوڑے لگائے گئے تھے اور پھر چھریوں سے اس کو بازوں اور جسم کو چھیدا گیا تھا اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اردو بولتا تھا کسی مہاجر کیمپ میں جاؤ وہاں جگر خراش مناظر نظر آتے ہیں۔ (نامکمل ڈائری)

صوبیدار میجر پیر بادشاہ سے انٹرویو

ایک روز صوبیدار میجر آنریری کیپٹن پیر بادشاہ سے اتفاق سے کالج کے دفتر میں ملاقات ہو گئی۔ دیکھتے ہی بولے آپ ہی راشد صاحب ہیں۔ میں نے کہا۔ جی۔ فرمایئے۔ کہنے لگے میرے بیٹے شاہد نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے شہیدوں پر ایک کتاب لکھی ہے وہ کتاب تذکرہ شہدا پچھلے دنوں میں نے دیکھی اس میں ہمارے ایک افسر کا بھی ذکر ہے۔ لیفٹیننٹ مشتاق کیانی شہید۔ آپ نے بہت کچھ لکھا ہے اور بہت صحیح لکھا ہے لیکن یہ بھی بہت کم ہے وہ شیر اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ یہ سن کر مجھے دلچسپی ہوئی سوچا کیوں نہ ان سے انٹرویو لیا جائے۔ چنانچہ پیر بادشاہ صاحب سے جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی۔

راشد — پیر بادشاہ صاحب پہلے تو آپ اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔

پیر بادشاہ — میرا تعلق بھی شہید کی بٹالین ۳۰ ایف ایف سے ہے۔ اب تو ریٹائر ہو چکا ہوں اس وقت یعنی اکتوبر ۱۹۷۱ء میں، میں ۳۰ ایف ایف کی "سی" کمپنی کا سینئر جے سی او تھا۔

راشد — مشتاق بی کمپنی میں نہیں تھے؟

پیر بادشاہ — آپ نے کتاب میں ٹھیک لکھا ہے اس وقت لیفٹیننٹ مشتاق کیانی میجر احسان قادر کی بی کمپنی کی لڑاکا پلاٹون میں تھے۔ اور دنائی پوسٹ پر ہماری "سی" کمپنی کی مدد کو اپنی لڑاکا پلاٹون کے ساتھ آئے تھے۔ وہ ہماری کمپنی کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

راشد — آپ کا تاثر کیا ہے؟

پیر بادشاہ — صاحب، میں نے ایسا شیر دل نہیں دیکھا۔ کمپنی گھیرے میں تھی۔ بارش شو کی شکل کے مورچے تھے۔ یہ دلیر نوجوان ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک گئے

میں گھوم رہا تھا۔ توپ خانے کی بوچھاڑ تھی۔ ہوائی حملے حملے تھے۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ قیامت کا سماں تھا۔ لیکن مشتاق کیانی صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ لیکن چہرے پہ کوئی گھبراہٹ یا پریشانی بھی نہیں تھی بلکہ وہی ہمیشہ کا سا ہنس مکھ انداز تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ان کو یوں بے خطر گھومتے دیکھ کر سی کمپنی کے صوبیدار حبیب اللہ نے ایک دوبار کہا بھی سر آپ ذرا احتیاط کریں گولے پھٹ رہے ہیں انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا صوبیدار صاحب جس گولے پر میرا نام ہے بس اسی کو مجھے لگنا ہے۔ لڑائی میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں بنتا۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ مرنا جینا اچھا ہوتا ہے۔

آخر کار وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ انہوں نے اگلے مورچوں پر لڑتے ہوئے جان دی۔

راشد۔ تو پیر بادشاہ صاحب آپ کا دل شہید کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

پیر بادشاہ ہمارا دل تو خون کے آنسو روتا ہے۔ جنگ بری چیز ہے۔ بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن میرے شیر مشتاق کیانی صاحب کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہم اس کی جرأت کو سلام کرتا ہے۔ جس کا بھی تھا بڑا پیارا بچہ تھا۔ خطرے کے وقت آگے آگے رہتا تھا۔ بہت کم عمر افسر تھا۔ لیکن پکی عمر کے جی سی او زکا بڑا احترام کرتا تھا۔ اٹھتی جوانی تھی۔ افسر تھا بڑا خوبصورت چہرہ مہرہ تھا لیکن کوئی ہلکی بات کبھی نہیں کی۔ اس کو دیکھ کر طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ شہادت کے وقت روزے سے تھا۔ سبحان اللہ

سیکنڈ لیفٹیننٹ خان امجد خورشید شہید

تمغۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

ذاتی کوائف

تاریخ پیدائش ـــــــــــــــ ۲، دسمبر ۱۹۵۱ء

جائے پیدائش ـــــــــــــــ راولپنڈی

کمیشن ـــــــــــــــ ۴۷ پی ایم اے لانگ کورس

تاریخ شہادت ـــــــــــــــ ۶، دسمبر ۱۹۷۱ء

اعزاز ـــــــــــــــ تمغۂ جرأت

شہادت کے وقت عمر ـــــــــــــــ ۲۰ سال

مقام شہادت ـــــــــــــــ جھنڈا پوسٹ (چھمب سیکٹر)

مدفن ـــــــــــــــ لاہور

سیکنڈ لیفٹیننٹ خان امجد خورشید تمغۂ جرأت

پنجاب رجمنٹ

جنگ پھر جنگ ہے۔ خاک و خون کے اس کھیل میں بڑوں بڑوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں لیکن وہ جری اور جانباز جن کی جان پرسوز ہو، جن کے قلب یقین کے نور سے منور ہوں اور شہادت کو مطلوب و مقصود سمجھتے ہوں وہ اس دہشت اور ہیبت کے ماحول میں یوں ترنگ میں ہوتے ہیں۔ جیسے شیر اپنی کچھار میں مست پھرتا ہے۔

۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو سیکنڈ لیفٹیننٹ امجد خورشید اس ترنگ میں تھا میدان کارزار کو دیکھ کر وہ مچل رہا تھا۔ جب وہ اپنی نئی وردی میں ملبوس بڑے بچے تلے قدم اٹھاتا اور دھیمے دھیمے سروں میں کچھ گنگناتا چھمب سیکٹر کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے سے گزرا تو اس کا پرانا دوست لیفٹیننٹ (اب میجر) سعید اسے دیکھ کر پکارا۔

ادھر آؤ امجد! بڑے مست نظر آرہے ہو! کیا ارادے ہیں؟

"آج ڈی۔ ڈے آن پہنچا۔ میرے ارادے اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا اچھا خدا حافظ!"

"سعید! اب شاید میں تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔" امجد نے یہ کہا اور اپنی منزل کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔

اسی شام وہ اپنی پلاٹن کی بی کمپنی کے ساتھ دشمن کی جھنڈا پوسٹ پر جانبازانہ حملہ

کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔ شہادت کے وقت امجد کی عمر بیس سال تھی اور پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوئے تین ہفتے اور ۱۴ پنجاب چھمب سیکٹر میں پوسٹ ہوتے دو ہفتے ہوئے تھے۔

شجاعت کی داستانوں میں امجد کا نام بھی آیا کرے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی۔ جس نے بیس سال کے ایک نوجوان کو شہادت کا دیوانہ و شیدا بنا دیا؟ جبکہ دنیا کی زندگی اپنے تمام حسن اور دلکشی کے ساتھ اس کے سامنے تھی؟ اس کا جواب اس ماحول میں ہے جہاں اس نے پرورش پائی۔ اس گود میں ہے جس میں اس نے آنکھ کھولی، اور اس فطرت میں ہے جو خدا نے اسے ودیعت کی۔ تفصیل اس امر کی یہ ہے۔

آباؤ اجداد

امجد کے آباؤ اجداد کے احوال کے لئے ہم نے امجد کے والد ماجد میجر خورشید احمد خان ۱۴ پنجاب کو لکھا۔ ان کا یہ جواب آیا:

میرے والد محمد صدیق خان مرحوم کھرے یوسف زئی پٹھان تھے۔ جرأت و ہمت تو خیر ایک نسلی خصوصیت تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ وہ سچے اور پکے مسلمان بھی تھے اور اخلاقی قدروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ میں نے اپنے بچوں، امجد، اعظم، طارق کو اپنی خاندانی روایت کے مطابق شفقت آمیز لیکن اخلاقی قدروں کے حامل دوستانہ ماحول میں پرورش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی انداز سے میرے والد گرامی، نے میری تربیت کی تھی۔ والد یوسف زئی پٹھان ہونے کے باوجود سوائے اصولوں کے کسی معاملے میں سخت نہیں تھے۔ اولاد کے ساتھ بہت ہی نرم اور مشفقانہ رویہ تھا۔ گھر میں ادب کے ساتھ بے تکلفی اور شائستگی کے ساتھ دوستانہ فضا تھی۔

جب میں بڑا ہوا اور میں نے پہلی سرکاری ملازمت اگست ۴۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا۔ جی ایچ کیو دہلی کی شروع کی تو والد نے تین نصیحتیں کیں۔

دوسروں کے کام آؤ خواہ اس میں تمہیں تکلیف بھی اٹھانا پڑے۔

جو چیلنج سامنے آئے اسے قبول ضرور کرنا خواہ اس میں زندگی کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔
اور جھوٹ کبھی نہ بولنا۔

اپنے بچوں کو بھی میں نے یہی تین نصیحتیں کیں جب کبھی میں ملٹری کالج امجد اور اعظم خورشید سے ملنے جاتا اور ان کے استادوں اور دوستوں سے ملتا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی کہ دونوں اپنی آبائی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

امجد بھی اپنے دادا کی بظاہر متضاد خوبیوں کا حامل تھا۔ سیدھا سادا نرم خو، نرم دم گفتگو لیکن بعض معاملات میں بے حد تیز و تند خو، ضدی، اپنی ہٹ کا پکا حد درجہ پر عزم باہمت اور خطر پسند، لڑائی میں بھی اس نے اسی الوالعزمی، ہمت اور جوش کا مظاہرہ کیا۔

امجد کی پیدائش

امجد خورشید راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ دسمبر کی ۲ر تاریخ تھی اور ۱۹۵۱ء پنڈی ان کا آبائی شہر نہیں ہے ان کے والد دلی سے ہجرت کر کے پنڈی میں ملازمت کے سلسلے میں رہتے تھے۔ آجکل خورشید احمد خان کا خاندان لاہور چھاؤنی میں آباد ہے۔

بچپن

امجد کا بچپن والد کے تبادلے کے ساتھ ساتھ پنڈی، ملتان، کراچی، لاہور مختلف شہروں میں گزرا۔ ایک انٹرویو میں امجد کی والدہ مکرمہ نے بتایا کہ امجد بچپن میں بھی ہٹ کا پکا تھا۔ ڈرانے سے ڈرتا بالکل نہیں تھا۔ مار کھا لیتا تھا لیکن ڈر کے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ اپنے باپ کو وردی میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا اور ضد کرتا تھا کہ مجھے بھی وردی بنوا دو۔ میں بھی فوجی بنوں گا۔ بچپن میں بچوں کو کھلونے وغیرہ کا شوق ہوتا ہے لیکن امجد کو کھلونوں کے بجائے بندوق چلانے کا شوق تھا جب چار پانچ برس کا ہوا تو بندوق کے لئے بہت ضد کی تو اس کے ابا

نے اسے چھوٹی سی ہوائی بندوق لادی تھی۔ اسی سے وہ اپنے خیالی دشمنوں پر فائر کرتا رہتا تھا۔ چونکہ گھر میں پاکستان بننے کے وقت کے ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم وستم کے واقعات اکثر دہرائے جاتے تھے۔ امجد ان واقعات کو بڑے غور سے سنتا تھا اور کہتا تھا میں مسلمانوں کے خون کا بدلہ لوں گا۔“

خورشید احمد خان صاحب نے بھی اپنی یادداشت میں امجد کے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس کے ذہن کے رخ پر روشنی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کا ہے میں اس زمانے میں ملتان چھاؤنی میں رہتا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء یوم جمہوریہ کی پریڈ کے لئے بریگیڈ کی ساری پلٹنیں مشق کے طور پر مارچ کرتی میرے بنگلے کے سامنے سے گزریں۔ بلاّ (امجد کا پیار کا نام) بنگلے کی دیوار پر کھڑے ہو کر سب کو سیلوٹ کرتا رہتا۔ پلٹنوں کو آتے جاتے خاصا وقت لگ جاتا لیکن امجد سیلوٹ کرتے نہیں تھکتا تھا۔ پلٹن کے جوان اس ننھے مجاہد کے ذوق وشوق سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک روز اس کی کچھ طبیعت خراب تھی میں اسے ہسپتال لے گیا اس نے ضد کی کہ پریڈ کو سلامی دوں گا۔ جب ہم گھر واپس آئے اور مشق کی پریڈ ختم ہو گئی تو ساتھ والی پلٹن کے ایک دو جے۔ سی۔ او میرے گھر آئے اور پوچھا کیا بات ہے آج ہمارا چھوٹا صاحب سیلوٹ کرنے نہیں آیا۔ میں نے بلے کو آواز دی اس نے آتے ہی سیلوٹ مارا تو سردار صاحبان خوش ہوئے۔ پھر کہنے لگے ہمارے جوان چھوٹے صاحب کے سیلوٹ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں چھوٹا صاحب بہت جذبیلا ہے پاکستان کا بہت اچھا افسر بنے گا۔“

ابتدائی تعلیم

۱۹۵۶ء میں تقریباً پانچ سال کی عمر میں امجد کو اعظم گریزن اسکول لاہور میں داخل کرایا گیا۔ وائرلیس کمپاؤنڈ میں ان کے گھر کے ساتھ ہی وہ میجر صاحب بھی رہتے تھے جو گھوڑوں

کے انچارج تھے۔ گراؤنڈ میں گھوڑوں کو دوڑتے دیکھتے دیکھتے امجد کو بھی گھوڑ سواری کا شوق ہوا۔ چنانچہ چھ سات سال کی عمر میں امجد نے چھوٹے گھوڑوں پہ سواری کرنا سیکھ لیا تھا۔

۱۹۶۰ء میں امجد خورشید اپنے والدین کے ساتھ ملیر کراچی میں تھے امجد نے خود اپنے شوق سے پلٹن کی مسجد میں حافظ عبدالغفور صاحب سے قرآن شریف پڑھا اور دو سال میں سارا قرآن مجید ختم کر لیا۔ امجد قرآن شریف پڑھنے اسکول سے آنے کے بعد سہ پہر کو جاتے تھے اور وہاں سے آنے کے بعد ہاکی کھیلنے نکل جاتے تھے۔

ہاکی بچپن سے امجد کا پسندیدہ بلکہ محبوب کھیل تھا۔ بیماری ہو یا صحت، دن ہو یا رات میدان ہو یا کمرہ غرض کے ہر وقت ہر جگہ ہاکی تھی اور وہ کوئی اور نہیں ہوتا تو اکیلے ہی شارٹ کارنر لگاتے رہتے۔

۱۹ اپریل ۱۹۶۱ء کو امجد سرسید پبلک سکول راولپنڈی میں داخل ہوتے یہیں پانچویں اسٹینڈرڈ یا آٹھویں درجے میں پڑھ رہے تھے کہ ملٹری کالج میں آٹھویں درجے ہی میں داخل ہوتے۔ نمبر ۲۹۰۸ تھا اور پہلا ہاؤس ٹیپو سلطان ہاؤس تھا۔ اگست ۶۷ء میں محمود غزنوی ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔

ملٹری کالج کے قیام کا دور

امجد کالج میں ۲۱ اپریل ۱۹۶۵ء کو داخل ہوئے اپریل ۶۶ء میں آٹھویں درجے کا سالانہ امتحان ہوا۔ تو ان کی سالانہ رپورٹ میں یہ لکھا گیا۔

"از خود نظم وضبط کا پابند ہے، باوقار اور سعادت مند ہے کھیلوں اور ڈراموں میں دلچسپی لیتا ہے" اپریل ۶۷ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں امجد کو چکنی مٹی اور ہارڈ بورڈ کی ماڈلنگ سے شوق تھا۔ اسی سال کی رپورٹ میں یہ فقرہ ہے "

کہ ایک اچھا کیڈٹ صورت پذیر ہے

دسویں درجے میں امجد کے بارے میں پروفیسر عین الدین علوی نے ان کے فارم ماسٹر کی حیثیت سے رائے ظاہر کی، امجد کی فطری ذہانت اس نوعیت کی ہے اور وہ کلاس میں پہلی پوزیشن بھی لے سکتا ہے اگر وہ زیادہ شوق سے کام کرے اور کتابی مطالعے کو زیادہ وقت دے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امجد نے اپنے محترم استاد کی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا اور نصابی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۸ء میں ہونے والے میٹرک کے امتحان میں امجد خورشید نے ۶۲۰ نمبر لے کر اچھے نمبروں سے فرسٹ ڈویژن لی اور ایک بار پھر اس کا ثبوت دیا کہ خواہ عام حالات میں وہ کتنی ہی لاپرواہی کا اظہار کرے جب وقت آئے اور چیلنج سامنے ہو تو وہ اس سے عہدہ برآ ہونا جانتا ہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں امجد نے فرسٹ ائر میں آرٹس کے مضامین لئے یہ صحیح فیصلہ تھا۔ امجد کا رجحان سائنسی مضامین کی طرف نہیں تھا اور اس کی شخصیت کا جو سانچہ بن رہا تھا اس کے لحاظ سے یہی بہتر تھا کہ وہ آرٹس لے۔ اس سال اسے کالج کی ہاکی ٹیم میں لے لیا گیا۔ فٹ بال بھی وہ اچھا کھیلتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کی دلچسپی برقرار تھی۔ بحیثیت مجموعی اس کی ترقی اس درجہ قابل تعریف تھی کہ ایم جی ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر نے اس سال فرسٹ ائر کی سالانہ رپورٹ میں لکھا:

"مضبوط و تنومند جسم کا ذہین کیڈٹ۔ پڑھائی میں اوسط درجے کا لیکن کھیلوں میں بہت ممتاز۔"

اپریل ۱۹۶۹ء میں امجد سیکنڈ ائر میں تھے اسی سال انہیں ایم جی ہاؤس کا سپورٹس سیکرٹری بنا دیا گیا۔ امجد کا کالج میں یہ آخری سال تھا۔ اس سال کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ زیادہ ریکارڈ پر نہیں سوائے ایک سزا کے جو مارچ ۱۹۷۰ء میں انہیں کالج کے دوسرے سینئر لڑکوں کے ساتھ رات کو باہر جانے کے لئے ملی۔ بہر حال کالج میں ان کی آخری رپورٹ

کے الفاظ یہ تھے۔

ذہنی طور پر پختہ اور ذمہ دار، قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پرجوش اور کھیلوں میں طاق۔

مئی ۱۹۷۰ء میں امجد نے کالج سے انٹر آرٹس کا امتحان دیا۔ ۱۸ جون ۱۹۷۰ء کو کالج سے فارغ ہوئے۔ اگست میں نتیجہ نکلا۔ ۴۸۶/۱۰۰۰ نمبر آئے جن سے سیکنڈ ڈویژن بنتی ہے۔

ایک راز دان کا بیان

امجد خورشید کی کالج زندگی کی روئیداد جو ابھی آپ نے پڑھی یہ امجد خورشید کے ذاتی فائل کے مندرجات سے مرتب کی گئی ہے اس میں کچھ تفصیلات کا رنگ بھرنے کی ضرورت تھی اس سلسلے میں امجد کے کالج کے زمانے کے ایک ساتھی میجر سعید احمد پنجاب رجمنٹ لکھتے ہیں۔

میں نے انٹرمیڈیٹ کے دو سال ۶۹ء اور ۷۰ء امجد کے ساتھ محمود غزنوی ہاؤس میں گزارے۔ یہیں مجھے امجد کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور ہماری رسمی رسم و راہ بہت جلد گہری دوستی میں بدل گئی۔

امجد گہرے سانولے رنگ کا تھا۔ امجد کے ماتھے کی ایک رگ بہت نمایاں تھی۔ کبھی کبھی یہ رگ بہت پھڑکتی تھی۔ چونکہ میرا ہر وقت اور ہر دن اس کے ساتھ تھا۔ اس لئے یہ نوٹ کیا کہ یہ رگ منگل کو بہت پھڑکتی تھی۔ اس کی شہادت کے بعد اس رگ کا اس کے والدین سے بھی ذکر آیا انہوں نے بھی یہی کہا۔ یہ رگ بچپن سے نمایاں تھی میں نے سنا ہے کہ یہ رگ بڑائی کی نشانی ہے۔

امجد کو گھر میں پیار سے بلا کہتے تھے۔ بلا یوں تو بڑا متین خاموش اور نرم تھا۔ لیکن کبھی کبھی یکایک وہ بدل بھی جاتا تھا۔ اس وقت اس کی تندی و تیزی دیکھنے کی ہوتی تھی اس وقت وہ سراپا آگ ہو جاتا تھا۔

اب جب کبھی میں امجد کے ساتھ گزارے دو سالوں کو یاد کرتا ہوں تو میرے ذہن میں دو تاثرات بڑی شدت سے ابھرتے ہیں ایک تو اس کا ہاکی کا شوق بلکہ عشق دوسرے اس کا

عزم وہ جو چاہتا کر کے دم لیتا۔ خواہ اس کے لئے کتنی تکلیف اٹھانی یا کتنی مشقت اٹھانی پڑے یا قربانی دینی پڑے۔

کالج سے مغرب کی طرف تھوڑے فاصلے پر اپر جہلم کنال بہتی ہے ہر چند کہ اس میں تیرنے کی اجازت نہ تھی لیکن شروع جوانی میں جو منچلا پن، جو بندشوں کو توڑنے اور زور بازو آزمانے کی ترنگ ہوتی ہے اس کے تحت میں اور امجد بھی اس نہر میں تیرنے کی مشق کرتے تھے ایک روز دو تین بار آر پار جا کے میں کنارے پر آرام سا کرنے لگا تو امجد نے مجھے للکارا، "چلو آٹھ بار نہر کو کراس کرتے ہیں اگر تم واقعی ایس ایس جی میں جانا چاہتے ہو، تو ہمت کرو باکسنگ میں بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

اگر مقابل کوئی اچھا باکسر ہوتا تو کہتا ٹھیک ہے۔ اب مزہ آئے گا۔ باکسنگ کرنے کا" میں کہہ چکا ہوں ہاکی سے اسے صرف دلچسپی ہی نہیں عشق تھا پڑھائی میں اس کے کم نمبروں کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ پڑھتا ہی نہیں تھا۔ جب میٹرک میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تو ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی امجد کے والد کی بڑی خواہش تھی کہ امجد انٹرمیڈیٹ میں سائنس لے۔ لیکن امجد نے جو دوسرے معاملوں میں بے حد سعادت مند تھا۔ والد کو صاف لکھ بھیجا کہ میں آرٹس لینا چاہتا ہوں اور وجہ یہ بتائی کہ سائنس لے کر زیادہ پڑھنا پڑے گا اور ہاکی کھیلنے کا وقت نہ مل سکے گا۔ امجد کے والد با دل نخواستہ راضی ہو گئے لیکن جب ملے تو کہا" اگر تمہارا شوق یہ ہے تو یہی سہی لیکن مزہ جب ہے کہ اس فن میں حد کمال تک پہنچو۔ امجد نے پوچھا۔ کون سا کمال؟ انہوں نے کہا۔ پاکستان ہاکی ٹیم۔ یہ سنتے ہی امجد کی آنکھوں میں دیئے جل اٹھے۔ جیسے یہ بات اس کے دل میں بھی تھی۔ جوش سے کہنے لگا۔ اباجی کوشش کروں گا۔ میری دلی آرزو بھی یہی ہے کہ ایک روز پاکستان کی ٹیم میں کھیلوں"

میجر سعید احمد مزید لکھتے ہیں۔

مئی ۱۹۶۹ء میں سیکنڈ ٹرم کے شروع میں امجد کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ بخار اترنے کے بعد اسے آرام کرنے کے لئے چھٹی پر گھر بھیج دیا گیا ایک روز جب میں کلاسز سے ڈارمیٹری میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ امجد چھٹی سے واپس آگیا ہے اور ڈارم کی ساری چارپائیاں ایک طرف کھڑی کر کے شارٹ کارنر کی مشق کر رہا ہے۔ میں نے کہا، امجد یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی تو تم بیمار ہو کے اٹھے ہو۔ یار مجھے تو پاکستان ٹیم میں کھیلنا ہے۔ آدمی بڑی بات سوچے تو بڑی کوشش بھی کرے۔ میں ہنس پڑا۔

"آج تو، تو بڑا فلسفہ چھانٹ رہا ہے۔"

اس کی شہادت کے بعد اس کے گھر میں اس کے ہاکی کے جنون کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ میجر صاحب امجد کے والد (خورشید احمد خان) نے اس کے بچپن کا ایک واقعہ سنا کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہنے لگے: "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بچپن میں ایک بار ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی بتا دی نزلہ زکام بگڑ گیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹروں کا کہنا میں اس زمانے میں ملیر میں تھا۔ اسے ملیر کینٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ بظاہر تو ٹھیک ہی تھا۔ بس احتیاطاً داخل کرا دیا گیا چونکہ گھر قریب ہی تھا اس لئے کھانے پہ گھر آجایا کرتا تھا۔ آتا تو کھانے کے لئے تھا لیکن اس عرصے میں ہاکی گیند لے کر ٹھک ٹھک کرتا رہتا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ کھیلتا جب وہ نہ ہوتے تو بہن ہی کو ساتھ کر لیتا۔"

خورشید صاحب نے بتایا کہ آخر عاجز آکر وہ خود ہی کھیلنے لگے اور ساتھ ہی کھیل کے گر بھی بتاتے رہتے ہاکی میں امجد کی اٹھان بہت اچھی تھی کچھ عجیب نہیں کہ وہ پاکستانی ٹیم تک بھی پہنچتا۔ ۱۹۶۸ء میں جب وہ دسویں درجے میں تھا تو اس نے ہاکی میں کالج کلر لیا۔ ۱۹۶۹ء میں اس نے کیڈٹ کالج پٹاور کے خلاف ہاکی کا شاندار مظاہرہ کر کے اور ٹرافی جیت کر انٹر سروسز کیڈٹ کالجز ہاکی کلر لیا ۱۹۷۱ء میں اس نے پی ایم اے ہاکی کلر بھی حاصل کیا۔

ہاکی کے علاوہ ایک اور میدان میں سے اسے سرخ رو ہونا تھا کھیلوں کے کلر تو آسانی سے

مل جاتے ہیں۔ جو آخری سرخ روئی اس کی قسمت میں لکھی تھی وہ ہر ایک کی تقدیر نہیں ہوتی۔ اس عظیم سرخ روئی کا ذکر میں ابھی تفصیل سے کروں گا پہلے واقعات کی ایک آدھ کڑی ملا لوں۔

کالج سے پی ایم اے تک

جون ۱۹۷۰ء میں کالج سے فارغ ہو کر امجد نومبر ۱۹۷۰ء میں پی ایم اے جانے تک اپنے والد کے پاس سیالکوٹ رہا۔ اس عرصے میں اس کا ایک ہی مشغلہ تھا۔ ہاکی کھیلنا اور اخبار پڑھنا۔ ایک روز گھر میں کہنے لگا "دیکھ لینا ۱۹۷۱ء میں ہندوستان پاکستان میں جنگ چھڑ جائے گی۔ جس میں، میں شہید ہوں گا" تم اور شہید؟ کیسی باتیں کرتے ہو امجد؟ سب نے کہا وقت آنے پر دیکھ لینا اس کا جواب تھا۔ لیکن سب یہی سمجھے کہ یہ مذاق ہے اور کچھ نہیں لیکن حقیقتاً یہ مذاق نہیں تھا وہ سنجیدہ تھا جو کچھ اس نے کہا وہ اس کا وجدان تھا۔ پی ایم اے کے لئے سلیکشن کے بعد اس کے والد نے کہا ایک گرم سوٹ بنوا لو پی ایم اے میں کام آئے گا۔ وہ نہ مانا۔ کیا کرنا ہے۔ بیکار جائے گا۔ والد نے جب زیادہ اصرار کیا تو بنوا لیا۔ لیکن کبھی پہنا نہیں۔ شہادت کے بارے میں اس کا اندرونی احساس بہت قوی تھا۔

پی ایم اے میں اس کی دلچسپی کا محور ہاکی ہی تھی۔ کورس کا عرصہ اتنا کم ہو گیا تھا کہ اس کا وقت نہیں ملتا تھا۔ بہر حال ہاکی میں اس نے پی ایم اے کلر لیا۔ اسالٹ کورس کرتے ہوئے بازو ٹوٹ گیا اس کی وجہ سے اسے کچھ دنوں ہسپتال میں رہنا پڑا لانگ کورس کو شارٹ وار کورس کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ایک سال بعد ہی ۱۳ر نومبر ۷۱ء کو اسے پاس آؤٹ ہونا تھا۔ پاس آؤٹ ہونے سے پہلے امجد نے اپنے بھائی کو جو ٹیکسلا میں تھے یہ خط لکھا۔

"وقت آن پہنچا ہے آرمی کو کچھ ہتھیار مہیا کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کو شکست دینے کیلئے"

میجر سعید احمد آخر میں لکھتے ہیں؛

پاسنگ آوٹ کے دن بھی میں امجد سے ملا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہم دونوں کی رجمنٹیں چھمب کے علاقے میں ایک ہی جگہ متعین تھیں میرا خیال تھا کہ خوب ملاقات رہے گی۔ ملاقات تو ہوئی لیکن زیادہ دیر نہ رہی۔

امجد کی پی ایم اے کی کارکردگی

امجد کی پی ایم اے کی کارکردگی کے بارے میں میجر خورشید صاحب نے ایک اور واقعہ لکھا ہے جو قابل توجہ ہے۔

میرے کرنل (اب بریگیڈیر) عاشق حسین ملک سے اچھے مراسم تھے جب وہ سیالکوٹ سے تبدیل ہوکر پی ایم اے جانے لگے تو میں بھی ان سے ملاقات کے لئے ان کے دفتر گیا وہ یونٹ کا چارج دے رہے تھے اس لئے مختصر ملاقات ہوئی چلتے ہوئے کرنل عاشق نے پوچھا بیٹے کا نام کیا ہے جو پی۔ ایم۔ اے میں ہے۔ میں نے کہا میرے بتانے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ کسی قابل ہوا تو اپنے کام اور کردار سے خود اپنے آپ کو واقف کرا دے گا۔ انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا تو میں نے کہا نہ وہ سفارش پر یقین رکھتا ہے نہ میں رکھتا ہوں اللہ مالک ہے وہ کسی قابل ہوا تو اپنی جگہ بنا لے گا۔

کچھ عرصے کے بعد میری پوسٹنگ ڈھاکہ ہوگئی وہاں جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ میں امجد کو پی ایم اے دیکھ آؤں یکم فروری ا. کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے میں کرنل عاشق کے دفتر میں پہنچا تو انہوں نے بتایا کہ آج سے تمام کیڈٹ عید الاضحی پر سات دن کی چھٹی جا رہے ہیں۔ چائے پینے کے دوران کرنل عاشق نے مجھ سے کہا میں ابھی کمانڈانٹ کی کانفرنس میں شرکت کرکے آرہا ہوں۔ امجد بہت اچھا جا رہا ہے اس وقت ۲۷۲ کیڈٹس میں اس کی دوسری پوزیشن ہے۔ مبارک ہو۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور ان سے پوچھا اب تو ضرورت نہیں بیٹے کا نام بتلانے کی؟" کرنل عاشق مسکرا پڑے انہیں پرانی بات یاد آگئی تھی۔

شہادت کی طرف پہلا قدم

امجد ۱۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کو پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہوئے اور اپنے والد کی پرانی بلٹن ۱۴ پنجاب میں پوسٹ ہوئے جو اس زمانے میں چھمب سیکٹر میں متعین تھی۔ دس روز لاہور میں چھٹی کے گزارے اس دوران میں وہ شہید ہونے کا تذکرہ بار بار کرتے رہے۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کو چھمب میں اپنی بلٹن میں رپورٹ کی یہ زمانہ سخت کھنچاؤ کا تھا کسی وقت بھی جنگ شروع ہو سکتی تھی موہوم اندیشوں سے لوگ متفکر تھے لیکن امجد کو تو کچھار کا مزہ آرہا تھا۔ ۳ سے ۵ ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک امجد نے جنگی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۶ر دسمبر کی صبح کو میجر سعید کی امجد سے ملاقات ہوئی۔ اس کا حال ان ہی کے لفظوں میں سنیئے۔

وہ نظارہ اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے جب ۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح صحت و توانائی سے بھرپور چاق و چوبند سیکنڈ لیفٹیننٹ امجد خورشید چھمب سیکٹر کے ہیڈکوارٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا "کیا ارادے ہیں، امجد" میں نے پوچھا۔ "ارادے کیا۔ اے ڈی ڈے آن پہنچا سعید! خدا حافظ اب شاید میں تمہیں پھر نہ دیکھ سکوں"۔ "کیوں نہیں میں تو تمہیں دیکھوں گا"! اس نے بھی ٹھیک کہا تھا اور میں نے بھی۔ اس نے واقعی مجھے پھر نہیں دیکھا وہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی میں نے اسے ضرور دیکھا لیکن خاک و خون میں لتھڑا ہوا شہادت کے بعد۔

میرے ہمدم میرے دوست تم پر خدا کی رحمتیں ہوں۔ یہ آخری کلمہ جو تم نے حاصل کیا۔ اس کی سرخی لازوال ہے۔

شہادت کا واقعہ

امجد شہید کی شہادت پر اس کی بٹالین کے کمانڈنگ افسر صاحب نے لکھا:

۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ۱۴ پنجاب رجمنٹ کی بی اور سی کمپنیوں نے ہندوستانی چوکی جھنڈا پر

حملہ کیا۔ جو معلومات ان کمپنیوں کو دی گئی تھیں ان کے مطابق اس چوکی پر دشمن کی ایک کمپنی ہونا چاہیئے تھی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ امجد خورشید سی کمپنی کی ایک پلاٹون کمانڈ کر رہے تھے جب وہ دشمن کی پوزیشن پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں تو دشمن کی کم از کم ایک بٹالین مورچہ بند ہے اور اس کی مدد کے لئے ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن ہل ڈاؤن پوزیشن میں موجود ہے یہ دیکھ کر امجد خورشید نے نہ حواس کھوئے نہ ہمت ہاری وہ اپنے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی پلاٹون کو دشمن کی بارودی سرنگوں کے کنارے تک لے گئے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر امجد خورشید نے دیکھا کہ سرنگوں کے درمیان دشمن کے مضبوط مورچے ہیں۔ جن میں سے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر آرہا ہے اس موقعہ پر سیکنڈ لیفٹیننٹ امجد خورشید نے فیصلہ کیا کہ ان کی پلاٹون کو دشمن کی پہلی لائنے کا قلع قمع کرنا چاہیئے چونکہ ان کی پلاٹون کے بیشتر جوان نئے ریکروٹ تھے اس لئے ان میں حوصلہ پیدا کرنے کے لئے امجد خورشید نے حملہ کی پہل خود ہی کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ انہوں نے دشمن کی اس پہلی ایل ایم جی پوسٹ پر آگے بڑھ کر

خود ہی حملہ کیا اور گرنیڈ سے اسے تباہ کر دیا ایسے کرتے ہوئے ان کا بایاں ہاتھ ایک گولی سے زخمی بھی ہو گیا اس کے باوجود ان کے عزم میں کمی نہیں آئی اور اپنے جوانوں کو حوصلہ دے کر آگے بڑھاتے رہے۔ آگے بڑھے تو انہیں تقریباً ۳۰ گز دور دشمن کا ایک اور بنکر نظر آیا۔ اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے وہ لیٹ کر بلکہ رینگ کر آگے بڑھنے لگے لیکن جونہی وہ اس طرح تھوڑے سے آگے بڑھے تو دشمن کی مشین گن کے فائر کی زد میں آگئے اب انہیں پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کی پوزیشن کتنی مضبوط ہے اور وہ مہلک زخم بھی کھا چکے تھے اس کے باوجود انہوں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اس جگہ سے نکلیں اور داہنے حصے دور ہٹ جائیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئے اور چند گھنٹے بعد شہادت پائی۔

انتہا درجے کی فرض شناسی، بے پناہ جراٴت اور اعلیٰ درجے کی قیادت اور جان بازی کی اس ذاتی مثال کے لئے جو امجد خورشید نے پیش کی۔ ان کے سی۔ او نے ان کے لئے ستارہ جراٴت

کے اعزاز کی پرزور سفارش کی۔ لیکن تمغہ جرأت عطا ہوا۔ امجد کو لاہور میں دفن کیا گیا جہاں اب ان کے والدین رہتے ہیں۔

شہادت کی خبر

بیٹے کی شہادت کی خبر باپ نے ڈھاکہ میں کیسے سنی؟ یہ بھی پاکستان کی عسکری تاریخ میں سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے۔ خورشید صاحب لکھتے ہیں:۔

۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات تقریباً ۹ بجے میں اپنے کمرے میں نماز عشا پڑھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرے بنگلے واقع دھان منڈی ڈھاکہ میں کرنل طور، میجر ظاہر شاہ اور میجر سلطان مرحوم بھی ٹھہرے ہوئے تھے یہ لوگ بوجہ بلیک آؤٹ میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے کا انتظار تھا۔ اردلی نے کھانا اس لئے نہیں لگایا تھا کہ میں نماز ختم کر لوں تو کھانا لگائے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میجر سلطان نے ریسور اٹھایا تو پتہ چلا کہ میرا کلرک بات کرنا چاہتا ہے۔ مزید پوچھنے پر اس نے کہا کہ میجر صاحب کے لئے ایک تار ہے ابھی بھیج دوں یا صبح نماز کے وقت۔ میجر سلطان نے کہا میجر خورشید ابھی نماز پڑھ رہے ہیں تو ٹیلی فون بند ہو گیا۔ میں نے نماز پڑھ کر اردلی حوالدار غلام نبی کو کھانا لگانے کے لئے آواز دی۔ اس نے فوراً کھانا لگانا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں نے دفتر ٹیلی فون پر بات کی۔ ہیڈ کلرک نے جو بنگالی تھا کہنا شروع کیا السلام علیکم، میجر صاحب آپ کا ایک ٹیلی گرام ہے۔ میں نے کہا بھیجنے کی ضرورت نہیں صرف پڑھ کر سنا دو، اس نے کہا سر، دل نہیں مانتا۔ اللہ خیر کرے میں نے کہا جو کچھ بھی لکھا ہے پڑھ کر سنا دو۔ اس نے سنایا۔

(جس کا ترجمہ ہے) سیکنڈ لیفٹیننٹ امجد خورشید ۶ دسمبر کو شہید ہو گیا۔

"شکریہ۔ اللہ مالک ہے"، کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور اٹھ کر کھانے کی میز پر جا پہنچا کیونکہ کھانا میز پر لگایا جا چکا تھا اور سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے کرنل طور نے پوچھا کہ کیا تھا تو میں نے بتایا کہ میرا بیٹا امجد شہید ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہوں نے سنا اور خاموش ہو کر

بیٹھ گئے۔ مگر میں نے کہا "بھائیو۔ کھانا کھاؤ۔ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ الحمدللہ۔ کیسی عظیم موت پائی میرے بیٹے نے۔ وہ موت جس کی دعائیں اپنے لئے پچھلے ۲۰ سال سے مانگتا رہا ہوں اور امجد کی تو پیشین گوئی تھی جو پورے ایک سال بعد پوری ہو گئی۔ خدا اپنے حبیب پاک کے صدقے امجد کی شہادت قبول کرے اس کے درجات بلند کرے آمین ثم آمین۔

بیٹے کی شہادت پر مبارکباد

۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو میجر خورشید احمد خان نے ڈھاکے پی او ڈبلیو سیکٹر سے ریڈ کراس کے واسطے یہ پیغام بھیجا۔

عزیز بیگم

امجد کی شہادت پر مبارکباد

خدا اس کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور ہم سب پر رحم کرے۔

شہادت پر ماں اور بہنوں کا رویّہ

امجد خورشید نے اپنی والدہ اور بہنوں کو اپنی شہادت کا اتنا یقین دلا رکھا تھا کہ ان کی شہادت کی خبر انہوں نے یوں سنی جیسے کسی عزیز کے سفر پر روانہ ہونے کے بعد منزل مقصود پر پہنچ جانے کی خبر سنی جاتی ہے۔

امجد کی امی اور تینوں بہنوں کو کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ امجد کی باتیں کرتے کرتے ان کا کبھی کبھی مسکرا دینا ملنے والوں کو حیران کر دیتا۔

امجد کے شہید ہونے اور شوہر کے جنگی قیدی بن جانے کے بعد بیگم خورشید نے کہا:۔

قوم کا وقار سب سے پہلے، قیدی بعد میں، ملک ہے تو ہم ہیں اگر ملک نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لئے ملک کے لئے جتنی قربانی بھی دی جائے کم ہے"
امجد کے متعلق ایک انٹرویو دیتے ہوئے بیگم رضیہ خورشید نے کہا۔
امجد کی شہادت کی خبر سن کر میں اس کی دائمی جدائی پر تڑپتی تھی لیکن اس کی میت دیکھ کر میں سارے دکھ بھول گئی۔ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اگر شہید مرتے تو میرے بیٹے کے چہرے پر موت کی زردی کے بجائے شفق کی لالی نہ ہوتی"

امجد کے شوق اور امتیازات

امجد نے ملٹری کالج میں باکسنگ، سوئمنگ اور ڈرامہ میں امتیاز حاصل کیا۔ خورشید صاحب جو خود بھی ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی رہے ہیں لکھتے ہیں:
میری حسرت تھی کہ امجد پاکستان ہاکی ٹیم میں کھیلے۔ کالج جانے سے پہلے میں اس کو گھر میں ہاکی کھیلاتا تھا اور تاکید کرتا تھا۔ بیٹا کالج میں صرف ہاکی کھیلنا۔ امجد دسویں میں تھے کہ کالج ہاکی ٹیم میں شامل کر لئے گئے۔ انٹرمیڈیٹ میں سائنس صرف اس لئے چھوڑ دی کہ ہاکی کھیلنے کا وقت نہیں ملے گا۔ ۱۹۶۸ء میں کالج کلر حاصل کیا۔ دسمبر ۶۹ء میں بمقام پٹارو ہاکی کلر حاصل کیا۔ ۷۱ء میں پی ایم اے کلر۔
تیراکی کا بڑا شوق تھا۔ کالج میں بھی چوری چھپے اپر جہلم کنال میں جو کالج کے پہلو میں ہے تیرنے کی مشق کرتے تھے۔ اتوار کو نہر کو آپس کے مقابلوں میں کئی کئی بار تیر کر پار کرتے تھے۔
خورشید صاحب کا بیان یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں پی ایم اے میں جانے سے پہلے امجد نے ان کی پلٹن میں نشانہ بازی کے مقابلے میں حصہ لیا اور مشین گن MGIAB سے ۸ انچ کا گروپ بنایا اور کمانڈنگ افسر سے بہت شاباش لی۔

ورزش اور جوڈو کا شوق

خورشید صاحب لکھتے ہیں:۔

سیالکوٹ والے بنگلے میں ہم نے امجد کو نیچے والا کمرہ دے دیا تھا تاکہ وہ اپنے دوستوں نعیم اور اعظم گوندل کے ساتھ اودھم مچاتا رہے۔ ان لڑکوں نے کمرہ کا پنکھا اتار کر اس کی جگہ باکسنگ کے لئے کٹ بورہ بھر کر لٹکا لیا تھا یہیں وہ باکسنگ اور جوڈو کی پریکٹس کرتا رہتا تھا۔

ایک رات میں اور رضیہ کھانا کھا کر ٹہلنے کیلئے باہر گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد واپس آئے تو دیکھا کہ ہمارے ڈرائینگ روم کی بتیاں جل رہی ہیں ہم سمجھے شاید کوئی مہمان آیا بیٹھا ہے۔ اندر داخل ہوئے تو یہ منظر دیکھا کہ صوفے دیوار کے ساتھ لگے ہیں صوفوں کے گدے کشن قالین پر بچھے ہیں اور امجد دونوں چھوٹی بہنوں کو جوڈو کے داؤ سکھا رہے ہیں۔ ماں ناراض ہوئیں یہ کیا ادھم مچا رکھا ہے جوڈو لڑکیوں کے لئے نہیں ہوتی۔" امجد کہنے لگا۔" امی جی! الجزائر میں اور ویت نام میں لڑکیاں کمانڈو ایکشن کرتی ہیں۔ لڑکیوں کو بھی جنگی تربیت دینی چاہیئے۔

امجد شہید کی شخصیّت

کسی انسان کی شخصیت پر سب سے مستند رائے اس کے ان دوستوں کی ہوتی ہے جو اس کی خلوت و جلوت کے رازدان ہوں۔ امجد کے ایک گہرے دوست میجر نعیم ڈار کے تاثرات یہ ہیں۔

"امجد خورشید ۳۱ نومبر ۱۹۷۰ء پاکستان ملٹری اکیڈمی کے ۴۷ ویں لانگ کورس میں ٹریننگ کے لئے پہنچے۔ شروع کا ایک مہینہ قاسم کمپنی میں رہنے کے بعد اورنگ زیب کمپنی کی نمبر ۲ پلاٹون میں منتقل ہو گئے۔ امجد کی شخصیت میں جو پہلو زیادہ نمایاں تھا وہ دوستی، قربانی اور مدد کا جذبہ تھا اس کی ایک بہترین مثال یرموک جنگی مشق کا ایک واقعہ ہے۔ یرموک ایکسرسائیز پہلی ٹرم میں پانچ دن کی ایک ایکسرسائز ہوتی ہے جس میں ہر آدمی اپنا پانچ دن کے کھانے کا راشن اور بستر وغیرہ خود اٹھا کر چلتا ہے اور ساتھ ساتھ مختلف جنگی چالوں کی مشق ہوتی ہے اس ایکسرسائز کے راستے میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب ایک ندی کو پار کرنے کے بعد ایک عمودی پہاڑی پر چڑھنا ہوتا

ہے۔ یہ مرحلہ ایکسائز کے دوسرے دن دوپہر کے وقت آتا ہے۔ جبکہ ہر آدمی ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکا ہوتا ہے اور کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا کہ بدمزگی نہ پیدا ہو۔ اس موقع پر جب پلاٹون کا ایک کیڈٹ تھک کر بیٹھ گیا تو امجد خورشید آگے بڑھ کر آئے اور اس کا سامان اور بندوق اپنے کندھے پر اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس پہاڑی کی چوٹی تک پہنچایا۔ یہ قربانی اور مدد کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔

دوستی کے معاملے میں امجد نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس کو کسی سے کیا صلہ ملے گا وہ تو صرف یہ دیکھتا تھا کہ وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

پی۔ ایم۔ اے ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں شخصیت ٹریننگ کے دوران جب ہر قسم کا چھلکا، ذہنی اور جسمانی تکان اتار دیتی ہے تو اصلیت کسی سے چھپ نہیں سکتی۔ امجد خورشید نے اپنی پی۔ ایم۔ اے ٹریننگ کے دوران یہ ثابت کر دیا کہ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں۔

۴۷ ویں لانگ کورس اگرچہ لانگ کورس ہونے کی حیثیت سے دو سال کے عرصے کی ٹریننگ والا کورس تھا۔ لیکن ایمرجنسی کی وجہ سے یہ کورس صرف ایک سال کی ٹریننگ تک محدود کر دیا گیا اور ۱۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کو پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی اور نو دن کی چھٹی کے بعد امجد خورشید ۱۴ پنجاب رجمنٹ میں گئے۔

ایثار اور شہادت کا جذبہ بے اختیار

امجد کی مختصر سی زندگی کے مطالعے سے دو باتیں بہت واضح طور پر ابھر کے سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ اس میں ایثار کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ دوسرے یہ کہ شہادت پانے کی آرزو اس میں جنون کی حد تک تھی۔ امجد یوں تو زندگی بھر بہنوں بھائیوں کے ساتھ، دوستوں، عزیزوں ماتحتوں کے ساتھ ایثار کرتا رہا لیکن سب سے بڑا اور آخری ایثار اس نے اس وقت کیا جب

اس کا آخری وقت تھا وہ امجد کے ساتھیوں نے جو اس کے شریک کارزار تھے بتایا۔ جب شدید زخمی حالت میں طبی امداد کے لئے اسے پیچھے پہنچایا گیا تو اس وقت تک اسے ہوش تھا۔ ڈاکٹر اسے خون دینے کی تیاری کرنے لگا تو امجد نے کہا آپ کسی اور زخمی کو دیکھیں، میرے اوپر وقت ضائع نہ کریں۔ مجھے برسوں سے آرزو شہادت پانے کی تھی۔ جو مجھے سامنے نظر آ رہی ہے۔"

شہادت کی آرزو امجد کو عشق کی حد تک تھی۔ امجد کی امی نے ایک انٹرویو میں کہا۔

"امجد کہا کرتا تھا،" آپو! میں شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں" یہاں تک کہ اپنے پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد آکر بھی اس نے سب سے پہلے جو جملہ کہا وہ یہی تھا،" آپو، بس آپ کو اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے، کس بات کے لئے؟" امجد شہید کی خالہ نے اس معنی خیز جملے کو سن کر تجسس سے پوچھا" میری شہادت کی خبر سننے کے لئے" امجد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

امجد کے ساتھ لڑنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ شہادت کے لئے اتنا بے قرار تھا کہ جھپٹ جھپٹ کے دشمن پر حملے کرتا۔

کیپٹن تنویر جو چھمب کے محاذ پر امجد شہید کے ساتھ تھے کہتے ہیں "کہ میں نے آج تک اتنا جوشیلا اور بہادر نوجوان نہیں دیکھا۔ دشمن کا ایک مورچہ جیتنے کے بعد میں نے انہیں خبردار کیا کہ دشمن اب ضرور زوردار اور بھرپور حملہ کرے گا چنانچہ ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

"کرنے دیں جی۔ انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہاں کیسے کیسے شیر کچھاروں میں بیٹھے ہیں"

اور چھمب کے فتح ہونے پر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے محاذ پر سے گھر خط لکھ کر چھوٹے بہن بھائیوں کو خوشخبری سنائی کہ دیکھا پچھلی بار چھمب تک پہنچنے میں چار دن لگے تھے اس دفعہ ہم نے چھمب صرف چھتیس گھنٹوں میں فتح کر لیا ہے۔"

شہادت کی پیشگوئی

خورشید صاحب لکھتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں پی ایم اے جانے سے قبل، امجد صحن میں بہن بھائیوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں ذرا پرے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے سنا امجد کہہ رہا ہے اگلے سال ۷۱ء میں پاکستان اور ہندوستان میں جنگ لگے گی اور میں شہادت پاؤں گا۔ یہ سن کر میں چونکا۔ اخبار بند کیا اور امجد کی طرف رخ کر کے میں نے پوچھا۔ برخوردار تمہیں، کیسے پتہ لگا" امجد نے بڑی سنجیدگی سے کہا" میرے کالج کے ایک دوست نے ہاتھ دیکھ کر یہ بتایا ہے۔ میں نے جواب دیا" وہ کون سا اولیا تھا کہ غیب کی باتیں بتانے لگا۔ جیسے تم ویسے تمہارے دوست۔"

نومبر ۷۰ء کی شروع تاریخوں میں اسے پی ایم اے جانا تھا میں نے اسے گرم سوٹ کا کپڑا دے کر اور درزی کو بلوا کر کہا ناپ دے کر سوٹ سلوالو کاکول میں سردی ہوتی ہے۔ امجد بہت لیت ولعل کرتا رہا" سردی اتنی نہیں ہوتی کیا ضرورت ہے بلیزر سے کام چل جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ"

جب میں نے اصرار کیا کہ" یہ وقار کا سوال بھی ہے" تو چپ ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ۱۰ نومبر ۱۹۷۰ء کو سوٹ سل کے آگیا۔ میں نے کہا" بیٹا ذرا پہن کر تو دکھاؤ"۔ امجد نے جواب دیا۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ اگلے سال جنگ میں۔ میں نے شہید ہو جانا ہے یہ سوٹ بیکار ہو جائے گا۔ آپ نے فضول پیسے ضائع کئے ہیں۔ میں نہیں پہنوں گا۔ میرے سختی سے کہنے کے باوجود اس شیر نے سوٹ نہ پہننا تھا نہ پہنا۔ یکم فروری ۷۱ء کو دس روز کی چھٹی پر آیا تو پی۔ ایم۔ اے کا سپورٹس سوٹ پہن کر آیا۔

مئی ۷۱ء کی چھٹیاں امجد نے لاہور میں گزاریں۔ اس دوران میں بھی بہن بھائیوں کو یاد دلاتا رہا کہ بس اب جنگ چھڑنے والی ہے۔ میں نے شہید ہو جانا ہے۔

۴۷ لانگ کورس ۱۳ نومبر ۷۱ء کو پاس آؤٹ ہوا۔ دس روز کے بعد ۲۳ نومبر ۷۱ء امجد اپنے والد کی پلٹن ۱۴ پنجاب میں شامل ہونے چلے تو پھر اپنی ماں سے وہی شہادت والی بات کی۔ امجد کی امی نے اسی دن خورشید صاحب کو ڈھاکہ میں لکھا۔ آج صبح جب امجد پلٹن میں شامل ہونے کے لئے جانے لگا تو اس نے پھر کہا" جنگ چھڑنے والی ہے اس میں مجھے شہید ہو جانا ہے۔ یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا اور میں اسے لاہور اسٹیشن پر چھوڑنے نہ جا سکی۔ خورشید! خدا سے دعا کرو

میرے دل سے یہ وہم دور ہو اور ہمارا بیٹا غازی بن کر واپس آئے"۔ اس کے جواب میں خورشید صاحب نے اپنی بیگم کو لکھا؛

"رضیہ آپ کو شرم آنی چاہیئے اگر بیٹا شہادت کے لئے جا رہا تھا تو آپ نے بد دلی کیوں دکھائی۔ کیا مسلمان ماؤں کا یہی شیوہ ہے افسوس کی بات ہے"۔

باپ کا خواب

خورشید صاحب لکھتے ہیں ؛

۶ر دسمبر ۱۷ء کو ڈھاکہ میں، میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع لوگوں کا ہے۔ بہت سے لوگوں نے مل کر میرے سر پر ایک تاج سا رکھا ہے جو پگڑی کے کلاہ کی شکل کا ہے۔ اور اس کے اوپر کا حصہ سونے کی طرح چمکدار ہے اور نچلا حصہ نرم مخمل کی طرح کا ہے۔ یہ خواب چونکہ غیر معمولی تھا میں نے اسی دن لاہور فون کیا کہ خیریت تو ہے؟ ۶ر دسمبر کے دن ہی امجد نے شہادت پائی تھی۔

خورشید صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے امجد کو تین بار خواب میں دیکھا ہے ایک بار دیکھا امجد سبز چوغے میں ملبوس دوسرے بہت سے بچوں کے ساتھ شاہانہ انداز میں چلا آ رہا ہے۔ ہاتھ چوغے کی جیبوں میں ہیں میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا میں نے پوچھا بیٹے کیسے آئے ہو؟ جواب میں کہا۔ آپ کو سلام کرنے آیا ہوں میں نے کہا اب جاؤ۔ تو امجد اسی پروقار انداز سے واپس جانے لگا۔ بچے بھی اس کو گھیرے میں لئے اس کے ساتھ ساتھ خاموش چلے جا رہے تھے جب قبر کے پاس پہنچا تو قبر کھلی اس نے اندر قدم رکھا اور غائب ہو گیا۔

دوسرا خواب کچھ ایسا تھا کہ میں کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا ہوں امجد بضد ہے کہ میں بھی ساتھ چلوں گا مگر میں نے انکار کر دیا اور میں خود ایک تانگے میں سوار ہو کر چل پڑا ہوں۔ تانگہ ایک ایسی جگہ سے گزر رہا ہے کہ جس کے دائیں طرف ایک نہر سی ہے اچانک جب نہر میں نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ امجد اس نہر میں ایک ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہوا چلا جا رہا ہے اور مجھ سے آگے نکل

گیا ہے۔ اس نہر کا پانی سرخی مائل گدلا سا ہے جیسا عموماً بارشوں کے بعد ندی نالوں کا ہوتا ہے۔

موت کی تمنا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فتمنوا الموت ان کنتم صدقین ''اگر تم سچے ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔'' اس تذکرے سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ امجد کو موت کی تمنا بہت تھی۔ فی سبیل اللہ! موت کی اس تمنا کو ایمان کا معجزہ بھی کہا جا سکتا ہے اور جس طرح اس کے گھر والوں نے اس کی شہادت کو صدق دل سے قبول کیا۔ وہ بھی ایمان ہی کی دین ہے۔ آخر میں خلاصہ کے طور پر شہید کے باپ کی تحریر کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

میجر خورشید احمد لکھتے ہیں۔

یہ بالکل اظہار واقعہ ہے کہ اپنی پی ایم اے کی تربیت کے دوران امجد اپنی، بہن اور بھائیوں کو اکثر لکھا کرتا تھا میں ہندوستان سے ہونے والی جنگ میں شہید ہو جاؤں گا یہ کہہ کہہ کر ایک طرح سے اس نے گھر والوں کو ذہنی طور پر اس حادثے کے لئے تیار سا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب پیشن گوئی ایک حقیقت کے طور پر سامنے آئی تو سب نے اس کو صبر، وقار کے ساتھ برداشت کیا۔ امجد کی شہادت کی خبر مجھے ۱۳ دسمبر کو ملی۔ دوسرے دن ۱۵-۱۶ دسمبر کی درمیانی رات کو میں ٹیلیفون پر امجد کے ماموں بریگیڈیر ایس آئی شیخ سے بات کر سکا تو میں نے خاص طور پر پوچھا امجد کی امی اور بہن بھائیوں کا امجد کی شہادت پر کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا ''ایسا جو مسلمان کے شایان شان ہے۔''

اب بھی جب ہم گھر میں اکٹھے بیٹھتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں تو امجد کا ذکر بھی ضرور آتا ہے اس کی عادتیں اس کے فقرے اس کے لطیفے، شرارتیں، کارنامے سب پر گفتگو ہوتی ہے ہم میں کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ امجد سے ہم محروم ہو گئے ہیں امجد ہمارے ساتھ ہے اور رہے گا۔''

ذکر اللہ والوں کے



شاہد حمید



جرأتوں کے نشاں

سعید راشد

مجھے جناب سعید راشد کی تالیف کردہ کتاب "جرأتوں کے نشاں" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسے پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع وہ غازی اور مجاہد ہیں جنہوں نے ہماری آزادی کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا اور ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ملک و قوم کی تعمیرِ نو کو جاری رکھ سکیں۔ ملک، قوم اور نظریۂ اسلام کے یہ محافظ ہمارے خراج اور تشکر کے مستحق ہیں۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تاریخی واقعات کو محفوظ رکھنے کا رجحان بہت کم ہے اور جو بہادر اور جیالے اپنے خون پسینے سے یہ تاریخ بناتے ہیں ان کے نقوش بھی خال خال صفحۂ قرطاس پر منعکس ہوتے ہیں۔ جنگ و جدل کے دوران تو ان جیالوں کی جرأتوں سے ساری قوم حرارت پاتی ہے لیکن بعد میں وقت کی خاک ان چہروں کو دھندلا دیتی ہے اور ہم اپنے اپنے معمولات میں مگن ہو کر ان محسنوں کے کارناموں کو بھول جاتے ہیں۔ جناب سعید راشد نے طرزی کالج جہلم کے ۲۹ سپوتوں کے حالات قلمبند کر کے اس ضرورت کو جزوی طور پر پورا کر دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کام کو ملکی سطح پر انجام دیا جائے تاکہ ہماری ملی تاریخ کا یہ درخشندہ باب نہ صرف محفوظ ہو جائے بلکہ آئندہ نسلیں بھی اس سے حوصلہ اور تحریک حاصل کر سکیں۔

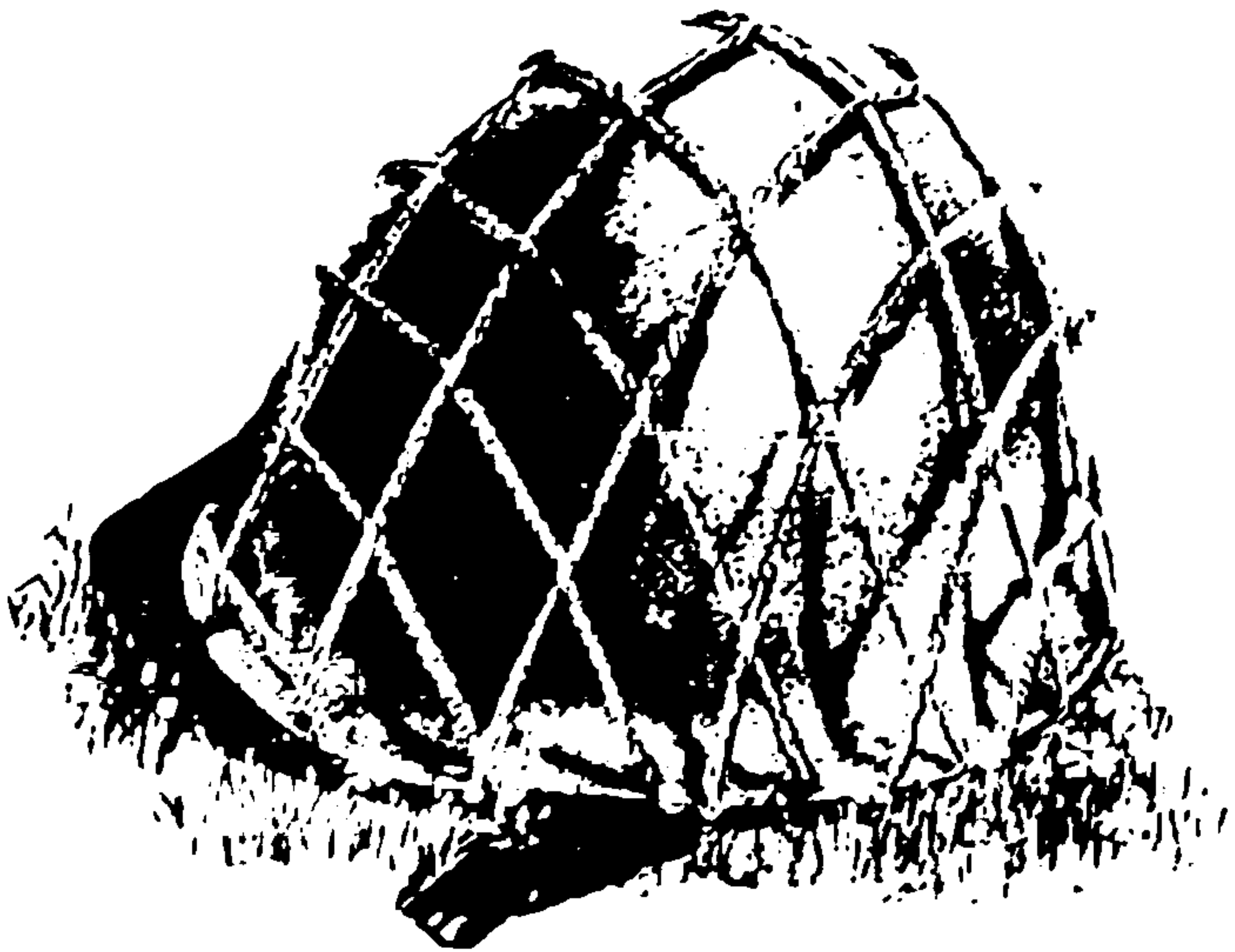
جنرل محمد ضیاء الحق

راولپنڈی

۲۹ مارچ ۱۹۸۳ء

حق نواز جھنگوی شہید

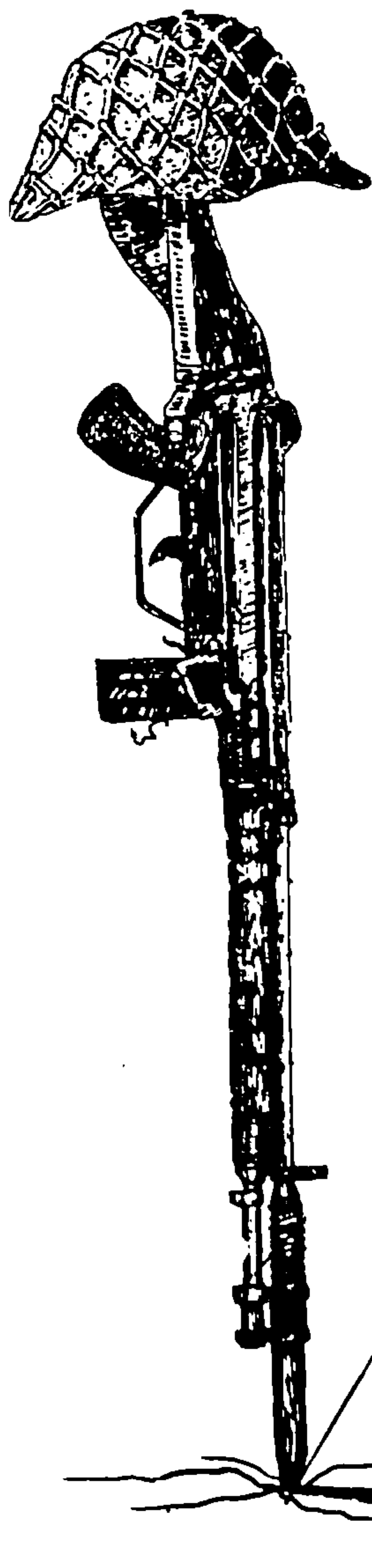
سعید راشد



چھپ کر تیار ہے

ہر معیاری بک شاپ سے خرید فرمائیں

اکرم نشانِ حیدر



ملّی کے ہیرو میجر محمّد اکرم شہید نشانِ حیدر

ایف ایف آر کی داستانِ حیات

شائع ہو گیا ہے

عالم بے عمل کی مثال ایسی ہے جیسے اندھے نے چراغ اُٹھایا ہو کہ لوگ اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور خود اندھیرے میں رہتا ہے ۔

اقوالِ زرین

شاہد حمید

فوٹو آفسٹ طباعت

چھپ کر تیار ہے

ہر معیاری بُک شاپ سے خرید فرمائیں

بُک کارنر پبلشرز، بُک سیلرز، مین بازار، جہلم

نام - محمد سعید راشد
نصابی تعلیم - ادبیاتِ اردو، انگریزی اور فنِ تعلیم
درس گاہیں - اسلامیہ انٹر کالج بریلی، بریلی کالج بریلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مربّی اساتذہ - جناب مبارک حسین، مولانا محمد محسن، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر داس گپتا،
ڈاکٹر عشرت حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین
ذہنی پس منظر - تحریکِ پاکستان کا دور

پیشہ - استاد ملٹری کالج جہلم از ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۸ء
پرنسپل آرمی پبلک سکول جہلم کینٹ
مشغلہ - تصنیف و تالیف
مشن - پاکستانیت کا فروغ
تصانیف و تالیفات :-

۱- The Character and Conduct of Quaid-e-Azam
۲- In Search of Light
۳- Ripeness in All
۴- Learning to Lead
۵- Living with Leadership
۶- A Lasting Lighthouse
۷- حیاتِ قائدِ اعظمؒ
۸- گفتار و کردارِ قائدِ اعظمؒ
۹- تذکرۂ اقبال
۱۰- مکالماتِ اقبال
۱۱- شاد باد منزلِ مراد
۱۲- تذکرۂ شہداء (جنگِ ستمبر و دسمبر کے پندرہ شہیدوں کا تذکرہ)
۱۳- میجر اکرم شہید نشانِ حیدر
۱۴- کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت
۱۵- جرأتوں کے نشان (پاک و ہند جنگوں کے ۲۴ جنگی اعزاز یافتہ غازیوں کا تذکرہ)
۱۶- کردار ساز
۱۷- عظمتِ کردار
۱۸- داستانِ علم و عمل، حصّہ اوّل اور دوم
۱۹- علوی نامہ
۲۰- چراغوں کی قطار